اردو کا کلاسیکی ادب
مقالات
سرسیّد
حصہ چہاردہم
مشتمل بر قرآنی قصص
مرتبہ
مولانا محمد اسماعیل پانی پتی
مجلس ترقی ادب ○ لاہور

فہرس

حصہ چہارم

مشتمل بر قرآنی قصص

طبع اول ، فروری ، ۱۹۶۵ء

تعداد : ۲۰۰۰

ناشر : سید امتیاز علی تاج ، ستارۂ امتیاز
ناظم مجلس ترقیٔ ادب ، لاهور

مطبع : زرین آرٹ پریس ، لاهور

مہتمم : محمد ذوالفقار خاں

قیمت : [illegible] پچیس پیسے

قصہ آدم علیہ السلام

قرآن مجید میں آدم کا قصہ آٹھ جگہ آیا ہے - سورۂ بقر ، سورۂ آل عمران ، سورۂ اعراف ، سورۂ حجر ، سورۂ بنی اسرائیل ، سورۂ کہف ، سورۃ طٰہٰ ، سورۂ ص میں کسی جگہ کوئی مضمون بیان ہوا ہے ، کسی جگہ کوئی - کسی جگہ اجمال ہے کسی جگہ تفصیل - کسی جگہ ایک مضمون کو کسی لفظ سے ظاہر کیا ہے ، دوسری جگہ کسی لفظ سے - مگر سب کا نتیجہ یا مقصد متحد ہے - ہم حاشیہ پر ان آٹھوں جگہ کی آیتوں کو اس طرح جمع کرتے ہیں جس میں تمام مضمون اور الفاظ ایک جگہ سلسلہ وار جمع ہو جاویں اور اُس کے مقابل میں اُن کا ترجمہ بھی اسی سلسلے سے لکھتے ہیں تاکہ کل قصہ انھی الفاظ میں جو قرآن میں آتے ہیں ایک جگہ ہو جاوے اور پھر اپنی سمجھ کے موافق جو ہم نے قرآن کا مطلب سمجھا ہے اُسی قصہ کو بیان کرتے ہیں تاکہ پڑھنے والے بخوبی دونوں بیانوں کا مقابلہ کر سکیں -

و اذ قال ربک للملئکة انی جاعل فی الارض خلیفه قالوا اتجعل فیها من یفسد فیها و یسفک الدماء و نحن نسبح بحمدک و نقدس لک قال انی اعلم مالا تعلمون (سورۂ بقر) انی خالق بشرا من طین (ص) من تراب

"اور جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں اُن میں ایک خلیفہ پیدا کرنے والا ہوں - بولے کیا تو اس میں ایسے کو خلیفہ کرے گا جو اُس میں فساد کرے اور خون بہاوے اور ہم تو تیری تعریف جپتے ہیں اور تجھ پاک کو یاد

(آل عمران) صلصال من
حمأ مسنون (الحجر) و علم
آدم الاسماء ثم عرضهم علی
الملئکة فقال انبئونی
باسماء هولاء ان کنتم
صٰدقین ۔ قالوا سبحٰنک
لا علم لنا الا ما علمتنا
انک العلیم الحکیم ۔ قال یا دم
انبئهم باسمائهم فلما انبأهم
باسمائهم قال الم اقل لکم انی
اعلم غیب السمٰوات والارض
و اعلم ما تبدون و ما کنتم
تکتمون (بقر) و لقد خلقنا کم ثم
صورنا کم ثم قلنا للملئکة
اسجدوا لآدم (سورۂ اعراف)
فاذا سوّیته و نفخت فیه
من روحی فقعوا له سٰجدین
(الحجر) فسجد الملئکة
کلهم اجمعون (الحجر)
الا ابلیس لم یکن من
السٰجدین (الاعراف) کان من
الجن ففسق عن امر ربه
(الکهف) ابٰی ان یکون من
السجدین ۔ (الحجر) و استکبروا
کان من الکافرین (بقر)

کرتے ہیں ۔ کہا میں جانتا
ہوں وہ جو کچھ تم نہیں جانتے ،
میں پیدا کرنے والا ہوں ایک
آدمی گارے ، مٹی ، ریتلے گارے
بدبودار کیچڑ سے ، اللہ نے آدم کو
سب نام سکھا دیے پھر ان کو
فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور
کہا کہ مجھ کو ان کے نام بتاؤ
اگر تم سچے ہو ۔ بولے تو ہی
برگزیدہ ہے تو نے جو کچھ
ہم کو سکھایا ہے اس کے
سوا ہم کچھ نہیں جانتے بے شک
تو ہی جاننے والا حکمت والا
ہے ۔ کہا اے آدم ان کے نام
ان کو بتا دے ۔ پھر جب آدم
نے ان کے نام ان کو بتا دیے
خدا نے کہا کہ میں تم کو
نہ کہتا تھا کہ میں آسمانوں کی
اور زمین کی چھپی ہوئی باتوں
کو جانتا ہوں اور جو تم ظاہر
کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو
اس کو بھی جانتا ہوں بے شک
ہم نے تم کو پیدا کیا اور
تمہاری صورت بنائی پھر ہم نے
فرشتوں سے کہا کہ آدم کو

قال یا ابلیس مالک الا
تکون مع السٰجدین (الحجر)
ما منعک ان تسجد لما
خلقت بیدی استکبرت ام
کنت من العالین (ص)
ما منعک الا تسجد اذ امرتک
(اعراف) قال ءاسجد لمن خلقت
طیناً (بنی اسرائیل) لم اکن
لاسجد لبشر خلقته من
صلصال من حمأ مسنون
(الحجر) انا خیر منه
خلقتنی من نار و خلقته
من طین (اعراف) قال
فاهبط منها فما یکون
لک ان تتکبر فیها فاخرج
منها مذؤما مدحورا (اعراف)
فانک رجیم و ان علیک
اللعنة الی یوم الدین
(الحجر) انک من الصٰغرین
قال انظرنی الی یوم
یبعثون قال انک من
المنظرین (اعراف) الی
یوم الوقت المعلوم - قال
رب بما اغویتنی لا زینن
لهم فی الارض (الحجر)

سجدہ کرو جب میں آس کو
ٹھیک کر چکوں اور اس میں
اپنی روح پھونک دوں تو تم
اس کو سجدہ کرتے ھوئے
جھک پڑو - پھر سب فرشتوں
نے سجدہ کیا مگر شیطان نے
نہیں کیا وہ سجدہ کرنے والوں
میں نہ تھا وہ جن میں سے تھا پس
نافرمانی کی آس نے اپنے پروردگار
کی ، سجدہ کرنے والوں کے ساتھ
ھونے سے انکار کیا اور تکبر کیا
اور وہ کافروں میں سے تھا -
خدا نے کہا اے ابلیس کیوں
تو سجدہ کرنے والوں کے ساتھ
نہ ھوا - کس چیز نے تجھ کو
منع کیا کہ نہ سجدہ کرے اس
کو جسے میں نے اپنے ھاتھ سے
بنایا ، تکبر کیا تو نے یا تو
بروں میں ھے ، کس بات نے
تجھ کو روکا کہ میرے حکم
کرنے پر بھی تو سجدہ نہ
کرے - ابلیس نے کہا کہ کیا
میں ایسے کو سجدہ کروں جسے
تو نے گارے سے پیدا کیا ھے
میں ایسا نہیں ھوں کہ اس

فبعزتک لا غوینهم
اجمعین (ص) لا قعدن لهم
صراطک المستقیم ثم لا
تینهم من بین ایدیهم و
من خلفهم وعن ایمانهم و
عن شمائلهم و لا تجد
اکثرهم شاکرین (اعراف)
قال اریتک هذا الذی کرمت
علی لئن اخرتن الی یوم
القیامة لا حتنکن ذریة الا
قلیلا (بنی اسرائیل) الا عبادک
منهم المخلصین قال
هذا صراط علیّ مستقیم
(الحجر) قال فالحق و الحق
اقول (ص) لمن تبعک
منهم لا ملئن جهنم
(اعراف) منک و ممن تبعک
منهم اجمعین (ص)
اذهب فمن تبعک منهم
فان جهنم جزاؤکم جزاء
موفورا و استفزز من استطعت
منهم بصوتک واجلب
علیهم بخیلک و رجلک
و شارکهم فی الاموال
والاولاد وعدهم وما یعدهم

آدمی کو سجدہ کروں جسے
تو نے سڑی مٹی سے بنایا ھے
میں اس سے بہتر ھوں مجھ کو
تو نے آگ سے پیدا کیا ھے
اور اس کو تو نے ریتلے گارے
اور بد بو دار کیچڑ سے پیدا کیا
ھے ۔ خدا نے کہا دور ھو یہاں
سے تجھ کو نہیں چاھیے تھا کہ
یہاں تکبر کرتا ۔ یہاں سے
ذلیل و خوار ھو کر نکل بیشک
تو مردود ھے اور بے شک
تو مردود ھے اور بے شک تجھ
پر قیامت تک لعنت رھے گی
بے شک تو ذلیلوں میں ھے ۔
ابلیس نے کہا کہ قیامت تک
مواخذ نہ ھونے کی مجھے مہلت
دے ۔ خدا نے کہا تجھ کو
مہلت دی گئی وقت معین تک ۔
ابلیس نے کہا کہ اے پروردگار
مجھ کو تیرے بہکانے ھی کی
قسم کہ میں دنیا میں بری باتوں
کو انہیں اچھی کر دکھاؤں گا
اور قسم ھے تیری عزت کی ان
سب کو بہکاؤں گا اور ان کے لیے
تیرے سیدھے رستہ کی راہ ماری

الشیطان الا غرورا (بنی اسرائیل)
ان عبادی لیس لک علیهم
سلطان الا من اتبعک من
الفاوین (الحجر) و کفیٰ
بربک وکیلا (بنی اسرائیل)
و قلنا (بقر) یاآدم اسکن
انت و زوجک الجنة فکلا
(اعراف) منها رغداً (بقر)
حیث شئتما ولا تقربا هذه
الشجرة فتکونا من الظالمین
(اعراف) فقلنا یاآدم ان هذه
عدو لک ولزوجک فلا
یخرجنکما من الجنة
فتشقیٰ ان لک لا تجوع
فیها و لا تعری و انک
لا تظماء فیها لا تضحیٰ
(طه) - فوسوس لهما الشیطن
لیبدی لهما ماؤوری عنهما
من سواتهما (اعراف) قال
یا آدم هل ادلک علی شجرة
الخلد و ملک لا یبلی
(طه) و قال ما نهما کما
ربکما عن هذه الشجرة
الا ان تکون ملکین او
تکونا من الخلدین و

کرنے کو گھات میں بیٹھوں گا -
پھر اُن کے آگے سے اور ان کے
پیچھے سے اور اُن کے دائیں سے
اور ان کے بائیں سے اُن پر آن
پڑوں گا اور تو ان میں سے
بہتوں کو شکر کرنے والا نه
پاوے گا - ابلیس نے کہا که
مجھ کو بتا که کیوں اس شخص
کو مجھ پر بزرگی دی هے - اگر
تو نے مجھے قیامت تک کی
مہلت دی تو اس شخص کی اولاد
کو بجز چند کے جڑ پیڑ سے
اکھاڑ دوں گا بجز تیرے خاص
بندوں کے جو ان میں هوں -
خدا نے کہا که خالص بنده
هونا هی میرے تک پہنچنے کا
سیدھا رسته هے خدا نے کہا
که سچ بات یه هے اور سچ کہتا
هوں جو لوگ ان میں سے تیری
پیروی کریں گے بے شک بھر
دوں گا جہنم کو تجھ سے اور
ان سب سے جنھوں نے اُن میں
سے تیری پیروی کی - جا پھر جو
کوئی اُن میں سے تیری پیروی
کرے گا تو بے شک جہنم

قاسمهما انی لکما لمن
النٰصحین فدلهما بغرور
فلما ذاقا الشجرة بدت لهما
سواتهما و طفقا یخصفان
علیهما من ورق الجنة
(اعراف) و ناداهما ربهما
الم انهٰکما عن تلکما
الشجرة و اقل لکما ان
الشیطٰن لکما عدو مبین
(اعراف) فازلهما الشیطٰن
عنها فاخرجهما مما کانا
فیه و قلنا اهبطوا
بعضکم لبعض عدوولکم
فی الارض مستقرو متاع الی
حین (بقر) قال فیها
تحیون و فیها تموتون و
منها تخرجون (اعراف)
و عصی ادم ربه فغوی (طه)
فتلقی آدم من ربه بکلمات
فتاب علیه انه هو
التواب الرحیم (بقر) قال
ربنا ظلمنا انفسنا وان لم
تغفرلنا و ترحمنا لنکونن
من الخسرین (اعراف) ثم
اجتباه ربه فتاب علیه و

تمهاری سزا هوگی پوری سزا ۔
بهکا آن میں سے جس کو بهکا سکے
اپنی آواز سے اور چڑه جا آن پر
اپنے سوار و پیدل لے کر اور
حصه بانٹ لےان کے مال میں اور
اولاد میں اور ان سے وعده کر لے
اور کوئی وعده آن سے شیطان
نہیں کرنے کا بجز دهوکے کے
بے شک میرے بندوں پر تجھ
کو غلبه نہیں هے بجز ان گمراهوں
کے جنهوں نے تیری پیروی کی ،
اے پیغمبر تیرا خدا آن کی
کارسازی کے لیے کافی هے ۔ خدا
نے کہا اے آدم تو اور تیرا
جوڑا جنت میں ره اور کهاؤ اس
میں سے پیٹ بهر کر جهاں سے
تم چاهو اور اس درخت کے پاس
مت جاؤ ۔ اگر جاؤ گے تو
ظالموں میں سے هو گے ۔ خدا
نے کہا اے آدم یه ابلیس
بےشک تیرا اور تیرے جوڑے کا
دشمن هے یه تم کو جنت سے نه
نکال دے که تم بد بخت هو جاؤ
یهاں تو تم نه بهوکے هو گے نه
ننگے نه یهاں پیاسے هوگے اور

هدی (طہٰ) قلنا اھبطوا منھا جمیعاً فاما یاتینکم منی ھدی فمن تبع ھدای فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون (بقر) فلا یضل ولا یشقی ۔ (طہٰ) نہ دھوپ میں جلو گے ۔ پھر وسوسے میں ڈال دیا اُن کو شیطان نے تاکہ جو پوشیدہ برائیاں ان میں تھیں ان کو ظاہر کر دے ۔ شیطان نے کہا اے آدم کیا بتلاؤں میں تجھ کو
ہمیشہ رہنے کا درخت اور پرانی نہ ہونے والی سلطنت اور کہا کہ خدا نے تم کو بجز اس کے اور کس لیے اس درخت سے منع نہیں کیا کہ تم فرشتے ہو جاؤ گے یا ہمیشہ رہو گے اور ان سے قسم کھا کر کہا کہ بے شک تمھارا میں خیر خواہ ہوں پھر ان کو دھوکے میں ڈال دیا پھر جب انھوں نے اُس درخت کو چکھا تو اُن دونوں کی شرم گاہیں ظاہر ہوگئیں اور انھوں نے بہشت کے درخت کے پتوں سے ان کو چھپانا شروع کیا خدا نے ان دونوں کو للکارا کہ میں نے تم کو اس درخت کے کھانے سے منع نہیں کیا تھا اور تم سے نہیں کہہ دیا تھا کہ شیطان تمھارا علانیہ دشمن ہے پس ان کو شیطان نے اس سے ڈگمگایا اور جس میں تھے اس میں سے نکال دیا ۔ خدا نے کہا دور ہو تم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمھارے لیے ایک مدت تک زمین پر رہنا اور اس سے منفعت اُٹھانی ہے اُس میں تم جیو گے ، اس میں مرو گے ، اس میں سے اُٹھو گے ۔ نافرمانی کی آدم نے اپنے پروردگار کی اور بہک گیا ۔ پھر آدم کے دل میں ڈالیں اس کے پروردگار نے چند باتیں پھر اس کو خدا نے معاف کیا وہ بے شک بڑا معاف کرنے والا مہربان ہے ۔ آدم اور اس کی جورو نے کہا کہ اے پروردگار ہمارے ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو ہم کو نہ بخشے گا اور نہ مہربانی کرے گا تو بے شک ہم نقصان والوں میں ہوں گے ۔ پھر اس کے

پروردگار نے اس کو پسند کیا اور اس کو معاف کیا اور سیدھی راہ بتائی ۔ خدا نے کہا کہ تم سب یہاں سے دور ہو پھر میرے پاس سے تمھارے پاس ہدایت پہنچےگی ۔ پھر جوکوئی میری ہدایت کی پیروی کرے گا تو اس پر کچھ خوف نہ ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوگا اور نہ وہ بھکے گا اور نہ بد بخت ہوگا ۔''

اس قصہ میں چار فریق بیان ہوئے ہیں ۔ ایک خدا ، دوسرے فرشتے (یعنی قوائے ملکوتی) تیسرے ابلیس یا شیطان ۔ (یعنی قوائے بہیمی) چوتھے آدم (یعنی انسان جو مجموعہ آن قوائی کا ہے اور جس میں عورت و مرد دونوں شامل ہیں) ۔ مقصود قصہ کا انسانی فطرت کی زبان حال سے انسان کی فطرت کا بیان کرنا ہے ۔ خدا جو سب کا پیدا کرنے والا ہے گویا قوائے ملکوتی کو مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ میں ایک مخلوق یعنی انسان کثیف مادہ سے پیدا کرنے کو ہوں مگر وہی میرا نائب ہونے کے لائق ہے ۔ جب میں اس کو پیدا کر چکوں تو تم سب اس کو سجدہ کرنا ۔ اس مقام پر مخاطبین کو اس بات کا کہ اس مخلوق میں قوائے بہیمہ ہوں گے عالم قرار دیا گیا ہے اور بمقتضائے فطرت ان قوائی کے انھوں نے کہا کہ کیا تو ایسے کو خلیفہ کرے گا جو زمین پر فساد مچاوے اور خون بہاوے اور قوائے ملکوتی نے اپنی فطرت اس طرح بیان کی ۔ کہ ہم تو تیری ہی تعریف کرتے ہیں اور تجھ پاک کو یاد کرتے ہیں ۔

پچھلا فقرہ قوائے کی فطرت کو بھی بتاتا ہے ۔ جو قوئ جس کام کے لیے ہیں وہی کام کرتے رہتے ہیں ، کہ وہی ان کی تسبیح اور تقدیس ہے ۔ قوت نامیہ ، انما اور قوت ناطقہ ، نطق ، قوت احراق ، حرق ، قوت سیالہ ، سیلان ، قوت جامدہ ، انجماد کے

سوا اور کچھ نہیں کر سکتی ۔ انسان باوجودیکہ قوائے متضاد ، ملکوتیہ و بہیمیہ سے مرکب ہے مگر اس میں ایسی قدرت ہے کہ ایک قوت پر دوسری قوت کو غلبہ دے سکتا ہے اور جس قوت سے چاہے کام لے سکتا ہے ۔ غیر معلوم چیزوں کو جان جاتا ہے ؛ عالم کے اجزاء میں ترکیب دے کر ایک نئی چیز ایجاد کر لیتا ہے ۔ اور عالم کے تبدل میں ایک بڑی مداخلت رکھتا ہے اور ٹھیک خدا کا نائب کہلانے کا مستحق ہے ۔

انسان کی فطرت کا مخاطبین پر فطرتی تفوق ظاہر کرنے کو ، تمام کمالات نفسانی و روحانی حقائق و معارف کو انسان کی فطرت میں ودیعت کر کے جس کو تعلیم اسماء سے تعبیر کیا ہے انسان کو مخاطبین کے سامنے کیا ، کہ جو حقائق و معارف اس میں ہیں اس کو بتلاؤ قوائے سبیطہ کی فطرت میں اس کا علم نہ تھا ۔ پس گویا وہ بولے کہ ہم تو ان کمالات کو نہیں جانتے ۔ ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں جتنا تو نے بتایا ہے یعنی جس محدود فطرت پر پیدا کیا ہے اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتے ۔ مگر انسان کی زبان حال نے جس کی فطرت میں ادراک ، کلیات و جزئیات تھا مخاطبین کی حقیقت کو بتا دیا اور گویا مخاطبین نے زک پائی ۔ اب خدا اپنی قدرت و کمال کے اظہار کے لیے انسانی محاورہ کے موافق جیسے کہ انسان کسی کو زک دے کر دھراتا ہے فرماتا ہے کہ کیوں میں نہ کہتا تھا کہ جو کچھ میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے ۔

اس کے بعد خدا تعالی نے ان قوائے متضاد کی جن سے انسان مرکب ہے اس طرح پر فطرت بتائی ہے کہ قوائے ملکوتی اطاعت پذیر و فرماں بردار ہونے کی قابلیت رکھتے ہیں الا قوائے بہیمیہ نہایت سرکش اور نافرماں بردار ہیں ۔ انھی کو قابو میں لانا اور فرماں بردار کرنا انسان کا انسان ہونا ہے ۔

اس کے سرکش ہونے کو کبھی تو ان لفظوں سے بیان کیا ہے کہ ابلیس نے سجدہ نہیں کیا ۔ کہیں یوں فرمایا ہے کہ اس نے اپنے خدا کے حکم کی نافرمانی کی اور سجدہ کرنے سے انکار کیا ۔ کہیں فرمایا ہے کہ اس کافر نے غرور کیا اور کہا کہ کیا میں ایسی مخلوق کو سجدہ کروں جو سڑی مٹی سے بنی ہے ۔ میں تو اس سے افضل ہوں وہ تو مٹی کا پتلا ہے اور میں آگ کا پوت ہوں ۔ قوائے بہیمیہ کو جن کا مبداء حرارت غریزی و حرارت خارجی ہے ۔ آگ سے مخلوق، ہونا بیان کرنا ٹھیک ٹھیک اُن کی فطرت کا بتلانا ہے ۔ پھر جو فطرتی تضاد ان دونوں قسم کے قویٰ میں ہے اس کے اظہار کے لیے قواٗ بہیمہ کو بطورِ ایک سخت دشمن کے قرار دیا ہے اور اس کی زبان حال سے اس کی فطرت بیان کی ہے کہ میں ہمیشہ جب تک انسان زندہ ہے یا قیامت تک یعنی جب تک اس کی اولاد رہے گی اُس کو بہکاتا اور راہ راست پر سے بھٹکاتا رہوں گا ۔ یہ الفاظ کہ میں انسان کو دائیں بائیں آگے پیچھے غرض کہ ہر چہار طرف سے گھیروں گا ۔ صاف صاف اُن قوائے بہیمہ کی فطرت کا اظہار کرتے ہیں جو انسان میں ہے اور ہر ذی عقل و ہوش غور کرنے پر خود اپنے میں یہ سب باتیں پاتا ہے اور جان سکتا ہے کہ کس طرح ان قوائے بہیمیہ نے چاروں طرف سے ان کو گھیر رکھا ہے ؎

درمیان قمر دریا تختہ بندم کردۂ
بازمیگوئی کہ دامن ترمکن هشیار باش

پھر خدا تعالیٰ نے نیک آدمیوں کی فطرت کو اور اس دشمن کے فریب میں آنے والوں اور نہ آنے والوں کے فطری نتیجہ کو بتایا ہے اور فرماتا ہے کہ تو جتنی چاہے دشمنی کر اور جس طرح چاہے اپنے لشکر سے اُن پر چڑھائی کر ۔ مگر نیک آدمیوں پر تیرا

کچھ قابو نہ ہوگا ۔ وھی بھکیں گے جو تیرے یعنی قوائے بہیمیہ کے تابع ہونے والے ہیں اور دونوں کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ پہلے بہشت میں چین کریں گے اور پچھلے دوزخ میں بھرے جاویں گے ۔

اس کے بعد خدا تعالیٰ نے انسان کی زندگی کے دونوں حصوں کو بتایا ہے ۔ پہلے حصہ کو یعنی جب کہ انسان غیر مکلف اور تمام قیود سے مبرا ہوتا ہے ۔ بہشت میں رہنے اور چین کرنے اور میوؤں کے کھاتے رہنے سے تعبیر کیا ہے اور جب دوسرا حصہ اس کی زندگی کا شروع ہونے والا ہے تو اس کے قدیم دشمن کو پھر بلایا ہے ۔ جس نے اس کو بہکا کر درخت ممنوعہ کو کھلایا ہے ۔ یہ وہ حصہ انسان کی زندگی کا ہے جب کہ اس کو رشد ہوتا ہے اور عقل و تمیز کے درخت کا پھل کھا کر مکلف اور اپنے تمام افعال و اقوال و حرکات کا ذمہ دار ہوتا ہے ۔ زندگی کے ضروری سامان کے لیے خود محنت کرتا ہے اور نیک و بد کو خوب سمجھتا ہے ۔ اپنی بدی سے واقف ہوتا ہے اور اس کو چھپاتا ہے ۔ یہ فطرت انسانی خدا تعالیٰ نے باغ کے استعارہ میں بیان کی ہے اس لیے تمام فطرت کو باغ ھی کے استعارہ میں بیان فرمایا ہے سن رشد و تمیز کے پہنچنے کو درخت ۔ معرفت خیر و شر کے پھل کھانے سے اور انسان کا اپنی بدیوں کے چھپانے کو درخت کے پتوں سے ڈھانکنے سے تعبیر کیا ہے ۔ مگر شجرۃ الخلا کے پھل تک اس کو نہیں پہنچایا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک فانی وجود ہے اور اس کو دائمی بقا نہیں ۔

اخیر کو نہایت عمدگی سے اس کا خاتمہ بیان کیا ہے کہ تم سب نکل جاؤ اور جا کر زمین پر رہو وھی تمھارے ٹھیرنے کی جگہ ہے ۔ اس میں تم مرو گے ، اس میں سے اٹھو گے ۔ تمھاری بدیوں کا

علاج بھی وہیں ہے ۔ جو نیک بندے ہوں ان کی ہدایت پر چلنا اور اپنی بدیوں سے شرمندہ ہو کر اُن کے کرنے سے باز آنا اور خدا سے پکا اقرار کرنا کہ پھر نہ کریں گے اور پھر مت کرنا ، تم اپنے دشمن پر فتح پاؤ گے ۔ پھر تم کو کچھ ڈر اور خوف نہ ہوگا ۔ اچھے خاصے مقبول بندے ہوگے ۔

یہ ایک نہایت عمدہ اور دل چسپ بیان فطرت انسانی کا ہے مگر عام لوگ اس راز فطرت کے سمجھنے کے قابل نہ تھے اس لیے خدا نے ابتداء سے اس راز کو ایک دل چسپ قصہ کے پیرایہ میں بیان کیا ہے جس کو ہر کوئی سمجھ سکتا ہے اور جو نتیجہ راز فطرت سے انسان کو حاصل ہونا چاہیے وہ ہر شخص کو حاصل ہوتا ہے ۔ خواہ تم یہ سمجھو کہ خدا و فرشتوں میں مباحثہ ہوا اور شیطان نے خدا سے نافرمانی کی اور آدم بھی گیہوں کا درخت کھا کر خدا کا نافرمانبردار ہوا ۔ خواہ میں یوں سمجھوں کہ اُس بڑے تماشا کرنے والے نے جو بھانمتی کا ایک تماشا بنایا ہے اس کے راز کو اُسی بھانمت کی اصطلاحوں میں بتایا ہے ۔

ذکر نوحؑ کے طوفان کا

قبل اس کے کہ طوفان کی نسبت ذکر کیا جاوے یہ امر بتانا ضرور ہے کہ حضرت نوح اور ان کی قوم کہاں رہتی تھی ۔
اس بات کے دریافت کرنے کے لیے بجز توریت کے اور قدیم جغرافیہ کی تحقیات کے اور کوئی ذریعہ ہمارے پاس نہیں ہے آن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم یا یوں کہو کہ حضرت نوح کے اجداد اُس قطعۂ زمین میں رہتے تھے جہاں چار دریا پبشون ، جیحون مدقل اور فرات بہتے تھے ۔ ان دریاؤں کے ناموں اور مخرجوں پر اس مقام پر بحث کی چنداں ضرورت نہیں ہے ۔ صرف یہ بیان کرنا کافی ہے کہ جو ٹکڑا زمین کا بلیک سی ۔ یعنی بحر اسود اور بحر کاسپین اور پرشین گلف (خلیج فارس) اور میڈی ٹیرینین سی ۔ یعنی بحیرۂ روم میں واقع ہے اور آرمینیا کہلاتا ہے یہی قطعہ زمین کا حضرت نوح کے اجداد کا مسکن تھا ۔

کوئی ثبوت اس بات کا نہیں ہے کہ نوح نے یا اجداد نوح نے اس ملک کو چھوڑ کر دوسری جگہ سکونت اختیار کی ہو اور اس لیے اس بات کے باور کرنے کو کوئی امر مانع نہیں ہے کہ حضرت نوح کا بھی یہ ملک مسکن تھا ۔

اس قطع ۔زمین میں وہ ملک بھی واقع ہے جو ارارات کے نام سے مشہور تھا اور اسی ملک کے پہاڑ ارارات کے پہاڑ مشہور ہیں جن کو کالڈی زبان میں فرود اور عربی میں جودی کہتے ہیں ۔
یہ ملک دریاؤں سے اور دریاؤں کی بہت سی شاخوں سے اور

چھوٹی منڈیوں سے ایسا پُر تھا کہ انسان کو اس بات کا خیال آنا قرین قیاس ہے کہ اُن کے عبور کرنے اور اُن کی طغیانی کی حالت میں بچاؤ کی کوئی تدبیر ہونی چاہیے ۔ خدا تعالیٰ نے حضرت نوح کے دل میں وحی ڈالی کہ وہ ان مصیبتوں سے محفوظ رہنے کے لیے کشتی بنائیں ۔ کچھ شبہ نہیں ہے کہ یہ کشتی سب سے پہلی کشتی ہوگی جو دنیا میں بنی ۔ اس وقت ایسی چیز جس سے پانی پر چلیں کچھ عجیب نہیں معلوم ہوتی ۔ لیکن اول اول جب اس کے بنانے کا خیال حضرت نوح کو ہوا ہوگا اور اس کے ذریعہ سے پانی پر چلنے اور دریاؤں کے وار پار جانے اور چلے آنے کا ارادہ معلوم ہوا ہوگا تو لوگوں نے اس کو اس قدر عجیب اور نا ممکن سمجھا ہوگا کہ اُن سے مسخرا پن کرتے ہوں گے ان کو دیوانہ سمجھتے ہوں گے جیسے کہ قرآن مجید میں بیان ہوا ہے ۔

حضرت نوح لوگوں کو بت پرستی چھوڑنے اور خدائے واحد کی پرستش کرنے کی ھدایت کرتے تھے اور لوگ نہیں مانتے تھے حضرت نوح اُن پر خدا کا عذاب نازل ہونے کی پیشین گوئی کرتے تھے ۔ تمام قوموں پر جو عذاب نازل ہوئے ہیں وہ عذاب اُنھی اسباب سے واقع ہوئے ہیں جن کا واقع ہونا امور طبعی سے متعلق ہے پس ملکی حالات کے خیال سے ضرور حضرت نوح کے دل میں خدا نے ڈالا ہوگا کہ اُن لوگوں کی نافرمانی ، بدکاری و گنہ گاری سے ایک دن خدا اُن کو ڈبو دے گا ۔

لوگوں نے حضرت نوح سے کہا کہ اے نوح تم ہم سے بہت کچھ جھگڑ چکے ہو پھر اگر تم سچے ہو تو اب اس کو لاؤ جس کا تم ہم سے وعدہ کرتے ہو یعنی عذاب کا ۔ حضرت نوح نے کہا کہ اگر خدا چاہے گا تو عذاب لاوے گا تم اس کو مجبور کرنے والے نہیں ہو ۔

کشتی کا بنانا اور خصوصاً پہلے پہل اور بالتخصیص اتنی بڑی کا، جتنی کہ نوح کی کشتی تھی اور ایسی مضبوط کا، جو طوفان کی موجوں کو سہار سکے، کچھ آسان کام نہ تھا اور خدا ھی کی القائے وحی سے وہ بن سکتی تھی مگر لوگوں کی امداد اور سعی کی بھی ضرورت تھی جو لوگ حضرت نوح پر ایمان نہیں لائے تھے بلکہ اُن کے اس کام پر تمسخر کرتے تھے یقیناً وہ لوگ اُس میں شریک نہ تھے اُنھی کی نسبت خدا نے فرمایا کہ تو ھماری ھدایت سے کشتی بنائے جا ظالموں کا ھم سے ذکر مت کرو وہ سب ڈوبنے والے ھیں۔

غرض کہ حضرت نوح نے اُن لوگوں کی امداد سے جو اُن کو مانتے تھے اور اُن پر ایمان لائے تھے وہ کشتی تیار کر لی۔ طوفان کا آنا بذریعہ اُن اسباب کے جو طوفان آنے سے متعلق ھیں، خدا نے مقدر کیا تھا۔ چناں چہ بے انتہا مینہ کے برسنے اور زمین سے پانی کے چشمے کھل جانے اور دریاؤں و ندیوں کے اُبل پڑنے سے اُس ملک میں طوفان آیا۔ حضرت نوح اور اُن کے ساتھی کشتی پر بیٹھ کر بچ گئے اور تمام ملک کے لوگ جس میں طوفان آیا تھا ڈوب کر مر گئے اس قسم کے طبعی واقعوں کو خدا تعالیٰ ھمیشہ بندوں کے گناھوں اور ان کی نا فرمانی سے منسوب کرتا ھے جس کی نسبت ھم پہلے بحث کر چکے ھیں۔ حضرت نوح کے زمانہ کا بہت بڑا طوفان ھوگا مگر اس زمانہ میں بھی جن ملکوں میں طوفان آتا ھے وہاں بھی اسی طرح ڈوب کر مر جاتے ھیں۔ البتہ نوح کے طوفان میں چند امور ایسے ھیں جن پر بالتخصیص بحث کرنی ضرور ھے۔

اول یہ کہ طوفان خاص اُس ملک میں آیا تھا جہاں حضرت نوح کی قوم رھتی تھی یا تمام دنیا میں طوفان آیا تھا اور کل کرہ زمین کا پانی کے اندر ڈوب گیا تھا اور تمام دنیا میں کوئی انسان و

چرند و پرند بجز آن کے جو کشتی میں تھے زندہ باقی نہیں رہے تھے -

یہودی اور عیسائی اس بات کے قائل ھیں کہ طوفان تمام دنیا میں عام تھا - ھمارے علمائے مفسرین کی عادت ھے کہ بغیر اس بات کے کہ قرآن مجید کے الفاظ پر غور کریں ایسے امور میں یہودیوں کی روایتوں کی تقلید کرتے ھیں اور اس لیے وہ بھی اس بات کے قایل ھوئے ھیں کہ طوفان تمام دنیا میں عام تھا - مگر طوفان کا عام ھونا محض غلط ھے اور قرآن مجید سے اس کا تمام دنیا میں عام ھونا ھرگز ثابت نہیں ھے -

ایک زمانہ تھا کہ پہاڑوں پر دریائی جانوروں کی ھڈیاں ملنے سے اور سرد ملکوں میں گرم ملکوں کے جانوروں کی ھڈیاں زمین میں دبی ھوئی نکلنے سے طوفان کے عام ھونے کا اور تمام دنیا کے پہاڑوں کا طوفان نوح میں ڈوب جانے کا یقین ھوتا تھا مگر علم جیالوجی (طبقات الارض) کی ترقی سے ثابت ھو گیا کہ وہ خیال غلط تھا - اس کو مفصل طور پر میں نے اپنی کتاب "تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ علٰی ملۃ الاسلام" میں بیان کیا ھے اس مقام پر اس کی بحث کچھ ضروری نہیں ھے اس وقت ھم صرف یہ بتلانا چاھتے ھیں کہ قرآن مجید سے طوفان کا تمام دنیا میں عام ھونا ثابت نہیں ھوتا -

گو ھم بالتخصیص یہ نہ بتا سکیں کہ آدم یا انسان کے پیدا ھونے کی کس قدر مدت کے بعد طوفان آیا تھا مگر توریت کے مطابق جو قلیل زمانہ تسلیم کیا گیا ھے ھم اسی کو تسلیم کر کے کہتے ھیں کہ بموجب حساب توریت عبری کے طوفان آیا - (١٦٥٠) برس بعد پیدا ھونے حضرت آدم کے اور بموجب سپٹوجنٹ توریت کے جس پر ایشیا کے تمام مؤرخ اور یورپ کے اکثر قدیم مؤرخ اعتماد رکھتے ھیں طوفان آیا - (٢٢٦٢) برس بعد پیدا ھونے حضرت آدم

کے اور بلاشبہ اس عرصہ میں انسان کی نسل پھیل گئی ہوگی اور کل پرانی دنیا یا اس کا بہت بڑا حصہ آباد ہو گیا ہوگا - یہ بات نا ممکن ہے اور قرآن مجید کے بھی برخلاف ہے کہ حضرت نوح تمام دنیا کے لوگوں کو وعظ سنانے اور ہدایت کرنے کو بھیجے گئے ہوں اور امکان سے باہر ہے کہ تمام دنیا میں جو اُس وقت تک آباد ہو چکی تھی حضرت نوح نے وعظ کیا ہو اور تمام دنیا کے لوگوں نے اُن کا وعظ سن کر اُن کے ماننے سے انکار کیا ہو، بلکہ بہت سے وسیع ملک ایسے ہوں گے جہاں کے باشندوں نے حضرت نوح کے نبی ہونے کی اور اُن کے وعظ کرنے کی اور خدا کے راہ کی ہدایت کرنے کی خبر بھی نہ سنی ہوگی -

قرآن مجید سے بھی اس امر کی تائید ہوتی ہے کیوں کہ خدا تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ ہم نے نوح کو تمام دنیا کے لوگوں کے پاس بھیجا ہے، بلکہ یہ فرمایا ہے کہ اُس کی قوم کے پاس بھیجا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُس وقت دنیا میں اور قومیں بھی موجود تھیں - پس جس قوم کے پاس نوح بھیجے گئے تھے اُسی قوم پر طوفان کا عذاب بھی آیا تھا اور یہی امر قرآن مجید کی ان آیتوں سے ثابت ہوتا ہے جن کو ہم ابھی بیان کرتے ہیں -

قرآن مجید میں خدا نے فرمایا ہے - ولقد ارسلنا نوحاً الی قومہ فقال یا قوم اعبدوا اللہ ما لکم من الٰہ غیرہ، افلا تتقون (سورۂ مومنین آیت ۲۳) -

یعنی - ہم نے نوح کو بھیجا اُس کی قوم کی طرف، نوح نے کہا اے میری قوم بندگی کرو اللہ کی نہیں ہے تمھارے لیے کوئی معبود سوائے خدا کے - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوح ایک خاص قوم کے پاس بھیجے گئے تھے پس وہ عذاب بھی اُسی قوم کے لیے آیا تھا جس کے لیے حضرت نوح بھیجے گئے تھے، پس

وہ عذاب بھی اُسی قوم کے لیے آیا تھا ۔ جس کے لیے حضرت نوح بھیجے گئے تھے ۔

پھر خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ ونوحا اذ نادیٰ من قبل فاستجبنا فنجینٰہ و اھلہ من الکرب العظیم ونصرناہ من القوم الذین کذبوا بایتنا انھم کانوا قوم سوء فاغرقنا ھم اجمعین ۔ (سورۂ انبیا آیت ۷۶ و ۷۷)

یعنی ۔ ھم نے مدد کی نوح کی اُس قوم پر جس نے جھٹلایا ھماری نشانیوں کو بیشک وہ قوم تھی بری پس ڈبو دیا ھم نے اُن سب کو اکٹھا ۔ اس سے صاف پایا جاتا ھے کہ وھی قوم ڈبوئی گئی تھی جس نے حضرت نوح کا انکار کیا تھا ۔

اور پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح سے فرمایا ۔ ولا تخاطبنی فی الذین ظلموا انھم مغرقون (سورۂ ھود آیت ۳۹ سورۂ مومنین آیت ۲۷) ۔

یعنی ۔ تو مت کہہ مجھ سے اُن لوگوں کے لیے جنھوں نے نا فرمانی کی کیوں کہ وہ ڈوبنے والے ھیں پس اس آیت سے بھی صرف اُنھیں لوگوں کا ڈوبنا معلوم ھوتا ھے جنھوں نے حضرت نوح کی ھدایت کو نہیں مانا ۔

پھر خدا نے فرمایا کہ ۔ انا ارسلنا نوحا الیٰ قومہ ان انذر قومک من قبل ان یاتیھم عذاب الیم ۔ (سورہ نوح آیت ۱)

یعنی ۔ ھم نے بھیجا نوح کو اس کی قوم کی طرف کہ ڈرا اپنی قوم کو پہلے اس سے کہ آوے اُن پر عذاب دکھ دیتا اور جب حضرت نوح کی نصیحت اُنھوں نے نہ مانی ، تو حضرت نوح نے دعا مانگی کہ اُن پر طوفان کا عذاب آوے ، اس سے بھی اس قدر معلوم ھوتا ھے کہ صرف قوم نوح پر عذاب آیا تھا نہ کہ تمام دنیا پر ۔

جو لوگ کہ قرآن مجید سے طوفان کا تمام دنیا میں آنا بیان

کرتے ھیں وہ صرف دو آیتوں پر استدلال کرتے ھیں ۔ اول وہ آیت ھے کہ جب حضرت نوح نے خدا تعالٰی سے دعا مانگی کہ ۔ و قال نوح رب لاتذر علی الارض من الکافرین دیارا (سورۂ نوح آیت ۲۷) یعنی ۔ اے پروردگار مت چھوڑ زمین پر کافروں کا ایک گھر بھی بسا ھوا ۔ حالاں کہ اس آیت سے کسی طرح عام ھونا طوفان کا ثابت نہیں ھوتا ۔ کیوں کہ اس آیت میں جو ارض کا لفظ ھے اُس پر بھی الف لام ھے اور کافروں کا جو لفظ ھے اس پر بھی الف لام ھے ۔ پس اس سے صاف ثابت ھے کہ زمین سے وھی زمین مراد ھے جہاں نوح کی قوم رھتی تھی اور کافروں سے وھی کافر مراد ھیں جنھوں نے حضرت نوح کا انکار کیا چناں چہ اُسی امر کی تائید اُن تمام آیتوں سے پائی جاتی ھے جو اُوپر مذکور ھوئیں ۔

دوسری آیت وہ ھے جہاں خدا نے فرمایا ۔ و جعلنا ذریۃ ھم الباقین (سورۂ صافات آیت ۷۵) و جعلنا ھم خلائف (سورۂ یونس آیت ۷۴) یعنی ۔ اور کیا ھم نے نوح ھی کی ذریت کو بچی ھوئی اور ایک جگہ فرمایا ھے کہ کیا ھم نے اُن کو جانشین ۔ مگر میں نہیں سمجھتا کہ ان آیتوں سے کس طرح تمام دنیا میں طوفان آنے کا استدلال کیا جاتا ھے ۔ کیوں کہ اس آیت کا مطلب صرف اسی قدر ھے کہ جن لوگوں پر طوفان آیا تھا اُن میں سے بجز نوح کی ذریت کے اور کوئی نہیں بچا ۔ پھر اُس سے تمام دنیا پر طوفان کا آنا کیوں کر ثابت ھو سکتا ھے ۔ حقیقت یہ ھے کہ ھمارے ھاں کے علماء نے صرف یھودیوں کی پیروی کر کے طوفان کا عام ھونا قرآن مجید سے نکالنا چاھا تھا ورنہ ھمارے قرآن مجید سے عام ھونا طوفان کا نہیں پایا جاتا ۔ فتدبر ۔

قرآن مجید میں یہ بیان نہیں ھے کہ طوفان کا پانی اس قدر اُونچا ھو گیا تھا کہ اُونچے پہاڑ بھی چھپ گئے تھے ۔ بلکہ سورۂ قمر میں

صرف یہ آیا ہے کہ ۔ ففتحنا ابواب السماء بماء منہمر و فجرنا الارض عیونا فالتقی الماء علی امر قد قدر ۔ (سورۃ قمر آیت ۱۱ و ۱۲) ۔ فاذا جاء امرنا وفار التنور (سورۂ مومنین آیت ۲۷) ۔

یعنی ۔ ہم نے موسلا دھار مینہ پڑنے سے آسمان کے دروازے کھول دے اور ہم نے زمین کے چشموں کو پھاڑ دیا پھر ایک پانی دوسرے پانی سے مل گیا ۔ مقرر کیے ہوئے کام پر ۔ سورۂ مومنین میں فجرنا الارض کی جگہ ، فار التنور ۔ کا لفظ آیا ہے اس کے معنی روٹی پکانے کے تنور کے لینے صریح غلطی ہے ۔ کیوں کہ خود قرآن مجید میں دوسری آیت سے اس کی تفسیر ہوتی ہے یعنی جو معنی فجرنا الارض کے ہیں وہی معنی فار التنور کے ہیں ۔ قاموس میں لکھا ہے کہ التنور کل مفجر ماء یعنی جہاں سے زمین میں پانی پھوٹ نکلے اور چشمہ جاری ہو جاوے اس کو تنور کہتے ہیں اور یہ معنی بالکل قرآن مجید کی پہلی آیت کے مطابق ہیں جس سے دوسری آیت کی تفسیر ہوتی ہے ۔ پس قرآن مجید سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ مینہ نہایت زور سے برسا ، زمین میں سے چشمے جاری ہو گئے اور ایک پانی دوسرے سے مل گیا اور تمام ملک سطح آب ہوگیا اور اس قدر پانی چڑھا کہ کشتی تیرنے لگی اور جو لوگ کشتی میں نہ تھے وہ ڈوب گئے ۔

اس پر یہ شبہ وارد ہو سکتا ہے کہ اگر پانی اس قدر نہیں چڑھا تھا کہ پہاڑ بھی ڈوب گئے تھے تو لوگوں اور جانوروں نے پہاڑوں پر کیوں نہ پناہ لی ۔ جیسے کہ حضرت نوح کے بیٹے نے کہا تھا کہ میں پہاڑ پر پناہ لے لونگا ۔ مگر غور کرنا چاہیے کہ ایسے شدید طوفان میں جس میں اس قدر زور سے مینہ برستا ہو دریا اُبل گئے ہوں زمین سے پانی پھوٹ نکلا ہو کسی جاندار کو کسی مامن

تک پہنچنے کی فرصت نہیں مل سکتی اور یہ بات ہم ادنٰی سے ادنے
طغیانی پانی میں دیکھتے ہیں کہ ہزاروں آدمی ڈوب کر مر جاتے ہیں
اور کسی طرح جان بچا نہیں سکتے ۔ پھر ایسے بڑے طوفان میں
جیسا کہ حضرت نوح کا تھا ۔ اور بہت دنوں تک برابر پانی برستا
رہا لوگوں کا اور جانوروں کا اُس سے بچنا اور جان بچانا ناممکن تھا ۔
علاوہ اس کے میری رائے میں توریت مقدس سے بھی طوفان کا
عام ہونا اور پانی کا اس قدر چڑھ جانا ، جس نے اونچے اونچے دنیا کے
پہاڑوں کو بھی چھپا لیا ہو ہرگز ثابت نہیں ہوتا ۔ چناں چہ میں
نے اپنی کتاب تبیین‌الکلام میں اس پر پوری بحث کی ہے مگر چوں
کہ اس تفسیر میں توریت کی آیتوں پر بحث کرنا مقصود نہیں ہے
اس لیے اُن پر بحث نہیں کی جاتی ہے البتہ اُن واقعات کی نسبت جو
قرآن مجید میں مذکور ہیں اور توریت میں اُن کا ذکر نہیں ہے کچھ
لکھنا مناسب ہے ۔

سورہ ہود میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ :

و نادیٰ نوح ابنه وكان فی معزل یٰبنیّ ارکب معنا
ولا تکن مع الکافرین قال ساوی الی جبل یعصمنی من
الماء قال لا عاصم الیوم من امر اللہ الا من رحم و حال
بینهما الموج فکان من المغرقین ۔ (سورہ ہود آیت
۴۴ و ۴۵) ۔

یعنی ۔ اور پکارا نوح نے اپنے بیٹے کو اور وہ ہو رہا تھا
کنارے ، اے بیٹے سوار ہو ساتھ ہمارے اور مت ہو ساتھ کافروں کے ،
کہا اُس نے میں چڑھ جاؤں گا پہاڑ پر بچاوے گا مجھ کو پانی سے ۔
نوح نے کہا کہ کوئی بچانے والا نہیں ہے آج کے دن اللہ کے حکم
سے ، مگر وہ جس پر وہ رحم کرے اور آ گئی اُن دونوں میں موج
پھر ہو گیا ڈوبنے والوں میں ۔

اور اسی سورہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ۔ و نادیٰ نوح ربہ فقال رب ان ابنی من اهلی و ان وعدک الحق و انت احکم الحاکمین قال ینوح انہ لیس من اهلک انہ عمل غیر صالح فلا تسئلن ما لیس لک بہ علم انی اعظک ان تکون من الجاھلین قال رب انی اعوذ بک ان اسئلک ما لیس لی بہ علم و الا تغفرلی و ترحمنی اکن من الخٰسرین (سورہ ھود آیت (۴۶ - ۴۸) ۔

یعنی ۔ اور پکارا نوح نے اپنے رب کو پھر کہا اے رب میرا بیٹا ہے گھر والوں میں سے اور تیرا وعدہ سچا ہے اور تو حاکموں کا حاکم ہے فرمایا اے نوح وہ نہیں تیرے گھر والوں میں سے ۔ اس کے کام ھیں ناکارہ تو مت پوچھ مجھ سے ، تجھ کو معلوم نہیں ۔ میں بچاتا ھوں تجھ کو جاھلوں میں ھونے سے ۔ کہا اے رب میرے میں پناہ مانگتا ھوں تجھ سے یہ کہ چاھوں میں تجھ سے جو معلوم نہیں مجھ کو اور اگر تو نہ بخشیگا مجھ کو اور نہ رحم کرے گا تو ھونگا میں ٹوٹے والوں میں سے ۔

ان آیتوں سے بعض لوگ خیال کرتے ھیں کہ سوائے ان تین بیٹوں کے جن کا ذکر توریت مقدس میں ہے حضرت نوح کے ایک اور بیٹا تھا جو کافروں کے ساتھ ڈوب گیا ۔

مگر یہ خیال غلط ہے کہ حضرت نوح کا کوئی اور بیٹا سوائے ان تین بیٹوں کے نہ تھا اور یہ بیٹا جس کا یہاں ذکر ہے حضرت نوح کا بیٹا نہ تھا بلکہ حضرت نوح کی بیوی کا بیٹا پہلے خاوند سے تھا اور قائن کی نسل سے تھا اور غالباً یہ بیٹا نعمہ کا تھا جس کا نام کتاب پیدائش باب ۴ ورس ۲۲ میں آیا ہے ۔

یہ جو میں نے بیان کیا یہ میری رائے نہیں ہے بلکہ ھمارے یہاں کے مفسر بھی یہی لکھتے ھیں ۔ تفسیر کبیر میں ہے ۔ انہ کان

ابن امرته وهو قول محمد الباقر علیه السلام وقول الحسن البصری ویروی ان علیا رضی الله عنه قراء نادی نوح ابنه ابنها والضمیر لامرته وقرآ محمد بن علی الباقر و عروة ابن زبیر ابنه بفتح الها یرید انه ابنها الا انهما اکتفیا بالفتح من الالف و قال قتاده سالت الحسن من ابنه فقال والله ما کان ابناله فقال قلت له ان الله حکی عنه انه قال أن ابنی من اهلی و انت تقول ما کان ابناله فقال انه لم یقل انه ابنی ولکنه قال من اهلی و هذا یدل علی قولی - (تفسیر کبیر) -

یعنی - وہ جس کو حضرت نوح نے بیٹا کہا حضرت نوح کا بیٹا نہ تھا بلکہ حضرت نوح کی بیوی کا بیٹا تھا اور یہ قول ہے جناب محمد باقر علیہ السلام کا اور حسن بصری کا اور یہ روایت ہے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت محمد بن علی الباقر اور عروہ ابن زبیر نے اس آیت میں جو مذکر کی ضمیر ہے اور حضرت نوح کی طرف پھرتی ہے مؤنث کی ضمیر پڑھی تھی تاکہ حضرت نوح کی بیوی کی طرف پھرے اور قتادہ نے کہا کہ میں نے حسن بصری سے حضرت نوح کے بیٹے کا حال پوچھا - اُنھوں نے کہا قسم بخدا کہ حضرت نوح کا کوئی بیٹا جو طوفان میں ڈوبا نہ تھا - قتادہ نے کہا کہ خدا نے تو قول نوح کا یوں بیان کیا ہے کہ نوح نے اپنے بیٹے کو جو ڈوب گیا کہا کہ میرا بیٹا میرے خاندان میں سے ہے اور تم کہتے ہو کہ اُس کے کوئی بیٹا جو طوفان میں ڈوبا نہ تھا - حسن بصری نے کہا کہ حضرت نوح نے یہ نہیں کہا کہ میرا سگا بیٹا بلکہ یہ کہا کہ میرے خاندان کا بیٹا اور یہ اُن کا کہنا اُس بات پر دلالت کرتا ہے جو میں کہتا ہوں -

پس ان روایتوں میں سے ثابت ہوا کہ یہ شخص حضرت نوح

کا بیٹا نہ تھا اور اسی سبب سے توریت مقدس میں حضرت نوح کے بیٹوں کے ساتھ اس کا ذکر نہیں ہے ۔

جس آیت سے حضرت نوح کی بیوی کا طوفان میں ڈوبنا خیال کیا جاتا ہے وہ یہ ہے ۔

ضرب اللہ مثلاً الذین کفروا امرۃ نوح و امرۃ لوط کانتا تحت عبد ین من عبادنا صالحین فخانتا ھما فلم یغنیا عنہما من اللہ شیئا و قیل اد خلا النار مع الداخلین (سورہ تحریم آیت ۱۰) ۔

یعنی اللہ نے بتائی ایک کہاوت منکروں کے واسطے عورت نوح کی اور عورت لوط کی ، گھر میں تھیں دونوں دو نیک بندوں کے ہمارے بندوں میں سے پھر نافرمانی کی انھوں نے اُن کی پھر نہ دفع کیا انھوں نے اُن سے تھوڑا سا بھی عذاب اللہ کا اور حکم ہوا کہ جاؤ دوزخ میں ساتھ جانے والوں کے ۔ اس آیت سے لوگ خیال کرتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی بھی کافروں میں تھی اور وہ بھی غرق ہوئی اور توریت مقدس سے پایا جاتا ہے کہ حضرت نوح کی بیوی کشتی میں حضرت نوح کے ساتھ تھی اور اُنھوں نے ڈوبنے سے نجات پائی ۔

مگر سمجھنا چاہیے کہ باوجودیکہ اُس آیت میں حضرت نوح کی بیوی کا ڈوبنا صاف صاف بیان نہیں ہوا لیکن اگر اس پر بھی اُن کا ڈوبنا ہی سمجھیں تو اُس کے ساتھ ہی ہم کو یہ بات بھی کہنی چاہیے کہ ہمارے ہاں کتابوں سے پایا جاتا ہے کہ حضرت نوح کی دو بیویاں تھیں اُن میں سے ایک بیوی ڈوبی اور ایک حضرت نوح کے ساتھ کشتی میں گئی چناں چہ تفسیر کبیر میں ابن عباس سے سے روایت لکھی ہے کہ کشتی میں نوح اور ان کی بیوی تھی سوائے اس بیوی کے جو ڈوب گئی ۔ بعض علمائے یہود کہتے ہیں کہ حضرت

نوح کی ایک بیوی نعمه نسل قاین سے تھی اور ایک بیوی اولاد حضرت ادریس سے ، پس کچھ عجب نہیں که نعمه کافر ھو اور وہ ڈوب گئی ھو اور اسی سبب سے توریت مقدس میں اُس کا ذکر نه کیا ھو ، مگر جب یه ثابت ھے که حضرت نوح کی ایک بیوی بلاشبه کشتی میں تھی تو اگر اس آیت سے ایک بیوی کا غرق ھونا ھی مراد لیا جاوے تو بھی کچھ اختلاف نہیں رھتا ۔

سورۂ مومنین میں خدا نے یه فرمایا ھے ۔ فاذا جاء امرنا وفار التنور فاسلک فیها من کل زوجین اثنین (سورۂ مومنین آیت ۲۷ و ۲۸) یعنی ۔ که جب ھمارا حکم آوے اور زمین کے چشمے پھوٹ نکلیں تو بٹھا لے اُس میں یعنی کشتی میں ھر جوڑے سے دو ، توریت میں اس مضمون کو بہت زیادہ وسیع کر دیا ھے جس سے لوگ یه سمجھتے ھیں که تمام دنیا کے جانوروں کے جوڑے کشتی میں بٹھائے گئے تھے اور پھر اُس کے غیر ممکن ھونے پر بہت سی دلیلیں لائی گئیں ھیں ۔ مگر قرآن مجید اُن تمام مشکلات سے مبرا ھے کیوں که قرآن مجید سے صرف یه بات که جو جانور حضرت نوح کی دست رس میں موجود تھے اُن کے جوڑے کشتی میں بٹھائے گئے تھے کچھ تو اس خیال سے که کھانے کے کام آویں گے اور کچھ اس خیال سے که طوفان کے بعد اُن سے نسل چلے گی کیوں که ملک کی بردبادی کے بعد سردست اُن جانوروں کا باھم پہنچنا اور دوسرے ملکوں سے لانا علی الخصوص اُس زمانه میں که اس کام کے لیے وسائل ناپید تھے نہایت دقت طلب امر تھا ۔

تفسیر کبیر میں لکھا ھے که ۔ انما قوله فاسلک فیها ای دخل فیها یقال سلک فیه ای دخل فیه و سلک غیره و اسلکه من کل زوجین اثنین ای کل زوجین من الحیوان الذی یحضره فی الوقت اثنین الذکر و الانثی لکی لا ینقطع نسل ذالک الحیوان (تفسیر کبیر) ۔ یعنی خدا کے اس قول

کے کہ فاسلک فیہا یہ معنی ہیں کہ داخل کر یعنی بٹھا لے اس میں یعنی کشتی میں عرب کے محاورہ میں کہا جاتا ہے ۔ سلک فیہ یعنی داخل ہوا اُس میں اور اسلکہ ۔ن کل زوجین اثنین کا یہ مطلب ہے کہ جو جانور اُس وقت پر موجود ہوں اُن کے جوڑے نر و مادہ کشتی میں بٹھا لے تا کہ اُن جانوروں کی نسل منقطع نہ ہو جاوے ۔

باقی قصہ جو قرآن مجید میں مذکور ہے بہت صاف ہے اخیر قصہ پر خدا نے فرمایا ہے کہ یہ قصہ غیب کی خبروں میں سے ہے کہ ہم نے اُس کی تجھ پر وحی کی ہے نہ تو اسے جانتا تھا اور نہ تیری قوم اس سے پہلے ، صبر کر (اے محمد ! کافروں کے ایذا دینے اور جھٹلانے پر) بے شک آخر کو (کامیابی) پرہیزگاروں کے لیے ہے (ھود آیت ۵۱) ۔

اس آیت پر یہ سوال ہو سکتا ہے کہ کیا اس سے پہلے طوفان نوح کا قصہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اور عرب کے لوگوں کو جن میں کثرت سے یہودی آباد ہو گئے تھے اور کچھ عیسائی بھی آباد تھے ۔ معلوم نہ تھا ۔ مگر یہ بات نہیں ہے زیادہ پر قرین قیاس یہ ہے کہ یہ قصہ عام طور پر مشہور تھا مگر اس کے ساتھ بہت سی غلط باتیں بھی مشہور تھیں ۔ صحیح صحیح قصہ لوگوں کو معلوم نہ تھا جس کو خدا نے بذریعہ وحی کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے بتایا پس عدم علم کا جو ذکر اس آیت میں ہے وہ صحیح قصہ کے جاننے سے متعلق ہے نہ کہ عام طور پر اس قصہ سے ۔ قرآن مجید میں جس قدر اگلے قصے بیان ہوئے ہیں اگرچہ در اصل اُن سے عبرت دلانی مقصود ہوتی ہے مگر اُسی کے ساتھ یہ بھی ہوتا ہے کہ قصہ کو صحیح صحیح بیان کیا جاتا ہے تاکہ جو غلطیاں مشہور ہو رہی ہیں اُن کی صحت ہو جاوے ۔ قریباً تمام دنیا

کی قوموں میں طوفان کا قصہ بطور ایک مذہبی قصہ کے مشہور تھا اور اُس کے بیانات اور واقعات اس قدر مختلف اور عجیب طور پر مشہور ہو رہے تھے کہ ایک میں بھی پوری سچائی نہ تھی ۔ چند یورپ کے لوگوں مثل مسٹر ٹرینٹ اور ریو رنڈ ایل ۔ ڈی ھار کورٹ وغیرہ نے کتابیں لکھی ھیں جن میں اُن قصوں کو جمع کیا ھے جو طوفان کی بابت بطور مذہبی قصہ کے تمام دنیا میں مشہور ھیں ۔ پس وحی نے جو کچھ بتایا اور جو لوگوں کو معلوم نہ تھا وہ یہی ھے کہ صحیح قصہ طوفان کا کیا ھے ۔

یہودی اور عیسائیوں نے جو مذہبی طور پر سب سے بڑی غلطی اس قصہ میں ڈال رکھی تھی وہ یہ تھی کہ تمام دنیا میں طوفان آیا تھا اور کل کرۂ زمین پانی میں ڈوب گیا تھا اور طوفان کا پانی دنیا کے بڑے سے بڑے پہاڑوں کی چوٹیوں سے بھی اُونچا ھو گیا تھا اور حضرت نوح نے تمام دنیا کے ھر قسم کے جانداروں کا جوڑہ جوڑہ کشتی میں بٹھا لیا تھا اور تمام دنیا کے جانور تمام انسان اور چرند و پرند و حشرات الارض سب کے سب مر گئے تھے اور بجز اُن کے جو کشتی میں تھے کوئی جان دار تمام دنیا میں زندہ نہیں رہا تھا ۔ یہ ایک بڑی غلطی تھی جس کو قرآن مجید نے صحیح کیا ھے مگر افسوس اور نہایت افسوس کہ ھمارے مفسروں نے قرآن مجید کی اس برکت کو حاصل نہیں کیا اور وہ خود یہودیوں اور عیسائیوں کی تقلید سے اُسی غلطی میں پڑ گئے جس غلطی سے قرآن مجید نے اُن کو نکالنا چاھا تھا ۔

ایک اور امر غور طلب ھے متعلق حضرت نوح کے یعنی تعداد اُن کی عمر کی ، خدا تعالیٰ نے سورۂ عنکبوت میں فرمایا ھے کہ ۔ ولقد ارسلنا نوحا الی قومہ فلبث فیھم الف سنۃ الا خمسین عاما (سورۂ عنکبوت آیت ۲۹) ۔

یعنی - ہم نے بھیجا نوح کو اُس کی قوم کی طرف پھر وہ رہا اُن میں پچاس برس کم ایک ہزار برس -

توریت میں لکھا ہے کہ نوح چھ سو برس کے تھے جب طوفان آیا (کتاب پیدائش باب ۷ ورس ۶) اور پھر لکھا ہے کہ بعد طوفان کے نوح تین سو پچاس برس زندہ رہا اور اُس کی عمر نو سو پچاس برس کی تھی (کتاب پیدائش باب ۹ ورس ۲۸ و ۲۹) لیکن جب کہ انسان کی نسل بڑھنی شروع ہوئی تھی اور ابھی طوفان نہیں آیا تھا اُس وقت خدا نے کہا تھا کہ ''بسبب بودن ایشان بشرضالہ نہایت مدت ایام ایشان یکصد و بست سال خواہد شد'' (توریت کتاب پیدائش باب ۶ ورس ۳) -

مگر یہ ایک بہت طولانی بحث ہے دن اور برس جو توریت میں مندرج ہیں وہ نہایت بحث طلب ہیں دنیا کے ظہور اور انسان کے وجود کی جو مدت توریت میں لکھی ہے وہ بھی بڑی بحث کے قابل ہے -

اس میں بھی کچھ شبہ نہیں ہو سکتا کہ برس کی مدت ہر ایک زمانہ میں مختلف رہی ہے اور جس واقعہ یا انسان کی عمر کی تعداد اُس زمانہ کے حساب سے کی گئی ہے وہی تعداد بیان ہوتی رہی ہے جیسے کہ قرآن مجید اور توریت میں حضرت نوح کی عمر ساڑھے نو سو برس بیان ہوئی ہے -

علاوہ اس کے قدیم زمانہ کا یہ رواج بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس خاندان کا کوئی پیٹر یاٹک ہوا ہے جب تک کہ اُس خاندان میں دوسرا پیٹر یاٹک نام آور نہ ہوا ہو - پہلے پیٹر یاٹک ہی کا نام چلا جاتا ہے پس جب تک کہ ان سب باتوں پر بحث نہ ہو اُس وقت تک '' فلبث فیھم الف سنۃ الا خمسین عاما'' کی حقیقت بیان نہیں کی جا سکتی - اس مضمون میں ان تمام امور پر بحث کرنے

کی گنجائش نہیں ہے ۔ اگر خدا کی مرضی ہے تو ایک مستقل کتاب
میں اس پر بالاستیعاب بحث کی جاوے گی اور تمام سلسلہ مدت پیدائش
دنیا کا اور لوگوں کی عمروں کا جو توریت میں مذکور ہے
آلٹ پلٹ ہو جاوے گا ۔

حضرت ابراهیم علیہ السلام

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

و اذ قال ابراهیم لابیه آزر اتتخذ اصناماً آلهة انّی اراک وقومک فی ضلٰل مبین و کذالک نری ابراهیم ملکوت السمٰوات والارض و لیکون من الموقنین - فلما جنّ علیه الیل رای کوکباً قال هذا ربی فلما افل قال لا احب الافلین - یعنی - اور جب کہا ابراہیم نے اپنے باپ (یعنی چچا) آزر سے کہ کیا تو نے ٹھیرایا ہے بتوں کو خدا بے شک میں تجھ کو اور تیری قوم کو علانیہ گمراهی میں دیکھتا هوں اور اسی طرح هم ابراهیم کو دکھاتے تھے بادشاهت آسانوں کی اور زمین کی تا کہ وہ هووے یقین کرنے والوں میں سے - پھر جب اس پر رات چھا گئی اس نے ایک تارے کو دیکھا کہا یہ هے میرا رب پھر جب وہ ڈوب گیا تو کہا میں دوست نہیں رکھتا ڈوب جانے والوں کو -

ان آیتوں میں حضرت ابراهیم کی نسبت جو حالات مذکور هیں ان میں چند امور غور طلب هیں -

(۱) اول یہ کہ آزر حضرت ابراهیم کے کون تھے - قرآن مجید میں آزر کو حضرت ابراهیم کے اب کے لفظ سے تعبیر کیا هے مگر قرآن مجید میں باپ کا اطلاق باپ اور چچا دونوں پر آیا هے - قرآن میں هے کہ حضرت یعقوب کی اولاد نے کہا کہ ”نعبد الٰهک واله آبائک ابراهیم و اسمٰعیل و اسحاق“ حالاں کہ

اسماعیل حضرت یعقوب کے چچا تھے اُن پر بھی یعقوب کے باپ کا اطلاق ہوا ھے - تفسیر کبیر میں بھی بعض اقوال لکھے ھیں کہ اس آیت میں اب کا اطلاق عم پر ھوا ھے - ظن غالب ھے کہ حضرت ابراھیم کے باپ کا نام ترح تھا - توریت سے پایا جاتا ھے کہ ترح کے بھائی بھی تھے مگر توریت میں ان کے نام نہیں بیان کیے چناں چہ کتاب پیدائش باب ۱۱ ورس ۲۴ ، ۲۵ میں لکھا ھے کہ ''وناحور بست و نہ سال زندگی نمودہ ترح را تولید نمود - وناحور بعد از تولید نمودنش ترح یک صد نوزدہ سال زندگانی نمودہ پسران و دختران را تولید نمود'' ان آیتوں سے ترح کے بھائیوں یعنی حضرت ابراھیم کے چچاؤں کا ھونا پایا جاتا ھے -

علاوہ اس کے توریت کے اُسی باب میں لکھا ھے کہ بعد اُن تمام واقعات کے جو حضرت ابراھیم پر اُن کے وطن ''اور کسدیم'' میں گذرے اُنھوں نے اپنے وطن کو چھوڑدیا اور کنعان کی طرف روانہ ھوئے تو اُن ساتھ کے اُن کے باپ ترح بھی تھے اور اُنھوں نے بھی اس ملک کو چھوڑ دیا تھا چناں چہ ورس ۳۱ میں لکھا ھے کہ ''ترح پسر خود ابرام و پسر پسر خود لوط پسرھاران و عروس خود ساری زن پسرش ابرام را برداشت و باھم دیگر از اور کلدانیان بقصد رفتن بزمین کنعن بیروں آمدند'' پس یہ ایک دلیل اس بات کی ھے کہ جس مباحثہ کا قرآن مجید میں ذکر ھے وہ حضرت ابراھیم کے باپ سے نہیں ھوا تھا - بلکہ اب کا لفظ عم پر بطور اظہار محبت اور بزرگی چچا کے جن سے مباحثہ پیش آ گیا تھا بولا گیا ھے -

(۲) دوسرے یہ کہ جب حضرت ابراھیم نے یہ مباحثہ کیا تو اُن کی عمر کیا تھی - اس امر کا تحقیق کرنا نا ممکن ھے کیوں کہ ان امور کی تحقیقات صرف توریت پر منحصر ھے - نسخے توریت کے اس باب میں نہایت مختلف ھیں - عبری توریت سے معلوم ھوتا ھے

که سنه دنیوی کے ۱۹۵۸ برس بعد حضرت ابراهیم پیدا هوئے تھے اور یونانی نسخه توریت سے جس کو سپٹواجنٹ کہتے هیں آن کی پیدائش ۲۲۷۸ برس بعد سنه دنیوی کے اور سامری نسخه توریت سے ۲۵۹۸ برس بعد معلوم هوتی هے ۔ عیسائی مؤرخوں نے ولادت حضرت ابراهیم کی ۲۰۰۸ بعد سنه دنیوی کے اور ان کا اور کلدانیاں سے نکلنا ۲۰۸۳ سنه دنیوی میں قرار دیا هے اور اس حساب سے آس وقت آن کی عمر پچھتر برس کی تھی مگر اس حساب پر اعتماد کرنے کی کوئی کافی وجه نہیں هے ۔

قرآن مجید سے جہاں خدا نے فرمایا هے " قالوا سمعنا فتی یذکرهم یقال له ابراهیم " معلوم هوتا هے که آس زمانه میں حضرت ابراهیم جوان تھے اور دوسری جگه خدا نے فرمایا هے " ولقد آتینا ابراهیم رشده من قبل وکنا به عالمین " (سوره انبیا آیت ۵۲) اور اسی آیت کے اس مباحثه کا ذکر هے ۔ اس سے معلوم هوتا هے که قبل وقت مباحثه کے حضرت ابراهیم جوان اور رشید هو چکے تھے اور ان کا دل الہامات ربانی سے معمور تھا ۔ حسن کے لیے عموماً چالیس برس کی عمر خیال کی جاتی هے پس کچھ عجب نہیں هے که یه واقعه اسی عمر کے قریب واقع هوا هو ۔

مگر همارے علمائے مفسرین کو " فلما جن علیه اللیل نے گھبرا دیا هے وه سمجھے هیں که یه پہلی دفعه تھی جو انھوں نے رات دیکھی تھی اور اس لیے بے اصل قصه اپنی تفسیروں میں لکھا هے ۔ که آس زمانه کے بادشاه کے خوف سے جس نے ایک خواب دیکھا تھا اور لڑکوں کے قتل کا اراده کیا تھا ۔ حضرت ابراهیم کی ماں نے آن کے حمل کو چھپایا اور جب لڑکا پیدا هونے کا وقت آیا تو ایک پہاڑ کی کھوه میں جا کر جنا اور آس کا منه پتھروں سے

بند کر دیا اور حضرت جبریل نے حضرت ابراهیم کی پرورش کی - جب وہ اس پہاڑی کی کھوہ میں بڑے هو گئے تو اس کھوہ میں سے پہلی دفعہ رات کو ایک ستارہ دیکھا پھر چاند دیکھا پھر سورج دیکھا -

مگر یہ خیال اور یہ قصہ دونوں صحیح نہیں هیں - حضرت ابراهیم کے ناحور اور هاران دو اور بڑے بھائی تھے اور حضرت ابراهیم سب سے چھوٹے تھے - انسان کی فطرت میں هے کہ جب وہ کسی قوم میں پیدا هوتا هے تو یا تو اسی قوم کی باتوں پر یقین کرتا هے اور اسی قوم کے عقاید اور اعمال کی پیروی کرنے لگتا هے یا اس قوم کے افعال و اقوام کو تعجب و حیرت کی نگاہ سے دیکھتا رهتا هے ، نہ ان پر یقین کرتا هے اور نہ ان افعال میں شریک هوتا هے اور نہ اس کے ذهن میں آتا هے کہ اصل بات کیا هے اور ایک تفکر اور سوچ کی حالت میں ایک زمانہ بسر کرتا هے اور خدا کی هدایت جو خدا نے انبیاء اور صلحا کی فطرت میں رکھی هے اس کی تائید کرتی رهتی هے - اسی طرف خدا نے اشارہ کیا هے جہاں فرمایا هے ، ”کذالک نری ابراهیم ملکوت السمٰوات والارض“ اسی حالت میں ایک رات ستارہ اور چاند اور اس کے بعد سورج کو دیکھ کر حضرت ابراهیم کو وہ خیال آیا جو قرآن مجید میں مذکور هے پس ضرور نہیں هے کہ وہ رات پہلی هی رات هو جو انھوں نے دیکھی تھی -

(۳) تیسرے یہ کہ ”ملکوت السمٰوات والارض“ سے اور اس کے دکھانے سے کیا مراد هے - علمائے مفسرین نے اس کی نسبت بھی بہت سی رطب ویابس باتیں لکھی هیں مگر خدا کی قدرت اور اس کی عظمت اور وحدانیت پر یقین کرنے کے لیے موجودات عالم اور اس کی خلقت اور فطرت پر غور کرنے سے زیادہ یقین دلانے

والی کوئی چیز نہیں ہے اسی وجہ سے خدا تعالیٰ نے قرآن مجید میں متعدد طریقہ پر وجود عالم سے صانع کے وجود پر استدلال کیا ہے پس خدا نے آسمان و زمین کی بادشاہت کی حقیقت حضرت ابراہیم کے دل پر کھولی جس کی ابتداء تارے و چاند و سورج کو رب خیال کرنا اور اس کی انتہا ”انی وجہت وجہی للذی فطر السمٰوات والارض“ کہنا ہے اور اسی طرف خدا نے اشارہ کیا ہے، جہاں فرمایا ہے ”کذالک نری ابراھیم ملکوت السمٰوات والارض“۔

(۴) چوتھے یہ کہ علمائے اسلام کو ایک اور مشکل پیش آئی ہے کہ ان کے اصول مقررہ کے موافق انبیا کبھی اور کسی حال میں مرتکب شرک و کفر نہیں ہوئے پس کیوں کر حضرت ابراہیم نے تارہ اور چاند اور سورج کو دیکھ کر کہا ”ھذا ربی“ اس شبہ کے رفع کرنے کو انھوں نے متعدد طرح سے صعوبتیں اٹھائی ہیں مگر یہ امر نہایت صاف ہے جس میں کچھ مشکل نہیں۔

بلا شبہ انبیاء علیہم السلام کبھی مرتکب شرک و کفر نہیں ہوتے ان کی فطرت ہی اس آلودگی سے پاک ہوتی ہے۔ مگر قدیم زمانہ میں جو بت پرستی تھی اور جس کفر و شرک میں اس زمانہ کے لوگ گرفتار تھے اس کی حقیقت پر اول غور کرنی لازم ہے۔ تمام مشرکین ذات باری کا کسی کو شریک نہیں قرار دیتے تھے بلکہ خدا کے سوا موجودات غیر مرئی اور اجرام سماوی کو مدبرات عالم اور مالک نفع و نقصان سمجھتے تھے اور انھی کے نام سے ھیاکل اور اصنام بنا کر ان کی پرستش کرتے تھے اور ان کو یقین تھا کہ ان کی رضا مندی و خوش نودی فائدہ بخش اور ان کی ناراضی مضرت رساں ہے مگر کسی وجود غیر مرئی کو یا کسی کو اجرام سماوی میں سے صرف مدبر عالم خیال کرنا خواہ وہ خیال صحیح ہو یا غلط کفر و شرک نہیں ہو سکتا بلکہ کفر و شرک

اُس وقت ہوتا ہے جب کہ اُس میں قدرت نفع و نقصان پہنچانے کی مانی جاوے یعنی یہ سمجھا جاوے کہ اُس میں قدرت ہے کہ جب چاہے نفع پہنچاوے جب چاہے نقصان اور اسی خیال سے اس کی پرستش کی جاوے مثلاً مسلمانوں کا یہ خیال کہ مینہ کے برسانے والے فرشتے بادلوں پر متعین ہیں اور مینہ برساتے پھرتے ہیں یا یہ خیال کہ آفتاب فصول اربع کا باعث اور روئیدگی اور پھولوں اور پھلوں کا مدبر ہے نہ کفر ہے نہ شرک ہے ۔ لیکن جب آفتاب یا میگھ راج کی نسبت یہ اعتقاد کیا جاوے کہ اُن کو مینہ برسانے یا نہ برسانے اور میوہ پکانے یا نہ پکانے کا اختیار ہے اور اُن کی رضا مندی اُس کے لئے مفید اور ناراضی مضرت رساں ہے اور اس خیال پر ان کی پرستش کی جاوے ، تو وہ بلا شبہ شرک و کفر ہے ۔ ترح کے خاندان میں زیادہ تر اجرام علوی کے اصنام کی پرستش ہوتی تھی اسی وجہ سے حضرت ابراہیم کا خیال ستارے اور چاند اور سورج پر رب یعنی مدبرات میں سے ہونے کا گیا نہ الہ ہونے کا اور اُس کو بھی خدا کی ہدایت سے جو فطرت انبیاء میں ہے قرار نہ ہوا پس صرف یہ خیال شرک و کفر نہ تھا اور حضرت ابراہیم نے اُن میں سے کسی کی پرستش نہیں کی نہ اُن میں جب چاہیں نفع اور جب چاہیں مضرت پہنچانے کی قدرت یقین کی اس لیے کسی طرح اُن کا اس معصیت میں مبتلا ہونا لازم نہیں آتا ۔

اس بیان کی تشریح بعد کی آیتوں سے بخوبی ہوتی ہے جہاں حضرت ابراہیم ۔ فرمایا ہے کہ "میں نہیں ڈرتا اُس سے جس کو تم خدا کے ساتھ شریک کرتے ہو" پھر فرمایا کہ "کیوں کر میں ڈروں اُس سے جس کو تم شریک کرتے ہو" یہ اقوال صاف اس بات پر دال ہیں کہ جن کی نسبت حضرت ابراہیم نے ربی کہا تھا اُن کو مالک اور قادر نفع و نقصان پہنچانے پر نہیں مانا تھا ۔

(۵) پانچویں یہ کہ اس آیت میں جو الفاظ ”لیکون من الموقنین“ ہیں زیادہ تر غور کے لائق ہیں خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے ابراہیم کو ملکوت السمٰوات والارض اس لیے دکھائیں تاکہ یقین کرنے والوں میں ہو۔ ہم اُن لوگوں کو جو بہ تقلید آبائی یا باطاعت کسی کے قول کے خدا پر یقین رکھتے ہیں۔ مومن پاک جانتے ہیں۔ مگر جو لوگ کہ بعد غور و فکر کے اور خدا کی قدرتوں اور صنعتوں پر غور و فکر کر کے خدا پر یقین لاتے ہیں وہ نہایت اعلیٰ درجہ پر ہوتے ہیں جن کا یقین پورا کامل یقین ہوتا ہے اور کسی طرح زائل نہیں ہو سکتا۔ اسی سبب سے خدا نے حضرت ابراہیم کو ملکوت السمٰوات والارض دکھانے کا مقصد یہ بتلایا ہے کہ ”لیکون من الموقنین“۔

ہمارا یہ یقین و تجربہ ہے کہ انسان کو جس قدر علم فطرت، قوانین قدرت، علم السماء والافلاک بڑھتا جاتا ہے اور نیچرل سینر علوم طبیعیات حقہ میں جس قدر اُس کی واقفیت اور مہارت زیادہ ہوتی جاتی ہے اُسی قدر اُس کو خدا کے وجود کا یقین اور اُس کی قدرت و عظمت اور شان الوہیت اور استحقاق معبودیت کا دل میں زیادہ نقش ہوتا جاتا ہے۔ وللہ درمن قال۔

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

پس یہی قوانین قدرت لا آف نیچر تھے جو زبان شرع میں ملکوت السمٰوات والارض سے تعبیر کیے گئے ہیں اور جن کو خدا نے حضرت ابراہیم کو دکھایا تھا یا یوں کہو کہ سمجھایا تھا اور جس کی بدولت انھوں نے ”لیکون من الموقنین“ کا خطاب پایا۔

(٦) چھٹے یہ کہ یہ مباحثہ حضرت ابراہیم کا جو قرآن میں مذکور ہے توریت میں نہیں ہے - توریت میں کسی واقعہ کا نہ ہونا اُس کے عدم وقوع کی دلیل نہیں ہو سکتا -

---

حضرت ابراهیم اور حضرت لوط کے فرشتے

عہد قدیم کا ایک متنازعه فیه مسئله

تورت اور قرآن کریم میں آتا ہے که حضرت ابراهیم علیه السلام کو بیٹے کی خوش خبری دینے کے لیے اور حضرت لوط کو ان کی قوم کے عذاب کی پشین گوئی کرنے کے لیے خدا نے فرشتوں کو بھیجا - سرسید اس سے انکار کرتے ھیں اور کہتے ھیں که وہ فرشتے نہیں تھے بلکه انسان تھے - ذیل کے مضمون میں سرسید نے اس مسئله پر بحث کی ھے - (محمد اسماعیل)

قرآن مجید میں الله تعالیٰ فرماتا ھے - ''و لقد جاءت رسلنا ابراھیم بالبشریٰ قالوا سلٰماً قال سلٰم فمالبث ان جاءه' بعجل حنید (سورۂ ھود آیت ۶۹) اور بے شک آئے ھمارے بھیجے ھوئے ابراھیم کے پاس بشارت لے کر انھوں نے کہا سلام - ابراھیم نے کہا سلام - پھر ابراھیم نے دیر نه کی که لایا بھنا ھوا بچھڑا ''-

سورۂ عنکبوت میں یه لفظ ھیں لما جاءت رسلنا ابراھیم - یعنی جب که آئے ھمارے بھیجے ھوئے ابراھیم کے پاس سورۂ حجر میں بجائے رسلنا کے ضیف کا لفظ ھے خدا نے فرمایا - و نبہم

عن ضیف ابراھیم ۔ یعنی اُن کو خبر دے ابراھیم کے مہانوں کی ۔

اور سورۂ ذرایات میں ھے ۔ ھل اتاک حدیث ضیف ابراھیم المکرمین ۔ کیا تیرے پاس ابراھیم کے مکرم مہانوں کی خبر پہنچی ھے ۔

پس امر بحث طلب یہ ھے کہ یہ بھیجے ھوئے یا ضیف ابراھیم کون تھے؟ توریت باب ۱۸ ورس ۲ میں لکھا ھے کہ حضرت ابراھیم نے دیکھا کہ تین آدمی اُس کے برابر کھڑے ھیں عبری میں لفظ شلاشہ انشیئم ھے یعنی ثلاثہ انسانین اور پھر ورس ۱۶ ، ۲۲ میں اور باب ۱۹ ورس ۵ ، ۱۰ ، ۱۶ میں بھی اُن کو انسان کہا ھے مگر باب ۱۹ کے پہلے ورس میں اُن کو ملاخیم یعنی ملائکین کے لفظ سے تعبیر کیا ھے اس لیے یہودی اُن تینوں کو فرشتے اعتقاد کرتے ھیں اور کہتے ھیں کہ وہ جبریل و میکائیل و اسرافیل تھے ۔

عیسائی بھی اُن کو فرشتے مانتے ھیں اور کہتے ھیں کہ یہ پہلی ھی دفعہ تھی کہ فرشتے انسان کی صورت بن کر دنیا میں آئے تھے ۔ تفسیر ڈائلی اینڈ مانٹ میں لکھا ھے کہ اُن میں کا تیسرا بہ نسبت باقی دو کے اعلیٰ درجہ کا تھا اور اس لیے ابراھیم نے اُس کو بطور ایک سردار کے خطاب کیا یعنی ”ادنایٔ“ کہہ کر جس کو موسیٰ ”جہوہ“ کہتا ھے اور یہودی اور عیسائی اُس کو خدا کا نام سمجھتے ھیں اور اس لیے بہت سے عیسائی تصور کرتے ھیں کہ وہ خدا کا بیٹا تھا جو اس صورت میں آیا تھا ۔ متوسط زمانہ کے لوگ سمجھتے ھیں کہ وہ خدا کی شان میں ایک فرشتہ تھا جس نے گفتگو کی تھی اور بلحاظ اس کی مقتدرانہ گفتگو کے یہ غالب رائے ھے کہ وہ خود حضرت مسیح تھے جو انصاف کرنے کو آئے تھے ۔

قرآن مجید میں صرف لفظ ''رسلنا'' یعنی ہمارے بھیجے ہوئے کا ہے ۔ مسلمان مفسروں نے صرف یہودیوں کی روایتوں سے جن کی وہ ہمیشہ ایسے مقاموں میں پیروی کرتے ہیں اُن کو فرشتے تسلیم کیا ہے مگر قرآن مجید سے اُن کا فرشتہ ہونا ثابت نہیں ہوتا ۔ یہ تو ظاہر ہے قرآن مجید میں اُن کے فرشتے ہونے پر تو کوئی نص صریح نہیں ہے باقی رہا طرز کلام و الفاظ وارده پر استدلال قطع نظر اس کے کہ وہ مفید یقین نہیں ہو سکتا اُن سے بھی وہ استدلال پورا نہیں ہوتا ۔ علمائے مفسرین نے قبل اس کے کہ الفاظ قرآن مجید پر غور کریں یہودیوں کی روایتوں کے موافق اُن کا فرشتہ ہونا تسلیم کر لیا ہے حالاں کہ وہ خاصے بھلے چنگے انسان تھے ۔

تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ ابراہیم کے مہمانوں نے جو کھانا نہ کھایا اُس کا سبب یہ تھا کہ وہ فرشتے تھے اور فرشتے نہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں ۔ وہ مہمانوں کی صورت بن کر اس لیے آئے تھے کہ حضرت ابراہیم مہمانوں کے آنے کو دوست رکھتے تھے اور وہ مہمانوں کی ضیافت میں مشغول رہتے تھے[1] ۔

مگر کھانے سے انکار کرنا اُن کے فرشتے ہونے کی ، جو علانیہ انسان تھے اور انسانوں کی طرح آئے تھے ، دلیل نہیں ہو سکتا ۔

تفسیر کبیر میں سدی کا یہ قول لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم نے اُن سے پوچھا کہ کھانا کھاؤ گے ۔ انھوں نے کہا کہ ہم بغیر قیمت دئے کھانا نہیں کھاتے ۔ ابراہیم نے کہا کہ اُس کی قیمت یہ

۱۔ و اعلم ان الاضیاف انما استنعوا من الطعام لانهم ملائکة والملائکة لا یاکلون ولا یشربون و انما اتوه فی صورت الاضیاف لیکونوا علی صفة یحبها و هو کان مشغولا بالضیافة ۔ (تفسیر کبیر)

ھے کہ کھانے سے پہلے خدا کا نام لو اور کھانے کے بعد کا خدا شکر کرو ۔ اس پر جبریل نے میکائیل سے کہا کہ ایسے آدمی کا حق ھے کہ اس کا پروردگار اس کو اپنا خلیل یعنی دوست قبول کرے[۱] ۔

مگر کلام سے بھی یہ بات غیر معلوم رھی کہ بعد اس کے انھوں نے کھانا کھایا یا نہیں ۔

قرآن مجید میں آتا ھے کہ جب حضرت ابراھیم نے دیکھا کہ اُن کے ھاتھ کھانے پر نہیں بڑھتے تو نہ جانا کہ یہ کون ھیں (یعنی دوست مہمان ھیں یا دشمن) اور ابراھیم کے جی میں اُن سے خوف ھوا[۲] ۔

یہ اُس زمانہ کا طریقہ تھا کہ دشمن اس کے ھاں جس سے دشمنی ھو کھانا نہیں کھاتے تھے ۔ مگر اس آیت سے یہ بھی نہیں پایا جاتا کہ اس کے بعد بھی اُنھوں نے کھانا نہیں کھایا ۔

توریت میں لکھا ھے کہ اُنھوں نے حضرت ابراھیم کے پاس بھی کھانا کھایا اور جب وہ حضرت لوط کے پاس گئے تو وھاں بھی کھانا کھایا ۔ توریت فارسی کے ترجمہ کی یہ عبارت ھے ۔

و خداوند ویرا (یعنی ابراھیم را) در بلوطستان ممری ظاھر شد در حالتیکہ بر در چادر بگرمی روز می نشست و چشمان خود را کشادہ نگریست کہ اینک سہ شخص در مقابلش ایستادہ اند و ھنگامے کہ ایشان را دید از برائے استقبال ایشان از در چادر دویدو

۱۔ قال السدی قال ابراھیم علیہ السلام لھم اتاکلون قالوا الا ناکل طعاما الا بالثمن فقال ثمنہ ان تذکروا اسم اللہ تعالیٰ علیٰ اولہ و تحمدوہ علیٰ آخرہ فقال جبریل لمیکائیل علیہ السلام حق لمثل ھذا الرجل ان یتخذہ ربہ خلیلا ۔ (تفسیر کبیر)

۲۔ فلما رأ ایدیھم لا تصل الیہ نکرھم و اوجس منھم خیفہ ۔ (سورہ ھود)

بسوے زمین خم شد و گفت اے آقایم حال اگر در نظرت التفات یافتم تمنا اینکه از نزد بنده خود نگذری و حال اندک آبے آورده شود تا آن کـه پاہہائے خود را شست و شو داده در زیر این درخت استراحت فرمائید و لقمه نانے خواهم آورد تا که دل خود را تقویت نمایند بعد ازاں بگذرید زیرا که ازیں سبب نبزد بندۂ خود عبور نمودید پس گفتند بخوبے که گفتی عمل نما پس ابراهیم به چادر نزد سارا شتافت و گفت تعجیل نموده سه پیمانه آورد رقیق خمیر کرده گردها براجاق بپز پس ابراهیم بگله گاؤ شتافت و گوساله تر و تازه خوبے گرفته بخوانے داد که آن را بسرعت حاضر ساخت و کره و شیر باگوسالئیکه حاضر کرده بود گرفت و در حضور ایشاں گذاشت و نزد ایشاں بزیر آن درخت ایستاده تا خوردند ـ (کتاب پیدائش باب ۱۸ ورس ۱—۸)

پس آن دو ملک بوقت شام بسدوم در آمدند و لوط بدروازه سدوم مے نشست و هنگامے که لوط ملاخط کرد از برائے استقبال ایشاں برخاست و بر زمین خم شد و گفت اینک حال اے آقایانم تمنا اینکه بخانه بنده خود تاں بیائید و بیتوته نموده پائہائے خود را شست و شو نمائید و سحر خیزی نموده براه خود روانه شوید پس ایشاں گفتند که نے بلکه در چہار سو بیتوته مینمایم پس چوں که ایشاں را بسیار ابرام نمود با او آمده بخانه اش داخل شدند و او ضیافتے بجہت ایشاں بر پا نموده گرد هائے فطیری پخت که خوردند ـ (کتاب پیدائش باب ۱۹ ورس ۱—۳)

تفسیر کبیر میں ایک یه بحث پیش کی ہے که حضرت ابراهیم نے آن تینوں کو انسان جانا یا فرشته ـ جو لوگ کہتے که حضرت ابراهیم نے آن کو انسان جانا تها آن کی یه دلیلیں هیں که اگر وه ان کو فرشته جانتے تو کہانے کی تیاری نه کرتے اور جب

آنھوں نے کھانے پر ھاتھ نہ ڈالا تھا تو اس سے خوف نہ کرے ۔ علاوہ اس کے جب کہ حضرت ابراھیم نے ان کو انسان کی صورت میں دیکھا تھا تو آن کو فرشتہ کیوں کر سمجھ سکتے تھے ۔

اور جو لوگ کہتے ھیں کہ حضرت ابراھیم نے ان کو فرشتہ جانا تھا آن کا یہ دعوی ھے کہ ان کے کہنے سے حضرت ابراھیم نے آن کو فرشتہ جانا تھا ۔ مگر کوئی لفظ قرآن میں ایسا نہیں ھے کہ آن تینوں شخصوں میں سے کسی نے کہا ھو کہ ھم انسان نہیں ھیں بلکہ فرشتے ھیں اور انسان کی صورت بن کر آئے ھیں ۔

تفسیر کبیر میں ایک اور عجیب غریب روایت لکھی ھے کہ جب آن فرشتوں نے حضرت ابراھیم کو بتلا دیا کہ وہ فرشتوں میں سے ھیں اور انسان نہیں ھیں اور وہ صرف قوم لوط کے ھلاک کرنے کو آئے ھیں تو حضرت ابراھیم نے آن سے معجزہ طلب کیا کہ آن کے فرشتہ ھونے پر دلالت کرے ۔ پھر آنھوں نے اپنے پروردگار سے آس بھنے ھوئے بچھڑے کے زندہ ھو جانے کی دعا مانگی ۔ بچھڑا جہاں رکھا ھوا تھا وھاں سے کودا اور اپنے چراگاہ میں چلا گیا[۱] ۔

ھم کو افسوس ھے کہ ھمارے علماء نے ایسی بے سروپا اور بے سند مہمل روایتیں اپنی تفسیروں میں لکھی ھیں خدا آن پر رحم کرے ۔

اس میں کچھ شبہ نہیں ھے کہ وہ جو حضرت ابراھیم کے پاس آئے انسان تھے اور قوم لوط کے پاس بھیجے گئے تھے جیسا کہ

۱۔ ان الملائکۃ لما اخبروا ابراھیم علیہ السلام انھم الملائکۃ لامن البشر و انھم جاوا لاھلاک قوم لوط طلب ابراھیم علیہ السلام منھم معجزۃ دالۃ علی انھم من الملائکۃ فدعوا ربھم باحیاء العجل المشوی فطغر ذالک العجل المشوی من الوضع الذی وضع فیہ الی مرعاہ ۔ (تفسیر کبیر)

خود اُنھوں نے حضرت ابراھیم سے کہا ۔ لاتخف انا ارسلنا الیٰ قوم لوط (سورۂ ھود) اور دوسری جگہ کہا ۔ انا ارسلنا الیٰ قوم مجرمین (سورۂ حجر) اور ایک جگہ کہا ۔ انا ارسلنا الیٰ قوم مجرمین لنرسل علیھم حجارۃ من طین مسومۃ عند ربک للمسرفین ۔ (سورۂ الذاریات)

بالبشری ۔ یعنی ساتھ خوش خبری کے اور وہ خوش‌خبری حضرت ابراھیم کے حضرت سارا سے بیٹا اور پوتا یعنی اسحاق اور اسحاق سے یعقوب کے پیدا ھونے کی تھی جس کا بیان آگے آوے گا ۔

یعنی حضرت ابراھیم نے دیکھا کہ ان کا ھاتھ کھانے پر نہیں بڑھا تو نہ جانا کہ یہ کون ھیں اور ابراھیم کے دل مین اُن سے خوف پیدا ھوا[1] ۔

تفسیر کبیر مین لکھا ھے کہ جب انھوں نے کھانے سے اپنے تئیں روکا تو حضرت ابراھیم کو خوف ھوا کہ وہ کچھ مکر کرنے کا ارادہ رکھتے ھیں ۔ جب کوئی انجان آدمی آوے اور اُس کے سامنے کھانا لایا جاوے پھر وہ اگر کھا لیوے تو اس سے اطمینان ھو جاتا ھے اور اگر وہ نہ کھاوے تو اُس سے خوف پیدا ھوتا ھے[2] ۔

یہی مضمون سورہ الذاریات میں ان لفظوں سے آیا ھے کہ حضرت ابراھیم بھنا ھؤا بچھڑا اُن کے پاس لائے کہا کہ کیا تم نہیں کھاتے ؟ یعنی جب اُنھوں نے اس پر ھاتھ نہ بڑھایا جیسا کہ

۱۔ فلما را ایدیھم لا تصل الیہ نکرھم و او جس منھم خیفہ ۔ (سورۂ ھود)

۲۔ فلما امتنعوا من الا کل خاف ان یریدوا بہ مکروھا ان لا یعرف اذا حضرو قدم الیہ طعام فان اکل حصل الا من وان لم یاکل حصل الخوف ۔ (تفسیر کبیر)

سورۂ هود میں مذکور ہے تو حضرت ابراهیم نے کہا کہ کیا تم نہیں کھاتے ؟ پھر حضرت ابراهیم کے دل میں آن سے خوف پیدا هوا - ممکن ہے کہ حضرت ابراهیم کے اس کہنے کے بعد الا تاکلون - آن لوگوں نے کھایا هو اس لیے کھانے کی نفی اس سے نہیں پائی جاتی -

سورۂ الحجر میں اس واقعه کو زیاده اختصار سے بیان کیا ہے اور فرمایا ہے کہ جب وہ تینوں شخص ابراهیم کے پاس آئے تو آنهوں نے کہا سلام - حضرت ابراهیم نے کہا کہ هم تم سے خوف کرتے هیں[1] -

پورا واقعه یوں ہے کہ جب وہ تینوں شخص حضرت ابراهیم کے پاس آئے تو آنهوں نے کہا سلام - حضرت ابراهیم نے بھی کہا سلام - پھر حضرت ابراهیم بھنا هوا بچھڑا ان کے لیے کھانے کو لائے - جب آنهوں نے کھانے کے لیے هاتھ نه بڑھایا تو حضرت ابراهیم کے دل میں خوف پیدا هوا اس پر حضرت ابراهیم نے کہا که کیا تم نہیں کھاتے ؟ اور یه بھی کہا که هم تم سے (نه کھانے کے سبب) خوف کرتے هیں - انهوں نے کہا که هم سے خوف نه کرو هم تو قوم لوط کی طرف بھیجے هوئے هیں اور تم کو بھی بشارت دیتے هیں - پس ان تمام حالات سے نه تو آن تینوں شخصوں کا فرشته هونا پایا جاتا ہے اور نه یه بات ثابت هوتی ہے که آنهوں نے کھانا نہیں کھایا - بلکه اس طرف قرینه قیاس زیاده ہے که ان اصراروں کے بعد انهوں نے کھانا کھایا هو اور خدا تعالیٰ نے جو آن کو دو جگه ضیف ابراهیم کر کے بیان کیا ہے یه قرینه قوی

۱- اذ دخلوا علیه قالوا سلاما - قال انا منکم وجلون -
(سورۂ الحجر)

ہے کہ انھوں نے کھانا بھی کھایا اور حضرت ابراہیم کی ضیافت قبول کی ۔

پھر خدا نے فرمایا کہ اس کی بیوی کھڑی تھی پھر ہنس پڑی پھر ہم نے اس کو خوش خبری دی اسحاق کے پیدا ہونے کی اور اس کے پیچھے یعنی اسحاق سے یعقوب کے پیدا ہونے کی[1] ۔

حضرت ابراہیم کی بیوی کے ہنسنے کی علت بیٹا ہونے کی بشارت تھی مگر جو کہ اُن کا ہنس پڑنا ایک مقدم امر اور زیادہ تر توجہ کے قابل تھا ۔ اس لیے معلول کو علت پر مقدم کر دیا ہے ۔

تفسیر کبیر میں بھی لکھا ہے کہ یہاں تقدیم و تاخیر ہے ۔ تقدیم کلام الٰہی کی یہ ہے کہ اس کی بیوی کھڑی تھی پھر ہم نے اس کو بشارت دی اسحاق کے پیدا ہونے کی اُس کی بیوی خوشی سے ہنسی ۔ بسبب اس خوش خبری کے ۔ پس ہنسنے کو مقدم کر دیا ہے اور معناً وہ مؤخر ہے[2] ۔

ایک امر غور طلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے پہلے فرمایا کہ لقد جاءت رسلنا ابراھیم بالبشریٰ ۔ یعنی وہ رسل بشارت لے کر آئے تھے اور پھر فرمایا فبشرنا ھا باسحاق یعنی ہم نے بشارت دی ۔ ابراہیم کی بیوی کو اسحاق کے پیدا ہونے کی ۔ اس جگہ بشارت کو خاص اپنی طرف منسوب کیا ہے اور سورۃ الحجر میں ضیف ابراہیم کا قول بیان کیا ہے کہ " انا نبشرک بغلام

۱۔ و امرأتہ قائمۃ فضحکت فبشرنا ھا باسحاق ومن وراء اسحاق یعقوب ۔ (سورۂ ھود)

۲۔ ان ھذا علی التقدیم والتاخیر و امرأتہ قائمۃ فبشرنا ھا باسحاق فضحکت سرورا بسبب تلک البشارۃ فقدم الضحک و معناہ التاخیر ۔ (تفسیر کبیر)

حلیم‘‘ یعنی ضیف ابراهیم نے حضرت ابراهیم سے کہا کہ هم تجھ کو بشارت دیتے هیں دانا لڑکے کے پیدا هونے کی اور سورة الذاریات میں هے ’’و بشر وه بغلام حلیم‘‘ یعنی ضیف ابراهیم نے حضرت ابراهیم کو دانا لڑکے کے پیدا هونے کی بشارت دی ؟

اور اسی طرح سوره هود میں هے - قالت یاویلتیٰء الدوانا عجوز و هذا بعلی شیخا‘‘ یعنی ابراهیم کی بیوی نے کہا کہ ’’افسوس مجھ کو کیا میں جنوں گی اور میں بڑھیا هوں اور میرا خصم بڈھا هے -

اور سورۂ الذاریات میں هے کہ حضرت ابراهیم کی بیوی حیرت میں هو کر آگے بڑھی اور منه پیٹ لیا اور کہا کہ بانجھ بڑھیا[1] (یعنی کیا بانجھ بڑھیا بیٹا جنے گی) -

اور سورة الحجر میں هے کہ حضرت ابراهیم نے کہا کہ ’’کیا تم مجھ کو بشارت دیتے هو باوجودیکه مجھ پر بڑھاپا آ گیا هے پھر کس طرح تم مجھ کو بشارت دیتے هو[2]۔

مگر وه تینوں شخص خدا کے بھیجے هوئے تھے انھوں نے بذریعه الهام یا وحی کے جو آن پر خدا نے بھیجی تھی یه بشارت دی تھی - قرآن مجید کا طرز کلام بہت جگه اس طرح پر هے که خدا تعالیٰ علة العلل هونے کی وجه سے بندوں کے کاموں کو اپنی طرف منسوب کرتا هے اس لیے سورة هود میں اس بشارت کو اپنی طرف نسبت کیا هے که هم نے بشارت دی اور مقاموں پر اپنے رسل

۱- فا قبلت امرته فی صرة فصکت وجها و قالت عجوز عقیم - (سورۂ الذاریات)

۲- قال البشر تمونی علی ان منی الکبر فیما تبشرون - (سورۂ الحجر)

کی طرف منسوب کیا ہے - جن کے ذریعہ سے وہ بشارت دی گئی تھی مگر در حقیقت بشارت دینے والا خدا ہے -

یہ بشارت جو حضرت ابراہیم کے حضرت سارا سے بیٹا پیدا ہونے کی تھی دونوں کو معاً بشارت تھی یعنی ایک بشارت دونوں کے لیے تھی اور دونوں نے اُس کو سنا تھا اور اس لیے کبھی اُس بشارت کو حضرت ابراہیم سے اور کبھی اُن کی بیوی سے منسوب کیا ہے جو ضمناً اس بات کا ثبوت ہے کہ دونوں کے لیے یکساں بشارت ہے اور اسی سبب سے کہیں حضرت سارا کا قول نقل کیا ہے کہ "انا عجوزو ھذا بعلی شیخا" اور کہیں حضرت ابراہیم کا قول نقل کیا ہے کہ " ابشر تمونی علی ان مسنی الکبر" اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بشارت سن کر دونوں نے یہ بات کہی تھی -

اُن تینوں رسولوں نے جب حضرت سارا کا اس بشارت پر تعجب سنا تو انھوں نے کہا "اتعجبین من امر اللہ" یعنی کیا تو تعجب کرتی ہے خدا کے حکم سے اور حضرت ابراہیم کا تعجب سن کر انھوں نے کہا کہ ہم نے تجھ کو خوش خبری دی ہے - ٹھیک بس تو ناامیدوں میں سے مت ہو - حضرت ابراہیم نے کہا کہ کون شخص خدا کی رحمت سے ناامید ہوتا ہے بہ جز گمراہوں کے[1] -

یہ خیال کرنا کہ حضرت ابراہیم و حضرت سارا کی اولاد مافوق الفطرت ہوئی تھی اس پر قرآن مجید سے کوئی دلیل نہیں ہے -

---

۱- بشر ناک بالحق فلا تکن من القانطین قال ومن یقنط من رحمة ربه الا الضالون - (سورۃ الحجر)

قرآن مجید میں حضرت ابراهیم کی نسبت لفظ شیخ آیا هے اور لفظ شیخ ایسا نہیں هے کہ اس سے یہ سمجھا جاوے کہ حضرت ابراهیم اُس حد سے جس میں موافق قانون قدرت کے اولاد هو سکتی هے گذر چکے تھے -

حضرت سارا کی نسبت لفظ عجوز آیا هے اور عجوز کا لفظ اور شیخة کا لفظ دونوں مرادف هیں بلکہ کبھی جوان عورت پر بھی اطلاق هوتا هے - قاموس میں لکھا هے والعجوز - - - - المراۃ شابة کانت او شیخة اور یہی عجوز کا لفظ سورہ شعراء میں حضرت لوط کی بیوی کی نسبت آیا هے پس اس لفظ سے یہ ثابت نہیں هوتا کہ حضرت سارا ایسی حد پر پہنچ گئی تھیں جو موافق قانون قدرت کے اُن سے اولاد هونی نا ممکن هو -

دوسرا لفظ حضرت سارا کی نسبت عقیم یعنی بانجھ کا آیا هے - جن عورتوں کے هاں ایک زمانہ تک جو بہ نسبت عام عادت کے زیادہ هو اولاد نہیں هوتی اُن پر عادتاً عقیم کا لفظ اطلاق کیا جاتا هے اُس سے یہ ثابت نہیں هوتا هے کہ وہ اولاد جننے کے نا قابل هوتی هیں کیوں کہ بعض عورتیں اب بھی ایسی موجود هیں جن کے مدت تک اولاد نہیں هوئی اور وہ عقیم تصور هونے لگیں - لیکن بڑی عمر میں جب کہ وہ شیخة هو گئیں ان کے اولاد هوئی - ایک شوهر دار عورت کو میں جانتا هوں کہ قریب چالیس برس کی عمر تک اس کے اولاد نہیں هوئی بعد اُس کے وہ حاملہ هوئی اور بیٹی جنی بلا شبہ لوگوں کو اُس کے حاملہ هونے اور بیٹی جننے پر تعجب هوا تھا -

مسلمان مفسر جو بغیر غور کے یہودیوں کی روایتوں کی پیروی کرنے کے عادی هو گئے اس لیے انھوں نے یہ سمجھا هے کہ حضرت ابراهیم اور حضرت سارا کی عمر اس قدر بڑی هو گئی تھی کہ

اُن سے اولاد کا ہونا نا ممکن تھا اور اس لیے انھوں نے اس واقعہ کو بطور ایک معجزہ کے مافوق الفطرت قرار دیا ہے۔

توریت میں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم کی ننانوے برس کی عمر تھی جب اُن کا ختنہ ہوا۔ (کتاب پیدائش باب ۱۷ ورس ۲۴) اور ایک برس بعد وہ تین شخص بشارت دینے کو آئے تھے پس اُس وقت اُن کی عمر سو برس کی تھی۔

اور سارا کی نسبت لکھا ہے کہ وہ سال خوردہ ہو گئی تھیں اور عورتوں کی عادت بند ہو گئی تھی۔ (کتاب پیدائش باب ۱۸ ورس ۱۱)

غرض کہ عبری توریت کے حساب سے بشارت کے وقت حضرت ابراہیم کی عمر سو برس کی تھی اور حضرت سارا کی نوے برس کی تھی مسلمانوں نے ان روایتوں کی پیروی کی اور حضرت اسحاق کا پیدا ہونا فوق‌الفطرت بطور معجزہ کے قرار دیا باوجودیکہ توریت ہی سے پایا جاتا ہے کہ اُس عمر میں بھی لوگوں کے بغیر کسی معجزہ تسلیم کیے اولاد ہوئی ہے۔ چناں چہ توریت کے حساب کے موافق جب حضرت اسماعیل پیدا ہوئے تھے تو حضرت ابراہیم کی عمر چھیاسی برس کی تھی اور جب حضرت یعقوب کے حضرت یوسف پیدا ہوئے ہیں تو مطابق حساب توریت عبری کے حضرت یعقوب کی عمر نوے برس کی تھی اور جب بنیامین یوسف کے بھائی پیدا ہوئے ہیں تو حضرت یعقوب کی عمر ایک سو ایک برس کی تھی۔

مسلمان مفسروں نے جو اس باب میں یہودیوں کی روایتوں کی پیروی کی ہے صریح غلطی کی ہے کیوں کہ ان زمانوں کی صحت پر جو توریت سے نکلتے ہیں نہایت شبہ ہے۔

مثلاً عبری توریت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم ۲۰۰۸ دنیوی میں یعنی سن ۱۹۹۶ قبل مسیح کے پیدا ہوئے تھے

اور یونانی توریت سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۳۳۹۴ دنیوی میں پیدا ہوئے تھے اور سامری کی توریت سے معلوم ہوتا ہے کہ سن ۲۳۰۹ دنیوی میں ہوئے تھے -

حضرت سارا موافق توریت عبری کے سن ۲۰۱۸ دنیوی میں پیدا ہوئی تھی یعنی دس برس حضرت ابراہیم سے چھوٹی تھیں اور سن ۲۱۰۷ دنیوی میں بشارت ہوئی تھی جب حضرت ابراہیم ننانوے برس کے تھے اور حضرت سارا نواسی برس کی تھیں -

مگر جب کہ توریت کے نسخوں میں اس قدر اختلاف ہے تو جو زمانہ اُن سے نکلتا ہے بطور تخمینہ و انداز کے تصور ہو سکتا ہے نہ بطور ایسے یقین کے جس پر کوئی امر سافوق الفطرت بطور یقین کے مبنی ہو سکے -

علاوہ ازیں جو زمانے توریت سے تسلیم کیے گئے ہیں اُن میں بھی بدیہی غلطیاں ہیں جس کو مفصل بیان کرنے کی اس مضمون میں گنجائش نہیں ہے علاوہ اس کے ایک نہایت بڑی بحث یہ ہے کہ برس جو توریت میں بیان ہوئے ہیں اور جن پر اُس زمانے کے لوگوں کی عمر کا حساب بتلایا ہے اُن کی مقدار کیا تھی کچھ شبہ نہیں ہے کہ مختلف زمانوں میں برس کی مقدار نہایت ہی مختلف رہی ہے اور اُسی مقدار سے جس زمانہ میں جس کی عمر جتنے برس کی گنی جاتی تھی وہی تعداد توریت میں اور نیز بعض جگہ قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے اور یہ امر نہایت غور اور تحقیقات اور بیان کا محتاج ہے کیا عجب ہے کہ اگر خدا نے مدد کی اور توفیق دی تو تفسیر القرآن کے کسی مناسب مقام میں یا ایک جداگانہ رسالہ میں ہم اس کو بیان کریں گے اس مقام پر صرف اس قدر بیان کرنا کافی ہے کہ ہر گاہ قرآن مجید سے حضرت ابراہیم اور حضرت سارا کی وہ حالت جس میں مطابق قانون قدرت کے اولاد کا ہونا نا ممکن ہو ثابت نہیں ہے تو

صرف یہودیوں کی روایتوں یا توریت کی استدلال پر اس کو ایک واقعہ فوق الفطرت یقین کرنا صحیح نہیں ہے۔

اس کے آگے قرآن شریف میں آتا ہے کہ جب حضرت ابراہیم کا ڈر جاتا رہا اور اُن کو خوش خبری مل گئی اور اُن کو حضرت لوط کی قوم پر عذاب نازل ہونے کا حال معلوم ہوا تو اُنھوں نے اُس میں جھگڑنا شروع کیا[1]۔

اول یہ بحث ہے کہ حضرت ابراہیم کو قوم لوط پر عذاب نازل ہونا کس طرح معلوم ہوا۔ (توریت باب ۱۸ ورس ۲۰، ۲۱، ۲۲ میں لکھا ہے کہ خداوند گفت چوں فریاد سدوم و عمورہ زیادہ و گناہان ایشاں بسیار سنگین است پس فرود آمدہ خواہم دید کہ آیا بالکلیہ مثل فریادے کہ بمن رسیدہ است عمل نمودہ اند اگر چنیں نہ باشد خواہم دانست و آں اشخاص توجہ نمودہ بسوے سدوم روانہ شدند۔ جس لفظ کا ترجمہ خداوند کیا گیا ہے وہ لفظ یہوہ یا جہوہ ہے جو خدا کا نام ہے۔ پس توریت سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے حضرت ابراہیم کو اس سے خبر دی تھی۔ مگر قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنھی تین شخصوں نے جو بھیجے گئے تھے خبر دی تھی۔

سورۃ الحجر میں ہے کہ حضرت ابراہیم نے کہا پھر کیا ہے تمھارا کام اے بھیجے ہوؤں اُنھوں نے کہا کہ ہم بھیجے گئے ہیں گنہگار قوم کی طرف[2]۔

اور سورۂ الذاریات میں آیا ہے کہ حضرت ابراہیم نے کہا پھر تمھارا کیا کام ہے اے بھیجے ہوؤ۔ انھوں نے کہا کہ ہم بھیجے گئے ہیں گنہگار قوم کی طرف تاکہ ہم ڈالیں اُن پر پتھر

۱۔ فلما ذھب عن ابراھیم الروع و جاءتہ البشریٰ یجادلنا فی قوم لوط۔ (سورہ ھود۔ آیت ۷۷)

۲۔ قال فما خطبکم ایھا المرسلون قالوا انا ارسلنا الی قوم مجرمین۔ (سورۃ الحجر)

مٹی سے نشان کیے گئے ہیں ۔ تیرے پروردگار کے نزدیک حد سے بڑھ جانے والوں کے لیے[1] ۔

دوسری اس پر یہ بحث ہے کہ حضرت ابراہیم نے کس سے بحث شروع کی اس آیت میں '' نا '' کی ضمیر خدا کی طرف ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ خدا سے بحث بمعنی التجا شروع کی ۔ توریت باب ۱۸ ورس ۲۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بحث خدا ہی سے ہوئی تھی ۔ کیوں کہ اس میں لکھا ہے کہ اُن اشخاص کے مدوم کو چلے جانے کے بعد '' در حالیکہ ابراہیم در حضور خداوند مے ایستادہ پس ابراہیم تقرب جستہ گفت الخ ۔

مگر ہمارے علمائے مفسرین لکھتے ہیں کہ یجادلنا سے مراد یجادل رسلنا ہے ۔ لیکن قرآن مجید میں جو بحث لکھی ہے وہ نہایت مختصر اور ایک امر کی نسبت ہے اور توریت میں جو لکھی ہے وہ نہایت لمبی ہے ممکن ہے کہ جو بات قرآن مجید میں ہے وہ ان تین شخصوں سے ہوئی ہو اور جس مجادلہ کا ذکر سورۂ ہود میں ہے اور یجادلنا کے لفظ سے بیان ہوا ہے وہ التجا خدا ہی سے ہو ۔

سورۂ ہود میں تو مجادلہ کا کچھ بیان نہیں ہے اور سورۃ الحجر میں صرف اس قدر ہے کہ اُن تین شخصوں نے کہا کہ ہم بھیجے گئے ہیں گنہگار قوم کی طرف بہ جز آل لوط کے یعنی کہ وہ گنہگار قوم میں نہیں ہیں ۔ ہم بیشک اُن سب کو بچانے والے ہیں بہ جز اُس کی جورو کے ہم نے ٹھیرا دیا کہ وہ پیچھے رہ جانے والوں میں ہے[2]

۱۔ قال فما خطبکم ایھا المرسلون قالوا انا ارسلنا الی قوم مجرمین لنرسل علیھم حجارۃ من طین مسومۃ عند ربک للمسرفین ۔ (سورۂ الذاریات)

۲۔ قالو انا ارسلنا الیٰ قوم مجرمین الا آل لوط انا المنجوھم اجمعین الا امراتہ قدرنا انھا لمن الغابرین ۔ (سورۂ ہود)

اور سورہ عنکبوت میں ھے کہ اُن تین شخصوں نے جو حضرت ابراھیم کے پاس آئے تھے کہا کہ ھم بیشک اس بستی کے لوگوں کو ھلاک کرنے والے ھیں ۔ بات یہ ھے کہ اس بستی کے رھنے والے ظالم ھیں ۔ حضرت ابراھیم نے کہا کہ اُس میں تو لوط بھی ھے ۔ اُنھوں نے کہا کہ ھم جانتے ھیں اُس کو جو اُس میں ھے البتہ بچا دیں گے ھم اس کو اور اس کے لوگوں کو بجز اُس کی جورو کے وہ ھے پیچھے رھنے والوں میں سے[1] ۔

اور سورۂ الذاریات میں ھے کہ اُن تین شخصوں نے کہا کہ ھم بھیجے گئے ھیں گنہگار قوم کی طرف تاکہ ھم ڈالیں اُن پر پتھر مٹی سے ، نشان کیے گئے تیرے پروردگار کے نزدیک حد سے بڑھ جانے والوں کے لیے ۔ پھر ھم نے اُس کو نکال لیا جو اس میں ایمان والوں میں ھے اور پھر ھم نے اُس میں نہیں پایا سوائے ایک گھر کے مسلمانوں میں سے اور ھم نے اُس میں ایک نشانی چھوڑ دی اُن لوگوں کے لیے جو دکھ دینے والے عذاب سے ڈرتے ھیں[2] ۔

ان آیتوں میں تو حضرت ابراھیم کا صرف حضرت لوط کی نسبت سوال کرنا معلوم ھوتا ھے مگر ان آیتوں میں جو ایک مشکل ھے وہ یہ ھے کہ ان آیتوں میں جو الفاظ انا لمنجوھم یعنی

۱۔ قالوا انا مھلکوا ھذہ القریة ان اھلھا کانوا ظالمین قال ان فیھا لوطا قالوا نحن اعلم لمن فیھا لننجینه و اھله الا امراته انت من الغابرین ۔ (سورۂ عنکبوت)

۲۔ قالو انا ارسلنا الی قوم مجرمین لنرسل علیھم حجارة من طین مسومة عند ربک للمسرفین فاخرجنا فیھا من المومنین فما وجدنا فیھا غیر بیت المسلمین و ترکنا فیھا آیة للذین یخافون العذاب الالیم ۔ (سورۂ الذاریات)

بیشک هم اُن سب کو بچانے والے هیں انا مهلکوا هذه القریة یعنی هم بیشک اس بستی کے لوگوں کو هلاک کرنے والے هیں - لنرسل علیهم حجارة یعنی تاکه هم ڈالیں ان پر پتھر - فاخرجنا پھر هم نے لوط کو نکال لیا - فما وجدنا فیها - یعنی هم نے بجز ایک گھر مسلمان کے اور نه پایا - و ترکنا فیها اور چھوڑی هم نے اُس میں نشانی اور مثل اُس کے اور چند الفاظ هیں که اُس پر مقتدرانه کہنا نه رسولوں کے اختیار میں هے نه فرشتوں کے بلکه یه مقتدرانه کام صرف خدا کی قدرت میں هیں نه کسی بندے کے خواه رسول هوں یا انسان یا فرشتے -

اس کی نسبت تمام مفسرین نے لکھا هے که ان تمام مقتدرانه کاموں کو جو اُن تین شخصوں نے اپنی طرف نسبت کیا هے جو خدا کے کام هیں - اس لیے کیا هے که خدا سے اُن کو تقرب و خصوصیت حاصل تھی[1] -

مگر میں اس توجیه کو تسلیم نہیں کرتا - کوئی بنده ایسے مقتدرانه کام اپنی نسبت منسوب نہیں کر سکتا - اس قصه کو خدا نے حکایةً بیان کیا هے جس میں ان تین شخصوں کے اقوال اور خدا کے مقتدرانه افعال دونوں شامل بیان هوئے هیں - پس وه تمام ضمیریں اور مقتدرانه الفاظ خدا کی طرف هیں نه اُن تین شخصوں کی طرف -

اُس کا ثبوت خود قرآن مجید کی ایک آیت سے هوتا هے جس میں بلا ذکر اُن تین شخصوں کے اُن مقتدرانه امور کو خدا نے خاص اپنی طرف منسوب کیا هے - سورۂ قمر میں خدا نے فرمایا هے - یعنی جھٹلایا لوط کی قوم نے ڈرانے والوں کو بیشک

۱- اسنادهم ایاه الی انفسهم و هو فعل الله تعالیٰ لما لهم من القرب والاختصاص به - (تفسیر بیضادی)

هم نے پہنچائی اُن پر پتھروں کی بوچھاڑ بجز لوط کے لوگوں کے هم نے اُن کو بچایا ۔ صبح کے وقت اپنے پاس سے انعام کر کے اسی طرح هم بدلا دیتے هیں اُس کو جو شکر کرتا هے اور بیشک اُن کو ڈرایا تھا همارے عذاب سے ، پھر اُنھوں نے تکرار کی ڈرانے والوں سے اور بیشک اُنھوں نے دند مچائی اُس یعنی لوط کے مہمانوں سے پھر بیکار کر دیں هم نے اُن کی آنکھیں پھر وہ چکھیں میرا عذاب اور میرے ڈرانے والوں کا اور بے شبه گھیر لیا اُن کو بہت سویرے جگه پر قائم رهنے عذاب نے پھر چکھیں میرا عذاب اور میرے ڈرانے والوں کا[1] ۔

توریت میں ایک اور مجادله کا یعنی التجا کا ذکر لکھا هے جو ابراهیم نے خدا سے کی تھی اور سورہ هود میں جو یجادلنا فی قوم لوط آیا هے اور وہ مجادله بیان نہیں کیا ۔ کیا عجب هے که اس سے وهی مجادله یا التجا مراد هو جس کا ذکر توریت میں هے مفسرین بھی اُس لفظ سے یہی مجادله بمعنی التجا سمجھتے هیں ۔ چناں چه هم فارسی ترجمه توریت کا اس مقام پر نقل کرتے هیں ۔

و آں اشخاص از آں جا توجه نموده بسوئے سدوم روانه شدند در حالتیکه ابراهیم در حضور خدا وندمے ایستاده پس ابراهیم تقرب جسته گفت که آیا حقیقةً صالح را با طالح هلاک خواهی ساخت احتمال دارد که در اندرون شهر پنجاه نفر صالح باشند آیا بشود که آں مکاں را هلاک سازی و بسبب آں پنجاه نفر صالحے که در اندرونش

۱۔ کذبت قوم لوط بالنذر انا ارسلنا علیهم حاصبا الا آل لوط نجیناهم بسحر نعمة من عندنا کذالک نجزی من شکر و لقد انذرهم بطشتنا فتماروا بالنذر ولقد راودوه عن ضیفه فطمسنا اعینهم فذوقوا عذابی و نذر ولقد صبحهم بکرة عذاب مستقر فذوقوا عذابی و نذر ۔ (سورۂ قمر)

مے باشند نجات ندهی حاشا از تو که مثل این کارے کنی و صالحان
را با طالحان هلاک سازی و صالح با طالح مساوی باشد حاشا از تو
آیا میشود که حاکم تمامی زمین عدالت نکند پس خدا وند گفت اگر
درمیان شهر سدوم پنجاه نفر صالح پیدا بکنم تمامی اهل آن مکان را
بسبب ایشان نجات خواهم داد و ابراهیم در جواب گفت اینک حال منکه
خاک و خاکستر ستم آغاز تکلم نمودن باآقایم سے نمایم بلکه از پنجاه
نفر صالح پنج نفر کمی نمایند آیا میشود که تمامی اهل شهر را به
سبب آن پنج نفر هلاک سازی پس گفت اگر در آنجا چهل و پنج نفر
یابم هلاک نخواهم کرد و بار دگر باو متکلم شده گفت بلکه در
آن چهل نفر یافته شود پس او گفت که به سبب چهل نفر آن عمل
نخواهم نمود و او گفت تمنا اینکه آقایم غضبناک نشود که تکلم
نمایم بلکه در آن سی نفر یافته شوند ـ او گفت اگر در اینجا سی نفر
پیدا بکنم آن عمل نخواهم نمود دیگر گفت اینک حال آغاز تکلم با
آقایم نموده ام بلکه در آنجا بست نفر یافته شود او گفت که به سبب
بست نفر هلاک آن نخواهم کرد و دیگر گفت تمنا اینکه آقایم
غضب ناک نشود تا آن که یک بار دیگر تکلم نمایم بلکه در آنجا
ده نفر پیدا شود و گفت که بسبب ده نفر هلاک شان نخواهم
گردد و خدا وند هنگامے که کلام را با ابراهیم انجام رسانده بود
روانه شد و ابراهیم بمکانش رجعت نمود ـ (کتاب پیدائش باب ۱۸
ورس ۲۲ لغایت ۳۳)

ولما جاءت رسلنا لوطا ـ اب یہاں سے حضرت لوط کا
قصه شروع هوا مگر یہاں اُس قصه کے اخیر کا بیان ھے ـ شروع قصه
اور سورتوں میں بیان هواھے ـ توریت سے معلوم هوتا ھے که حضرت
ابراهیم اور حضرت لوط جب مصر سے واپس آئے تو علیحده علیحده
هو گئے حضرت ابراهیم کنعان مین رهے اور حضرت لوط اردن کے

میدان میں جو نہایت سرسبز و شاداب و زرخیز خطه تها اور جہاں سدوم و عمو راه و اوماد زبوئیم کی بستیاں تهیں چلے گئے ۔

اس زمانه میں ان تمام ملکوں میں طوائف الملوکی تهی اور آپس میں لڑائیاں هوتی تهیں ایک لڑائی میں حضرت لوط قید هو گئے حضرت ابراهیم نے فوج جمع کر کے پانچ بادشاهوں سے مقابله کیا اور حضرت لوط کو اور سدوم والوں کو چهڑایا ۔ یه واقعه عبری توریت کے حساب سے سن ۲۰۹۲ دنیوی میں یا سن ۱۹۱۲ قبل مسیح هوا تها ۔

غرض که حضرت لوط سدوم میں رهتے تهے جہاں کے لوگ نہایت بدکار تهے ۔ حضرت لوط نے ان سے کہا که 'میں خدا کا رسول هوں میری اطاعت کرو اور جو بد باتیں ان میں تهیں ان کے چهوڑنے کی نصیحت کی ۔

سوره شعرا میں خدا فرماتا هے که[1] جهٹلایا لوط کی قوم نے رسولوں کو جب که ان سے کہا ان کے بهائی لوط نے که کیا تم نہیں ڈرتے بیشک میں تمہارے لئے رسول هوں ۔ رسالت مجهے سپرد هے پهر ڈرو الله سے اور میری اطاعت کرو اور میں تم سے اس پر

---

۱ - كذبت قوم لوط المرسلين اذ قال لهم اخوهم لوط الا تتقون انى لكم رسول امين فاتقو الله واطيعون وما اسئلكم عليه من اجران اجرى الاعلى رب العالمين ـ اتاتون الذكران من العالمين و تذرون وما خلق لكم ربكم من ازواجكم بل انتم قوم عادون ـ قالوا لئن لم تنتته يا لوط لتكونن من المخرجين قال انى لعملكم من القالين رب بخنى و اهلى مما يعملون فنجيناه و اهله اجمعين الا عجوزا فى الغابرين ثم دمرنا الاخرين و امطرنا عليهم مطر فساء مطر المنذرين ـ (۲٦ ـ الشعراء ١٦٠ لغايت ١٧٣)

کچھ بدلا نہیں مانگتا ۔ میرا بدلا دینا کسی پر نہیں ھے بجز عالموں کے پروردگار پر ، کہا تم مردوں کے پاس آتے ھو جو دنیا میں ھیں اور چھوڑتے ھو اس کو جسے پیدا کیا ھے تمہارے لیے تمہارے پروردگار نے تمہاری جورووٴں میں سے بلکہ تم ایک قوم ھو حد سے بڑھ جانے والی ۔ انھوں نے کہا کہ اے لوط اگر تو بس نہ کرے گا تو بیشک نکالے گیوں میں سے ھوگا ۔ لوط نے کہا کہ بیشک میں تمہارے کام کے دشمنوں میں سے ھوں ۔ اے پروردگار مجھ کو اور میرے لوگوں کو اس کام سے جو وہ کرتے ھیں (یعنی اس کے وبال سے) نجات دے ۔ پھر نجات دی ھم نے اس کو اور اس کے لوگوں کو بجز ایک ادھیڑ عورت یعنی لوط کی بیوی کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں سے تھی پھر ھلاک کر دیا ھم نے اوروں کو اور برسایا ھم نے ان پر مینہ ایک قسم کا پھر ڈرائے گیوں پر مینہ برا ھے[1] ۔

اسی طرح سورہ نمل میں خدا نے فرمایا ھے کہ ھم نے لوط کو بھیجا ۔ جب اس نے اپنی قوم سے کہا کہ تم بیحیائی کا کام کرتے ھو اور تم دیکھتے ھو کیا تم بری خواھش سے عورتوں کے سوا مردوں کے پاس آتے ھو بلکہ تم جاھل قوم ھو پھر کچھ نہ تھا اس کی قوم کا جواب بجز اس کے کہ انھوں نے کہا کہ لوط کے لوگوں کو اپنی بستی سے نکال دو یہ لوگ پاک بننا چاھتے ھیں پھر بچا دیا

۱۔ و لوطا اذ قال لقومہ اتاتون الفاحشۃ و انتم تبصرون ء انکم لتاتون الرجال شھوۃ من دون النساء بل انتم قوم تجھلون فما کان جواب قومہ الا ان قالوا اخرجوا آل لوط من قریتکم انھم اناس یتطھرون فانجیناہ و اھلہ الا امراتہ قدرنا ھا من الغابرین و امطرنا علیھم مطرا فساء مطر المنذرین ۔ (۲۷ ۔ نمل ۔ ۵۵ لغایتہ ۵۹)

هم نے اس کو اور اس کے لوگوں کو بجز اُس کی جورو کے هم نے اس کے لیے ٹھہرا دیا تھا کہ وہ پیچھے رهنے والوں میں سے هے اور برسایا هم نے اُن پر ایک قسم کا مینہ پھر ڈرائے گیوں پر مینہ برا هے[۱] ۔

اور سورۂ اعراف میں هے اور بھیجا هم نے لوط کو جس وقت کہ اس نے کہا کہ اپنی قوم کو کیا تم فحش کام کرتے هو کہ اس کو تم سے پہلے کسی ایک نے بھی جہان کے لوگوں سے نہیں کیا ۔ بیشک تم مردوں کے پاس آتے هو شہوت رانی کو عورتوں کے سوا ۔ هاں تم ایک قوم هو حد سے گزری هوئی اور نہ تھا اُن لوگوں کا جواب بہ جز اس کے کہ اُنھوں نے کہا نکال دو اُن کو اپنی بستی سے بیشک وہ آدمی هیں اپنے تئیں پاک بنانے والے پھر نجات دی هم نے اس کو اور اس کے لوگوں کو بہ جز اس کی عورت کے کہ وہ تھی پیچھے رهنے والوں میں اور برسایا هم نے اُن پر برسانا پھر دیکھ کیا هوا انجام گنہگاروں کا ۔

اسی طرح سورہ عنکبوت میں خدا نے فرمایا هے کہ[۲] بھیجا هم

۱۔ ولوطا اذ قال لقومہ اتاتون الفاحشتہ ماسبقکم بھا من احد من العالمین ۔ انکم لتاتون الرجال شھوۃ من دون النساء بل انتم قوم مصرفون ۔ وما کان جواب قومہ الا ان قالوا اخرجوھم من قریتکم انھم اناس یتطھرون فانجیناہ و اھلہ الا امراتہ کانت من الغابرین و اسطرنا علیھم سطرا فانظر کیف کان عاقبۃ المجرمین ۔ (۷ ۔ الاعراف ۔ ۷۸ ۔ لغایت ۸۲)

۲۔ و لوطا اذ قال لقومہ انکم لتاتون الفاحشۃ ما سبقکم بھا من احد من العالمین ءانکم لتاتون الرجال و تقطعون السبیل و تاتون فی نادیکم المنکر فما کان جواب قومہ الا ان قالوا ائتنا بعذاب اللہ ان کنت من الصادقین قال رب انصرنی علی القوم المفسدین ۔ (سورۂ عنکبوت)

نے لوط کو جب کہ اس نے اپنی قوم سے کہا کہ البتہ تم بے حیائی کا کام کرتے ہو کہ تم سے پہلے کسی نے دنیا کے لوگوں میں سے نہیں کیا ۔ کیا یہ ٹھیک بات ہے کہ تم مردوں کے پاس آتے ہو اور رستہ لوٹتے ہو اور اپنی مجلسوں میں برے کام کرتے ہو ۔ پھر اس کی قوم کا کچھ جواب نہ تھا بجز اس کے کہ انھوں نے کہا کہ ہمارے لیے خدا کا عذاب لا اگر تو سچا ہے لوط نے کہا اے پروردگار میری مدد کر ظالم قوم پر ۔

غرض کہ حضرت لوط ان کو بری باتوں کے چھوڑنے کی نصیحت کرتے تھے ۔ اس عرصہ میں یہ تینوں رسول جو حضرت ابراھیم کے پاس آئے تھے وھاں پہنچے ۔ حضرت لوط ان کے آنے سے کبیدہ خاطر اور ان کے سبب سے دل تنگ ہوئے اور کہا کہ آج کا دن نہایت سخت ہے ۔

یہی مضمون سورۂ عنکبوت میں ہے جہاں خدا نے فرمایا ہے کہ جب آئے ہمارے رسول لوط کے پاس تو ان کے آنے سے کبیدہ خاطر اور ان کے سب سے دل تنگ ہوا ۔ انھوں نے کہا کہ مت ڈر اور غمگین مت ہو بے شک ہم تجھ کو اور تیرے لوگوں کو بچاویں گے ۔ بہ جز تیری جورو کے کہ وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہے اور ہم اتارنے والے ہیں اس بستی کے لوگوں پر عذاب آسمان سے اس لیے کہ وہ بدکاری کرتے ہیں اور بے شک ہم نے چھوڑا اس بستی کا نشان ظاہر واسطے ان لوگوں کے جو سمجھتے ہیں[1] ۔

۱۔ ولما ان جاءت رسلنا لوط سئی بھم و ضاق بھم ذرعاً قالوا الا تخف ولا تحزن انا منجوک واھلک الا امراتک کانت من الغابرین انا منزلون علی اھل ھذا القریۃ رجزا من السماء بما کانوا یفسقون ولقد ترکنا منھا آیۃ بینۃ لقوم یعقلون ۔ (عنکبوت)

یہی مضمون سورہ حجر میں ہے جہاں خدا نے فرمایا ہے کہ[1] جب لوط کے لوگوں کے پاس وہ رسول آئے تو کہا تم انجان لوگ ہو اُنھوں نے کہا کہ ہاں ہم تیرے پاس وہ لائے ہیں جس میں وہ شبہ کرتے تھے اور ہم تیرے پاس سچائی سے آئے ہیں اور بیشک ہم سچے ہیں ۔ اُن تینوں شخصوں یا رسولوں کے آنے کی خبر پا کر حضرت لوط کی قوم کے لوگ دوڑ پڑے یعنی حصرت لوط کا مکان گھیر لیا ۔

یہی مضمون مگر اس سے کسی قدر زیادہ تفصیل کے ساتھ سورۂ حجر میں آیا ہے جہاں خدا نے فرمایا ہے کہ شہر کے لوگ خوشی کرتے ہوئے آئے یعنی لوط کے گھر پر اس کا گھر گھیر کر جو لوگ اس کے گھر میں آئے تھے ان کے گرفتار کر لینے کے لیے ۔ حضرت لوط نے کہا کہ یہ میرے مہمان ہیں پھر اُن کو فضیحت مت کرو اور خدا سے ڈرو اور مجھ کو ذلیل مت کرو ۔ اُن لوگوں نے کہا کہ کیا ہم نے تجھ کو منع نہیں کیا تھا دنیا کے لوگوں سے (یعنی دوسرے ملک کے لوگوں سے ملنے اور بلانے اور اپنے ہاں رکھنے سے) ۔ لوط نے کہا یہ میری بیٹیاں ہیں اگر تم کچھ کرنا چاہتے ہو (یعنی اگر تم میرے مہمانوں کو پکڑنا چاہتے ہو) ۔ قسم ہے تیری زندگی کی کہ بے شک وہ اپنی گمراہی میں اندھے ہو رہے تھے ۔ پھر جا لیا اُن کو ہولناک آواز نے سورج نکلتے ہوئے ۔ پھر ہم نے شہر کی بلندی کو نیچان میں ڈال دیا اور ہم نے اُن پر آگ میں پکے ہوئے مقدر کیے ہوئے پتھر برسائے ۔ بیشک اُس

١- فلما جاء لوط المرسلین قال انکم قوم منکرون قالوا بل جئناک بما کانوا فیه یمترون وآتیناک بالحق و انا لصادقون ۔ (سورۃ الحجر)

میں نشانیاں ہیں عبرت پکڑنے والوں کو[1] ۔

اور سورۂ قمر میں فرمایا ہے کہ جھٹلایا لوط کی قوم نے ڈرانے والوں کو بے شک ہم نے بھیجی اُن پر پتھروں کی بوچھاڑ بہ جز لوط کے لوگوں کے ہم نے اُن کو بچایا صبح کے وقت اپنے پاس سے انعام کر کے اسی طرح ہم بدلا دیتے ہیں اُن کو جو شکر کرتا ہے اور بے شک اُن کو ڈرایا تھا ہمارے عذاب سے۔ پھر اُنھوں نے تکرار کی ڈرانے والوں سے اور بے شک اُنھوں نے دند مچائی اُس کے یعنی لوط کے مہمانوں سے پھر بے کار کر دیں ہم ۔ اُن کی آنکھیں پھر وہ چکھیں میرے عذاب اور میرے ڈرانے والوں کا اور بے شبہ گھیر لیا اُن کو بہت سویرے جگہ پر قائم رہنے والے عذاب نے پھر چکھیں میرا عذاب اور میرے ڈرانے والوں کا[2] ۔

سورہ ہود کی اور ان سورتوں کی جن کا ہم نے ذکر کیا تمام آیتوں پر غور کرنے کے بعد تین امور بحث طلب معلوم ہوتے ہیں۔

اول ۔ سدوم والوں نے کیوں حضرت لوط کا گھر گھیرا اور مہمانوں کو پکڑنا چاہا ۔

۱- وجاء اهل المدينة يستبشرون قال ان هٰولا ضيفى فلا تفضحون و اتقوالله ولا تخزون قالوا اولم ننهک عن العالمين قال هولاء بناتى ان كنتم فاعلين لعمرک انهم لفى سكرتهم يعمهون فاخذتهم الصيحة مشرقين فجعلنا عاليها سافلها وامطرنا عليهم حجارة من سجيل ان فى ذالک المتوسمين (سورة ۔ حجر)

۲- كذبت قوم لوط بالنذر انا ارسلنا عليهم حاصبا الا آل لوط نجينا هم بسحر نعمة من عندنا كذالک نجزى من شكر ولقد انذرهم بطشتنا فتماروا بالنذر ولقد راودوه عن ضيفه فطمسنا اعينهم فذوقوا عذابى و نذر (۵۴ ۔ القمر ۳۳ لغايته لغايت ۳۹)

دوم - هـؤلاء بنـاتی ان کـنـتم فـاعـلـین سے کیا مطلب ہے -

سوم - جو عذاب نازل ہوا وہ کیا تھا اور کیوں کر تھا اور سورہ قمر میں جو فطمسنا اعینہم ہے اس کا کیا مطلب ہے -

امر اول کی نسبت علمائے مفسرین کا یہ خیال ہے کہ وہ رسول جن کو انھوں نے فرشتے قرار دیا ہے نہایت خوب صورت مرد بن کر آئے تھے اور جب وہ حضرت لوط کے گھر میں آئے تو ان کی بیوی نے لوگوں سے جا کر کہہ دیا کہ ہمارے گھر میں ایسے خوب صورت لوگ آئے ہیں کہ ان سے زیادہ خوب صورت دیکھنے میں نہیں آئے ان سے زیادہ اچھے کپڑے پہنے کوئی نہیں ہے اور نہ زیادہ خوش بو والا ہے - یہ سن کر لوط کی قوم ان پر دوڑ پڑی اور خدا کے اس کلام سے کہ وہ بدکاری کیا کرتے تھے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا دوڑ پڑنا بدکاری کے لیے تھا -

مگر میرے نزدیک یہ تفسیر صحیح نہیں ہے اور نہ اس کی تفسیر کی بنیاد کسی معتبر روایت پر ہے بلکہ صرف یہودی روایت پر مبنی ہے - خدا کے اس کلام پر کہ ومن قبل یعملون السیات وہی ایک عمل خاص مراد لینا بھی صحیح نہیں ہے کیوں کہ وہ لوگ بہت سے اور بھی گناہ کرتے تھے لوٹ مار کرتے تھے اپنی مجلسوں میں خراب کام کرتے تھے جیسا کہ سورہ عنکبوت میں بیان ہوا ہے پس " ومن قبل یعملون السیات " کے عام معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ حضرت لوط کا گھر گھیر لینا اور شورہ پشتی کرنا ان کے لیے کوئی عجیب بات نہیں تھی کیوں کہ وہ پہلے ہی شریر و بد ذات و برے کام کرنے والے تھے -

اس باب میں ہم کو قیاسات و ظنیات پر گھر گھیر لینے کا

سبب بیان کرنا ضرور نہیں ہے کیوں کہ خود قرآن مجید میں اس کی تصریح موجود ہے سورۂ الحجر میں خدا نے فرمایا ہے کہ جب اُس شہر کے لوگ خوشی خوشی دوڑے آئے تو لوط نے کہا کہ یہ میرے مہمان ہیں ان کو فضیحت مت کرو تو شہر کے لوگوں نے کہا کہ ہم نے تجھ کو منع نہیں کیا تھا دنیا کے لوگوں سے[1] ۔

جس زمانہ میں حضرت لوط سدوم میں جا کر رہے ہیں اُس زمانہ میں طوائف‌الملوکی تھی ۔ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کا حاکم یا بادشاہ جدا جدا تھا ۔ سدوم کی بھی ایک چھوٹی سی سلطنت جدا تھی ۔ صاف صاف قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت لوط وہاں جا کر رہے تو وہاں کے لوگوں نے منع کر دیا تھا کہ تم اور لوگوں سے راہ و رسم و آمیزش نہ رکھنا پس جب‌کہ یہ اجنبی شخص حضرت لوط کے گھر میں آئے اُن لوگوں نے آ کر گھیر لیا کہ یہ اجنبی شخص کون ہیں اور اُن کو گرفتار کر لینا چاہا ۔ حضرت لوط نے کہا کہ یہ میرے مہمان ہیں ان کو مت پکڑو ۔ مفسرین کی عادت یہودیوں کی تقلید کرنے کی ہو گئی ہے ۔ اُنھوں نے قرآن مجید کے الفاظ اولم ننھک عن العالمین پر خیال نہیں کیا اور جو کچھ یہودیوں کی روایتوں میں تھا اُسی کو قرآن مجید کی تفسیر میں لکھ دیا ۔

دوسرے امر کو بھی مفسرین نے اپنے خیال کے موید سمجھا ہے ۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ حضرت لوط نے کہا کہ جس بد خیال سے تم میرے مہمانوں کو لینا چاہتے ہو اُن کے بدلے میں میری بیٹیاں لے لو اور جو کرنا چاہتے ہو اُن کے ساتھ کرو ۔ پھر مفسرین

۱۔ وجاء اهل المدينة يستبشرون قال ان هولاء ضيفی فلا تفضحون و اتقوا الله لا تخزون قالوا اولم ننهک عن العالمين ۔ (سورة الحجر)

کو اس تفسیر کے قرار دینے کے بعد مشکل پیش آئی ، بعضوں نے کہا کہ بناتی سے مراد حضرت لوط کی اصلی بیٹیاں ھیں۔ اس پر یہ مشکل پیش ھوئی کہ وہ کیوں کر ان کو ایسا کام کرنے کے لیے دیتے تھے - اس پر یہ قرار دیا کہ مطلب یہ تھا کہ بعد نکاح کے ان کے ساتھ جو چاھو کرو - بعضوں نے کہا کہ بناتی سے لوط کی امت کی بیٹیاں مراد ھیں کیوں کہ پیغمبر بمنزلہ باپ کے ھے اور اس کی امت کی عورتیں بمنزلہ اس کی بیٹیوں کے ھیں -

مگر یہ تفسیر محض غلط ھے جس کی بنا توریت کی متزلزل روایتوں پر مبنی ھے - حالاں کہ خود توریت سے معلوم ھوتا ھے کہ اس میں غلطی ھے - غالباً یہ بات صحیح ھے کہ حضرت لوط کی دو بیٹیاں تھیں - توریت میں بھی مذکور ھے کہ حضرت لوط نے ان لوگوں سے جنھوں نے گھر گھیر لیا تھا یہ کہا کہ - حال اینک مرا دو دختریست کہ مردے را ندانستہ اند تمنا اینکہ ایشاں را بہ شما بیروں آورم وبا ایشاں آنچہ در نظر شما پسند است بکنید - (کتاب پیدائش باب ۱۹ ورس ۸)

حالاں توریت ھی سے معلوم ھوتا ھے کہ حضرت لوط کی بیٹیوں کی شادی ھو چکی تھی اور ان کے شوھر موجود تھے چناں چہ توریت میں اسی قصہ کے بیان میں لکھا ھے کہ پس لوط بیروں رفتہ و بہ داماد ھائش کہ دخترانش را بنکاح آوردہ بودند متکلم شدہ گفت (کتاب پیدائش باب ۱۹ ورس ۱۴) اس سے ظاھر ھوتا ھے کہ جن عورتوں کو حضرت لوط نے بیٹیاں کہا وہ ان کی صلبی بیٹیاں نہ تھیں -

بنت اور بنوث کا لفظ عبری زبان میں عام عورتوں پر بولا جاتا ھے جیسا کہ کتاب امثال سلیمان باب ۳۱ ورس ۲۹ میں استعمال ھوا ھے - پس توریت میں جو لفظ بنوث اور قرآن مجید میں

لفظ بناتی آیا ہے اُس سے ایسی عورتیں مراد ہیں جو حضرت لوط کے ہاں کسی تعلق سے موجود تھیں اور کیا عجب ہے کہ لونڈیاں ہوں ۔ کیوں کہ حضرت ابراھیم اور حضرت لوط جب مصر سے واپس آئے ہیں تو متمول اور مالک مویشی و صاحب لونڈی و غلام کے تھے ۔

اس بات کی تردید کہ حضرت لوط نے اُن لوگوں سے جنھوں نے اُن کا گھر گھیر لیا تھا یہ کہا تھا کہ جس بد خیال سے تم میرے مہمانوں کو پکڑنا چاھتے ھو اُس کے بدلے میری بیٹیاں لے لو اور ان کے ساتھ جو چاھو سو کرو خود قرآن مجید سے ثابت ھوتی ہے ۔

اول یہ کہ قرآن سے پایا جاتا ہے کہ قوم لوط عورتوں کے ساتھ بھی اُسی قسم کی بد فعلی کرتی تھی جیسے کہ مردوں کے ساتھ کرتی تھی ۔ قرآن مجید میں آیا ہے کہ وہ لوگ مردوں کے پاس یعنی لونڈوں کے پاس جاتے تھے اور جوروؤں میں بھی جو طریقہ کہ اُن کے لیے خدا نے پیدا کیا ہے اُس کو بھی چھوڑ دیا تھا[1] ۔ یعنی خلاف فطرت انسانی اپنی جوروؤں کے ساتھ بھی بد فعلی کرتے تھے ۔ پس کیا حضرت لوط اُن عورتوں کو خواہ وہ اُن کی بیٹیاں ھوں یا اور کوئی اس لیے اُن کو حوالے کرتے تھے کہ جس طرح وہ مردوں کے ساتھ بد فعلی کرتے ھیں اُس کے بدلے اُن کے ساتھ بدفعلی کریں ۔ نعوذ باللہ حاشا وکلا ۔

دوسرے یہ کہ جب حضرت لوط نے کہا کہ یہ میری اچھی بیٹیاں تمھارے لیے ھیں ان کو ماخوذ کر لو اور میرے مہمانوں کو ذلیل مت کرو ۔ تو اُن لوگوں نے کہا کہ تو واقف ہے کہ ھم

۱- اتاتون الذکران من العالمین و تذرون ما خلق لکم ربکم من ازواجکم بل انتم قوم عادون ۔ (سورۂ شعرا)

کو تیری بیٹیوں میں یعنی اُن کے گرفتار کرنے کا کوئی حق نہیں ہے اور تو جانتا ہے جو ہم چاہتے ہیں[1] یعنی اُن اجنبی آدمیوں کو گرفتار کرنا چاہتے ہیں ۔ یہ کہنا کہ ہم کو تیری بیٹیوں میں حق نہیں ہے اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ان لوگوں میں حق ہے یعنی ان کے گرفتار کرنے کا حق ہے پس اگر وہ حق اُن کے ساتھ بدکاری کا سمجھا جاوے تو کیسی غلطی ہے بلکہ وہ حق صرف یہ تھا کہ جو اجنبی لوگ اُن کے شہر میں آ کر حضرت لوط کے گھر میں چھپے تھے اُن کو گرفتار کر لیں پس قرآن مجید سے جو امر ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت لوط اُن عورتوں کو بطور اوّل یا ضمانت کے اُن لوگوں کو حوالہ کرنا چاہتے تھے اور یہ درخواست کرتے تھے کہ ان کے مہمانوں کو گرفتار کر کے ذلیل نہ کریں ۔

اس بیان پر یہ سوال ہو سکتا ہے کہ اگر صرف بطور اوّل یعنی بطور ضمانت عورتوں کو سپرد کرنا منظور تھا تو " هن اطهر لكم " یعنی وہ پاکیزہ تر ہیں تمہارے لیے کیوں فرمایا ۔

مگر یہ فرمانا اُس بد خیال کا جو مفسرین نے قرار دیا ہے مثبت نہیں ہو سکتا اور نہ اُس مدعا کے برخلاف ہے جو ہم نے بیان کیا ہے ۔

اول سورہ الحجر میں هن اطهر لكم ۔ کے الفاظ نہیں ہیں ۔ اُس میں صرف یہ لفظ ہیں کہ ۔ هؤلاء بناتی ان کنتم فاعلین ۔

دوسرے یہ کہ ۔ هن اطهر لكم ۔ کے ہونے سے سورہ

۱۔ لقد علمت ما لنا فی بناتک من حق و انک تعلم ما نرید ۔ (سورۂ هود)

الحجر کی آیت کے مطلب پر کچھ زیادتی اور سورہ الحجر کی آیت میں اُن لفظوں کے نہ ہونے سے سورہ ہود کی آیت کے مطلب سے کچھ کمی لازم نہیں آتی - ہن اطہر - کی دو قرائتیں ہیں - مشہور قرأت میں اطہر کی رے کا پیش ہے اور دوسری قرأت میں اطہر کی رے کا زبر ہے یعنی نصب ہے جن لوگوں نے رے کا زبر پڑھا ہے وہ اس کو حال قرار دیتے ہیں اور از روئے قواعد نحوی کے اس کی دو ترکیبیں قرار دیتے ہیں ایک صورت میں لفظ ہن حال اور ذوالحال میں فصل واقع ہوتا ہے اور اُس کو نا جائز قرار دیتے ہیں اور دوسری صورت میں ہن فصل واقع نہیں ہوتا اور اُس پر کوئی اعتراض نحوی بھی وارد نہیں ہوتا صرف اتنی بات ہے کہ " اطہر " کی رے کو منصوب پڑھنا مشہور قرأت کے برخلاف ہے چناں چہ اس کی بحث تفسیر کبیر و تفسیر کشاف میں مندرج ہے - ہم دونوں تفسیروں کی عبارت نقل کرتے ہیں - جس دوسری ترکیب نحوی کا ہم نے ذکر کیا ہے وہ تفسیر کشاف میں مذکور ہے -

تفسیر کبیر کی عبارت حاشیہ پر ثبت ہے اُس میں لکھا ہے کہ عبدالملک بن مروان اور حسن اور عیسیٰ بن عمر سے روایت کرتے ہیں کہ اُن لوگوں نے " ہن اطہر لکم " فتح کے ساتھ پڑھا ہے حال کی بناء پر جیسا کہ ہم نے خدا کے اس قول میں ذکر کیا ہے - " و ھذا بعلی شیخا " مگر یہ کہ اکثر نحویوں نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ یہ غلطی ہے اور کہا ہے کہ اگر ھولاء بناتی ہن اطہر فتحہ کے ساتھ پڑھا جاوے تو خدا کے اس قول کے مشابہ ہوگا " و ھذا بعلی شیخا " مگر یہ کہ ہن کا لفظ بیچ میں آ گیا ہے اور یہ امر اس بات کو روکتا ہے کہ اطہر کو فتح سے پڑھا جاوے اس بحث کو لوگوں نے

بہت بڑھایا ہے[1] -

قفسیر کشاف کی عبارت حاشیہ پر ثبت ہے[2] اور اس کا مطلب یہ ہے کہ ابن مروان نے ھن اطہر لکم کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے - سیبویہ نے اس کو ضعیف لکھا ہے اور کہا ہے کہ ابن مروان اپنی غلطی میں جکڑ گیا اور عمرو بن علاء ہے کہ جس شخص نے ھن اطہر کو فتحہ کے ساتھ پڑھا وہ اپنی غلطی میں چار زانو ھو کر بیٹھا اور یہ اس لیے کہ اس کا فتحہ پڑھنا اس بناء پر ھوگا کہ حال قرار دیا جائے اور اس کا عامل معنی فعلیہ ھو جو ھولاء میں موجود ہے جیسے کہ خدا کے اس قول میں

۱- روی عن عبدالملک بن مروان و الحسن و عیسیٰ بن عمر انھم قروا ھن اطھر لکم بالنصب علی الحال کما ذکرنا فی قولہ تعالیٰ و ھذا بعلی شیخا اکثر النحویین اتفقوا انہ خطاء قالوا لوقرٔ ھولاء بناتی ھن اطھر (بالفتح) کان ھذا نظیر قولہ و ھذا بعلی شیخا الا ان کلمۃ ھن قد وقعت فی البین و ذالک یمنع من جعل اطھر (بالفتح) حالا وطو لوا فیہ - (تفسیر کبیر)

۲- قرأ این مروان ھن اطھر لکم بالنصب وضعفہ سیبویہ و قال احتبیٰ ابن مروان فی لحنہ و عن ابی عمر و بن العلاء من قراھن اطھر (بالفتح) فقد تربع فی لحنہ و ذالک لان انتصابہ علی ان یجعل حالا قد عمل فیھا مافی ھولاء من معنی الفعل کقولہ ھذا بعلی شیخا او ینصب ھولاء بفصل مضمرکانہ قبل خذوا ھولاء و بناتی بدل و یعمل ھذا المضمر فی الحال وھن فصل و ھذا لایجوز لان الفصل مختص بالوقوع بین جزی الجملۃ ولا یقع بین الحال و ذی الحال وقد خرج لہ وجہ لایکون ھن فیہ فصلا و ذالک ان یکون ھولاء مبتداء و بناتی ھن جملۃ فی موضع جنر المبتداء کقولک ھذا اخی ھو و یکون اطھر حالا - (تفسیر کشاف)

هـذا الـعـلـی شـیخـا یا یہ کہ ھولاء کو فـتحـہ دیا جاوے ۔ فعل مضمر سے گویا یوں کہا گیا ہے خـذوا ھـولاء اور نـبـاتی بدل ھو اور یہ مضمر حال میں عمل کرے ھـن بیچ میں فصل واقع ھوا ہے لیکن یہ جائز نہیں کیوں کہ فصل صرف جملہ کی دو خبروں میں واقع ھوتا ہے ۔ حال ذوالحال میں فصل نہیں واقع ھوتا ہے مگر اس کی ایک اور وجہ نکالی گئی ہے جس میں ھـن کو فصل ماننا نہیں پڑتا وہ یہ کہ ھـولاء مبتدا ھو اور نـبـاتی ھـن پورا جملہ موضع خبر میں ہے جیسے کہ تیرا قول ھـذا اخـی ھو اور اطـہـر حال قرار دیا جاوے ۔ (تفسیر کشاف)

غرض کہ اس میں کچھ کلام نہیں ہے کہ چند علمائے مفسرین و نحویین نے ھـن اطـہـر کو حال قرار دیا ہے ۔ میں بھی اس کا حال ھـونا تسلیم کرتا ھوں اور ھمیشہ قرأت مشہورہ کا اختیار کرنا پسند کرتا ھوں اس لیے اطـہـر کو مضموم پڑھتا ھوں اور بایں ھمہ حال ذوالحال قرار دیتا ھوں ۔

جملہ حالیہ پر سے واو حالیہ کا حذف کر دینا جائز ہے پس تقدیر کلام کی یہ ہے کہ ھـولاء بـنـاتی و ھـن اطـہـر لـکـم ۔ یعنی یہ میری بیٹیاں ھیں (اور) وہ پاکیزہ ھیں تمہارے لیے مبتداء و خبر کے درمیان میں جملہ معترضہ حالیہ واقع ھوا ہے اور یہ جائز ہے پوری ترتیب یوں ہے " ھـولاء بـنـاتی لـکـم وھـن اطـہـر " ۔

الفیہ ابن مالک میں لکھا ہے کہ جملہ حالیہ جب کہ فعل مضارع مثبت نہ ھو تو آتا ہے صرف واو کے ساتھ یـا صرف ضمیر کے ساتھ یا دونوں کے اور اس کا شعر یہ ہے ۔

و جـمـلـتـہ الـحـال سـوے مـا قـدمـا
بـواو او بـمـضـمـر او بـھـمـا

اور غایت التحقیق شرح کافیہ میں اس کی یہ مثال دی ہے ۔

کلمته فوه الی فی تقدیر کلام کی یه هے کامته و فوه الی فی مگر واؤ کو محذوف کر دیا هے ۔

پس جب که حضرت لوط اُن عورتوں کو بطور اول یعنی ضمانت کے ان لوگوں کو سپرد کرنا چاهتے تھے تو اُن کی عظمت ظاهر کرنے کو انهوں نے کہا که هن اطهر ۔ نه اس مقصد سے جس کا خیال مفسروں نے یہودیوں کی روایتوں کی تقلید سے کیا هے ۔

قرآن مجید میں متعدد ایسے قصے بیان هوئے هیں جو توریت میں بھی مذکور هیں ۔ مگر اُن قصوں کو قرآن مجید میں اس طرح بیان کیا هے جس سے وه غلطیاں جو توریت میں اُن قصوں کی نسبت هیں دور هو جاتی هیں ۔ پس اُن قصوں کی تفسیر میں هر جگه توریت کی اور یہودیوں کی روایتوں کی تقلید کرنا صریح غلطی هے ۔ بلکه سب سے مقدم قرآن مجید کے لفظوں پر غور کرنا چاهیے که اُن سے کیا مطلب حاصل هوتا هے اگر وهی مطلب حاصل هو جو توریت میں هے تو توریت یا یہودیوں کی روایت کو اس کی تفسیر میں بیان کرنا کچھ مضائقه نہیں هے مگر قرآن مجید کے الفاظ کو خواه مخواه توریت یا یہودیوں کی روایتوں کے مطابق پھیر پھار کر لانا صریح غلطی هے ۔

تیسرا امر جو عذاب نازل هونے سے متعلق هے قدرتی قانون پر مبنی هے اور جس طرح خدا تعالی اُن تمام واقعات کو جو قانون قدرت کے مطابق هوتے هیں انسانوں کے گناهوں کی طرف نسبت کیا کرتا هے اور جس کی وجه هم اپنی تفسیر میں بتا چکے هیں اسی طرح اس قدرتی واقع کو بھی سدوم کے لوگوں کے گناهوں سے منسوب کیا هے ۔

مفسرین نے جو لغو و بے هوده باتیں اپنی تفسیروں میں

لکھی ہیں کہ حضرت جبرئیل اس قطعہ زمین کو اپنے پروں پر اُٹھا کر آسمان تک لے گئے اور پہلے آسمان کے اس قدر قریب پہنچے کہ آسمان کے فرشتوں نے کتوں کے بھونکنے اور مرغوں کے اذان دینے کی آواز سنی - یہ محض غلط اور موضوع کہانیاں ہیں جن کی مذہب اسلام میں کچھ بھی اصلیت نہیں ہے -

سدوم و عموراہ و ادما و زبوئیم یہ چار شہر اور بقول استریبو کے چار یہ اور نو اور کل تیرہ شہر اُس مقام پر واقع تھے جہاں اب ڈوسی بمعنی سمندر مردہ جس کو عربی جغرافیہ دان بحر لوط کہتے ہیں واقع ہے - تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ بحر لوط کے گرد جو ملک کی حالت ہے اس سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ آتش خیز پہاڑوں کے لاوہ کے نشان اب بھی پائے جاتے ہیں اور اب بھی زلزلے کثرت سے آتے ہیں -

علاوہ اس کے سدوم کی گھاٹی میں نفطہ کی کان تھی اور جابجا نفطہ کے بہت بڑے بڑے غار تھے اور اسی وجہ سے اس شہر کا نام سدوم رکھا گیا تھا - (توریت کتاب پیدائش باب ۱۴ ورس ۱۰) میں لکھا ہے کہ '' سدوم از چاہ ہائے گل چرپ پر بود '' گل چرب جس کو لکھا ہے وہی نفطہ کا مادہ ہے جو پانی پر آ جاتا تھا اور مٹی میں بھی ملا ہوا ہوتا تھا اور یہ آتش گیر مادہ ہے جس میں حرارت سے دھواں اُٹھتا ہے اور کبھی کبھی زیادہ حرارت سے بھڑک جاتا ہے -

جغرافیہ کے محققوں نے لکھا ہے کہ '' اکثر اب بھی دیکھا جاتا ہے کہ ڈوسی یعنی بحر لوط سے دھوئیں کے بادل اُٹھتے ہیں اور اُس کے کنارہ پر نئے سوراخ پائے جاتے ہیں - آج تک بحر لوط میں ایک قسم کا مادہ جس کو انگریزی میں اسفالٹس کہتے ہیں اور نفطہ کی ایک قسم ہے پانی کے اوپر آ جاتا ہے -

غرض کہ اس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ جہاں سدوم و عموراہ وغیرہ شہر آباد تھے وہاں آتشیں پہاڑ تھے اور نفطہ یا گندھک کی کانیں کثرت سے تھیں ۔ آتشیں پہاڑ کے پھٹنے اور نفطہ یا گندھک کے مادہ میں آگ لگ جانے سے وہ تمام شہر غارت ہوئے اور زمین کی وہ موٹی تہ جو نفطہ کے مادہ سے بنی ہوئی تھی پھٹ گئی اور جل گئی اور تمام قطعہ زمین کا دھنس گیا اور پانی جو اُس تہ کے نیچے تھا اوپر آ گیا اور ایک بہت بڑی جھیل پیدا ہو گئی جو اب ڈوسی یا بحر لوط کے نام سے مشہور ہے اور دنیا میں عجائبات سے ہے ۔

قرآن مجید سے اس حادثہ کا واقع ہونا اس طرح پر معلوم ہوتا ہے کہ غالباً اُس شام کو جب کہ قوم لوط نے جا کر حضرت لوط کا گھر گھیرا وہ آتش خیز پہاڑ اور نفطہ یا گندھک کی کانیں جلنی شروع ہوئیں اور کچھ شبہ نہیں ہو سکتا کہ اُن کا دھؤاں تمام شہر میں گھٹ گیا ہوگا اور قوم لوط جو حضرت لوط کا گھر گھیرے ہوئے تھی شہر میں دھؤاں گھٹ جانے کے سبب کام یاب نہ ہو سکی ۔ اندھیرے کے سبب اُن کو کچھ نہ دکھلائی دیتا ہوگا اور دھوئیں کے سبب اُن کی آنکھیں بے کار ہو گئی ہوں گی جس کی نسبت خدا تعالیٰ نے سورہ قمر میں فرمایا ہے کہ بے شک اُنھوں نے دند مچائی لوط کے مہمانوں سے پھر بے کار کر دیں ہم نے اُن کی آنکھیں ۔

”ولقد راودوہ عن ضیفہ فطمسنا اعینھم“ ۔

مفسرین نے فطمسنا اعینھم کے معنی لکھے ہیں کہ اندھا کر دیا اور یہ امر قرار دیا ہے کہ ان فرشتوں نے جو حضرت لوط کے ہاں آئے ہوئے تھے ۔ بطور اعجاز کے اُن کو اندھا کر دیا اور ان کو حضرت لوط کے مکان کا دروازہ جس کو وہ توڑ کر اندر جانا چاہتے تھے نہیں ملا ۔

لیکن جو روایت کہ اُنھوں نے بیان کی ہے اس کی کوئی معتبر

سند نہیں ہے اور نہ اعجاز کی کچھ حاجت ہے جب کہ آتشیں پہاڑوں کا اور زمین کی گندھک و نفطہ میں آتش پیدا ہوئی اُس کے دھوئیں کے گھٹ جانے سے اُن کی آنکھیں بے کار ہو گئیں اور دکھائی دینے سے رہ گیا۔ اُسی کی نسبت خدا نے فرمایا کہ فطمسنا اعینہم۔

یہ حال دیکھ کر اُن تینوں شخصوں نے جو حضرت لوط کے ہاں آئے ہوئے تھے سمجھا کہ آتش فشانی زیادہ ہونے والی ہے اور حضرت لوط کو صلاح دی کہ یہاں سے بھاگ چلو چناں چہ سورہ ہود میں آیا ہے کہ اُن لوگوں نے کہا اے لوط ہم تیرے خدا کے بھیجے ہیں سو تو اپنے اہل کو لے کر رات کے حصہ میں نکل جا اور تم میں سے کوئی مڑ کر نہ دیکھے مگر تیری بیوی کہ اُس کو بھی وہی پہنچنے والا ہے جو اوروں کو پہنچا ہے بے شبہ اُن کا وعدہ صبح کا وقت ہے کیا صبح قریب نہیں[1]۔

اور سورۂ حجر میں یہ ہے کہ اپنے اہل کو لے نکل جا اور اُن کے پیچھے چلا جا اور تم میں سے کوئی مڑ کر نہ دیکھے اور چلے جاؤ جہاں تم کو حکم دیا جاتا ہے۔ ہم نے اُس کی طرف یہ طے کر دیا کہ اُن کا پیچھا صبح کے وقت کٹ جائے گا[2]۔

ولا یلتفت منکم احد۔ یعنی کوئی مڑ کر نہ دیکھے اس سے غرض وہاں سے جلد چلے جانے کی تاکید ہے۔ جیسے کہ خدا نے

۱۔ قالو یا لوط انا رسل ربک لن یصلوا الیک فاسر باھلک بقطع من الیل ولا یلتفت منکم احد الا امراتک انہ مصیبہا ما اصابھم ان موعدھم الصبح الیس الصبح بقریب۔ (سورۂ ہود)

۲۔ فاسر باھلک بقطع من اللیل واتبع ادبارھم ولا یلتفت منکم احد و امضوا حیث تومرون و قضینا الیہ ذالک الامر ان دابر ھولاء مقطوع مصبحین۔ (سورۂ حجر)

حضرت آدم کی نسبت کہا تھا ولا تقربا ھذہ الشجرۃ ۔ یعنی پاس نہ جانا اس درخت کے مگر حضرت لوط کی بیوی جو ایمان والوں میں نہ تھی اُس نے اس نصیحت کو نہیں مانا اور اُس عذاب میں مبتلا ھو کر مرنے والوں کے ساتھ مر گئی ۔

جن لوگوں نے یہ سمجھا ھے کہ حضرت لوط کی بیوی بھی ساتھ بھاگی تھی مگر اُس نے بھاگتے میں جو مڑ کر دیکھا تو نمک کی ھو گئی یا مڑ کر دیکھنے کے سبب مر گئی اُس کی کچھ اصل نہیں ھے اور نہ قرآن مجید سے یہ بات پائی جاتی ھے ۔

حضرت ابراہیم اور کعبہ کی تعمیر

کعبہ در حقیقت نماز پڑھنے کی جگہ یعنی مسجد ھے ۔ جس کو حضرت ابراہیم نے بنایا تھا ۔ خود خدا نے اس کو مسجد کہا ھے ۔ جہاں فرمایا ھے ”ان المشرکین نجس فلا یقربو المسجد الحرام“ اور جہاں فرمایا ھے ”لقد صدق اللہ رسولہ الرویا بالحق لتدخلن المسجد الحرام انشاء اللہ“ ابراہیم اور اس کی تمام اولاد ایسے مقام کو بیت اللہ کہا کرتے تھے اور اس لیے کعبہ کو بھی بیت اللہ کہتے ھیں ۔

انسان کی ایک جبلی عادت ھے کہ ایک ایسے وجود کے لیے جو نہ دکھائی دیتا ھے ، نہ چھوا جاتا ھے اور نہ سمجھ میں آتا ھے اور بہ جز اس کے کہ ھے ، اور کوئی خیال اس کی نسبت قائم نہیں ہو سکتا ۔ کوئی نہ کوئی محسوس نشان قائم کر لیتا ھے اور اس محسوس نشان کے ذریعہ سے اپنا عجز اور نیاز اس غیر محسوس اور بیچون و بیچگوں ذات کے سامنے ادا کرتا ھے ۔ قدیم زمانہ کے لوگوں کو بالطبع ایسے نشان کے قائم کرنے کی زیادہ تر رغبت ھوتی تھی اور یہی بات ھے کہ جس کے سبب سے ھم قدیم سے قدیم قوموں کا اور وحشی سے وحشی لوگوں کا جب حال تحقیق کرتے ھیں تو ان میں بت پرستی کے یعنی ایک شے محسوس کے پوجنے کے آثار پائے جاتے ھیں ۔ معلوم ھوتا ھے کہ یہ خیال حضرت ابراہیم کے زمانہ تک معدوم نہیں ھوا تھا اور اسی سبب سے حضرت ابراہیم بھی خدا کی عبادت کے لیے ایک بن گھڑا پتھر کھڑا کر لیتے تھے اور یہ

رسم حضرت موسیٰ کے وقت تک قائم تھی ۔ اس فعل میں جو انبیاء نے کیا اور اس فعل میں جو بت پرست کرتے تھے۔ فرق یہ ہے کہ بت پرست غیر خدا کے نام محسوس شے قائم کرکے پرستش کرتے تھے اور اس لیے وہ خدا کی پرستش نہ تھی بلکہ اس غیر خدا کی پرستش تھی جس کے نام سے وہ محسوس شے قائم تھی ۔ انبیاء نے جو محسوس شے قائم کی وہ خدا ہی کے نام پر قائم کی اور خدا ہی کی پرستش کی نہ کسی غیر خدا کی ۔ مگر مبارکی ہو اس کو (یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو) جس نے ان تمام نشانیوں کو مٹا دیا اور اس بے نشان کی عبادت کو بغیر کسی نشان کے قائم کیا اور بحر و بر اور پہاڑ اور گھر اور مسجد سب یکساں خدا کی عبادت ہونا سکھا دیا ۔ کوئی سمت خدا کی عبادت کے لیے مخصوص نہیں کی ۔ یہ سمجھنا کہ کعبہ سمت خدا کی عبادت کے لیے مخصوص ہے محض غلطی ہے اور بانی اسلام کی ہدایت کے خلاف وہ سمت عبادت کے لیے مخصوص ہے محض غلطی ہے اور بانی اسلام کی ہدایت کے خلاف وہ سمت عبادت کے لیے مخصوص نہیں ہے ۔ بلکہ ایک تمیز اور تفرقہ کے لیے مخصوص ہے ، جس کو ہم آگے بیان کریں گے ۔

کتاب پیدائش باب ۱۲ ورس ۷ میں ہے کہ ”تب خداوند نے ابراہیم کو دکھلائی دے کر کہا یہی ملک میں تیری نسل کو دوں گا اور اس نے وہاں خداوند کے لیے جو اس پر ظاہر ہوا ایک مذبح بنایا اور اسی باب کی آٹھویں آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ پھر وہاں سے حضرت ابراہیم نے کوچ کیا اور آگے جا کر پھر ایک مذبح بنایا اور خدا کے نام سے یعنی خدا کے گھر کے نام سے اس کو موسوم کیا ۔

اسی کتاب کے تیرھویں باب کی اٹھارویں آیت میں ہے کہ بلوطستان ممری میں ابراہیم جا رہا تھا اور وہاں خداوند کے لیے ایک مذبح بنایا ۔

ان تینوں آیتوں سے ثابت ہے کہ خدا کے لیے مذبح تعمیر کرنا اور خدا کے نام سے اس کو پکارنا اور وہاں خدا کے نام پر قربانی کرنا حضرت ابراہیم کا طریقہ تھا۔

یہ طریقہ ان کی اولاد میں بھی جاری تھا۔ چناں چہ کتاب پیدائش باب ۲۶ ورس ۲۵ میں لکھا ہے کہ " بیر شبع میں اسحاق پسر ابراہیم کو خدا دکھائی دیا اور اس نے وہاں مذبح بنایا اور خدا کے نام سے اس کو موسوم کیا۔

اب ہم کو یہ بتانا رہا کہ یہ مذبح کس طرح بنایا جاتا تھا اس کی تفصیل بھی توریت مقدس میں موجود ہے۔

کتاب خروج باب ۲۰ ورس ۲۵ میں لکھا ہے کہ " اگر تو میرے لیے پتھر کا مذبح بنا دے تو تراشے ہوئے پتھر کا مت بنائیو کیوں کہ اگر تو اسے اوزار لگاوے گا تو اسے ناپاک کرے گا۔

اور اسی کتاب کے باب ۲۴ ورس ۴ میں لکھا ہے کہ " اور موسیٰ نے خداوند کی ساری باتیں لکھیں اور صبح کو سویرے اٹھا اور پہاڑ کے تلے ایک مذبح بنایا اور اسرائیل کے بارہ سبطوں کے عدد کے موافق بارہ ستون بنائے گئے۔

اور کتاب پیدائش باب ۲۸ ورس ۸؛ ۱۹، ۲۲ میں لکھا ہے کہ یعقوب صبح سویرے اٹھا اور اس پتھر کو جسے اس نے اپنا تکیہ کیا تھا لے کے ستون کی مانند کھڑا کیا اور اس کے سر پر تیل ڈالا اور اس کا نام بیت ایل (یعنی بیت اللہ خدا کا گھر) رکھا اور کہا کہ یہ پتھر جو میں نے ستون کی مانند کھڑا کیا خدا کا گھر یعنی بیت اللہ ہوگا۔

جب کہ حضرت ابراہیم نے اپنی بیوی سارہ کے کہنے سے اپنی دوسری بیوی حاجرہ کو مع حضرت اسماعیل اپنے بیٹے کے جو حاجرہ بیوی کے پیٹ سے تھے نکال دیا اور وہ اس کوھستان مکہ

میں آ کر ٹھہرے تو حضرت ابراهیم نے ان کی عبادت کے لیے اسی طرح جیسا کہ وہ کیا کرتے تھے ایک پتھر کھڑا کرکے مذبح بنایا ہوگا جو اب هم مسلمانوں میں حجر اسود اور یمین الرحمان کے نام سے مشہور ہے ۔ اس حجر اسود کا ذکر قرآن مجید میں نہیں ہے ۔ کیوں کہ وہ ایک جزو کعبہ کا ہو گیا تھا ۔ مگر وہ ایسی شے ہے جو اب تک موجود ہے ۔ جہاں اس طرح پر مذبح بنایا جاتا تھا وہاں کوئی عمارت بنا دینے کا بھی دستور تھا ۔ جس کا اشارہ توریت کی اُن آیتوں سے بھی پایا جاتا ہے جو ہم نے اوپر بیان کی ہیں ۔ پس بعد اس مذبح بنانے کے حضرت ابراهیم نے وہاں کعبہ بنایا ۔ جو اب بیت اللہ کہلاتا ہے اور اسی کے ایک کونے میں پتھر لگا دیا ۔ اس آیت میں اسی تعمیر کا ذکر ہے ۔

اگرچہ ڈایوڈورس یونانی مؤرخ کی تاریخ میں کعبہ کا ذکر ہے اور اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ اس کے اعلیٰ درجہ کے تقدس کی تمام عرب تعظیم کرتے تھے مگر بعض نا سمجھ آدمی یہ اعتراض کرتے ہیں کہ توریت میں کہیں اس مقام پر حضرت ابراهیم کے مذبح بنانے یا کعبہ کی تعمیر کرنے کا ذکر نہیں ہے ۔ مگر ان کا یہ اعتراض محض لغو اور بے بنیاد ہے توریت میں بہت سے ایسے واقعات ہیں جو مذکرر نہیں ۔ حالاں کہ اُن کا تاریخی ثبوت موجود ہے اور توریت میں ذکر نہ ہونے سے اس کا عدم وقوع لازم نہیں آتا ۔ اصل یہ ہے کہ توریت اور جو کتابیں اس سے متعلق ہیں وہ خاص بنی اسرائیل کے حالات میں لکھی گئی ہیں ۔ اس لیے ان میں بنی اسماعیل کا وہاں تک کا ذکر ہے جہاں تک کہ بنی اسماعیل اور اسرائیل کے مشترک حالات رہے ہیں اور جہاں سے بنی اسماعیل کے حالات علیحدہ ہو گئے ہیں وہاں سے بنی اسماعیل کا ذکر اُن کتابوں میں نہیں ہے ۔ اللہ ماشاء اللہ کہیں

کہیں کسی سبب اور کسی تعلق سے آ جاتا ہے ۔ مکہ میں بنی اسماعیل کے لیے حضرت ابراہیم کا مذبح یا کعبہ بنانا بنی اسرائیل سے کچھ تعلق نہیں رکھتا تھا اور ان کتابوں میں اس کا ذکر نہ ہونے کی یہ کافی وجہ ہے ۔ مگر ہر زمانہ کے عرب کی متواتر روایتوں سے جن سے کسی امر کے ثبوت میں کچھ شبہ نہیں رہتا اور نیز غیر قوموں کی کتابوں سے اور نیز قدیم جغرافیہ سے اور خود مکہ کے گرد کی قدیم ویران بستیوں سے جو حضرت اسماعیل کے بیٹوں کے نام پر آباد ہوئی تھیں ، کچھ شبہ نہیں رہتا ۔

حضرت ابراہیم نے جب کعبہ بنایا تو صرف اس کی دیواریں بنائی تھیں ۔ چھت اس پر نہیں تھی ۔ بنی جرہم کے زمانے میں پہاڑی نالہ کے سبب سے حضرت ابراہیم کا بنایا ہوا کعبہ ڈھے گیا ۔ تب بنی جرہم نے اس کو تعمیر کیا ۔ پھر وہ عمالیق کے زمانہ میں جو ایک قبیلہ بنی حمیر کا تھا ڈھے گا ۔ تب عمالیق نے اس کو بنایا ، پھر اس میں کچھ نقصان آ گیا تو قصی نے اس کو تعمیر کیا ۔ پھر آگ لگنے کے سبب کعبہ جل گیا اور قریش نے اس کو تعمیر کیا ۔ اس زمانے میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہو چکے تھے اور آپ کی عمر تخمیناً بارہ چودہ برس کی تھی ۔ یزید کے زمانہ میں جب کعبہ پر فوج کشی ہوئی تو پھر کعبہ جل گیا اور عبداللہ بن زبیر نے اس کو تعمیر کیا ۔ مگر حجاج بن یوسف نے عبدالملک بن مروان کے وقت میں عبداللہ بن زبیر کی عمارت کو ڈھا ڈالا اور از سر نو اس کو اسی طرح پر بنا دیا ۔ جیسا کہ قریش کے زمانہ میں تھا اور اب جو عمارت موجود ہے وہ حجاج بن یوسف کی بنائی ہوئی ہے مگر اس کے گرد کی جو عمارتیں ہیں اور جو عمارات حرم کعبہ کہلاتی ہیں ان کو بہت سے بادشاہوں نے بنایا ہے اور وہ نہایت عالیشان عمارتیں ہیں ۔

حضرت ابراھیم اور مشرکوں کے لیے دعائے مغفرت

قرآن مجید میں حضرت ابراھیم کی دعائے مغفرت کا چار جگہ ذکر ہے :

(۱) ایک سورہ ابراھیم میں ۔ جہاں حضرت ابراھیم نے مکہ کے لیے اور حضرت اسماعیل و حضرت اسحاق کے لیے برکت کی دعا مانگی ہے ۔ اسی دعا کے ساتھ یہ بھی دعا کی ہے کہ " ربنا اغفرلی ولوالدی و للمومنین یوم یقوم الحساب " یعنی اے ہمارے پروردگار بخش دے مجھ کو اور میرے والد اور والدہ کو اور سب ایمان والوں کو جس دن کہ قائم ہو حساب ۔

(۲) دوسرا مقام سورہ مریم میں ہے جہاں حضرت ابراھیم نے اپنے چچا آذر کو باپ کہہ کر بت پرستی چھوڑنے اور خدا پر ایمان لانے کی نصیحت کی ہے ۔ مگر اُن کے چچا نے نہ مانا اور خفا ہو کر کہا اگر تو بس نہیں کرتا تو میں تجھ کو سنگ سار کروں گا اور تو میرے پاس سے چلا جا اس وقت حضرت ابراھیم نے کہا " سلام علیک فاستغفرلک ربی " چناں چہ اس کے بعد حضرت ابراھیم اور کالدانیاں سے جو اُن کا وطن تھا جلا وطن ہو گئے ۔ یہ وہ آیت ہے جس میں حضرت ابراھیم نے اپنے چچا آذر کے حق میں دعائے مغفرت کا وعدہ کیا تھا ۔

(۳) تیسرا مقام سورہ شعرا میں ہے جہاں حضرت ابراھیم نے

اپنے چچا کو باپ کہہ کر اور نیز اُس کو گمراہ قرار دے کر اُس کے لیے دعائے مغفرت کی اور کہا ”واغفر لا بِی انہ کان من الضالین“۔

(۴) چوتھا مقام سورہ ممتحنہ میں ھے جہاں خدا تعالیٰ نے حضرت ابراھیم کی بت پرستی کے متعلق دعائے مغفرت کی پیروی نہ کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ ”الا قول ابراھیم لابیہ لاستغفرن لک وما املک لک من اللہ من شئی“ یعنی حضرت ابراھیم کے اس قول کی پیروی نہیں چاھیے جو اُنھوں نے اپنے چچا سے اُن کی مغفرت کی دعا کی نسبت کہا تھا اور اُسی وعدہ کے مطابق اُنھوں نے دعا بھی کی تھی -

سورہ ممتحنہ کی آیت سے بطور دلالت النص ظاھر ھوتا ھے کہ مشرک کے لیے دعائے مغفرت کرنی نہیں چاھیے اور سورہ توبہ کی آیت میں بہ نص صریح بیان ھوا ھے کہ مشرکین کے لیے گو وہ کیسے ھی قریب کے قرابت مند ھوں دعائے مغفرت نہ کی جاوے - چناں چہ فرمایا ما کان للنبی والذین آمنوا ان یستغفروا للمشرکین و لو کان اولی قربٰی منن بعد ماتبین لھم انھم اصحاب الجحیم یعنی نبی کو اور مومنین کو واجب نہیں ھے کہ وہ مشرکوں کے لیے بخشش کی دعا مانگیں چاھے وہ اُن کے قریبی رشتہ دار ھی ھوں - بعد اس کے کہ اُن پر ظاھر ھو گیا کہ وہ اھل دوزخ ھیں -

حضرت ابراھیم نے اپنے چچا کے لیے اس لیے دعائے مغفرت کی تھی کہ اُن کو اپنے چچا کے ایمان لانے کی توقع تھی مگر جب اُن کو یقین ھو گیا کہ وہ ایمان نہیں لانے کا - تو اُنھوں نے اُس سے اپنی بیزاری ظاھر کی جیسے کہ اسی آیت میں بیان ھوا ھے کہ ”فلما تبین لہ انہ عدو اللہ تبرا منہ ان ابراھیم لاواہ حلیم“۔

بعض مخالفین اسلام نے ان آیتوں سے اسلام پر بے رحمی کا الزام لگایا ہے کہ اسلام نے نہایت بےرحمی سے مشرک والدین کے لیے بھی دعائے مغفرت کی ممانعت کی ہے مگر یہ اُن کی غلطی ہے ۔ اس لیے کہ اسلام نے جس قدر والدین کے ادب کی گو وہ مشرک ھی کیوں نہ ھوں اور مشرکوں کے ساتھ بھی صلہ رحم کی تاکید فرمائی ہے ۔ جس کی بنا محض رحم اور انسانیت پر ہے شاید اور کسی مذھب میں نہیں ہے مگر مغفرت یا عدم مغفرت کو رحم یا عدم رحم سے کچھ تعلق نہیں ہے اس لیے کہ مغفرت کا مدار صرف ایمان پر ہے کہ اگر کوئی بیٹا اپنے باپ پر ایمان نہیں لایا کیسا ھی رنج و غم و افسوس و رحم کیا کرے اور دعا مانگا کرے اُس سے کیا ھوتا ہے اُس کی مغفرت نہیں ھو سکتی اور جب کہ یہ بات محقق قرار پا چکی کہ مشرکین کی مغفرت نہیں ھونے کی ۔ تو انبیاء کو اور نیز تمام مسلمانوں کو نہیں چاھیے کہ مشرکین کے لیے وہ زندہ ھوں یا مردہ دعائے مغفرت کریں ۔ کیوں کہ ایسا کرنے میں اس بات کا شبہ ھوتا ہے کہ اُن کو خدا کے اس وعدہ پر کہ مشرکین کو نجات نہیں دینے کا پورا پورا یقین نہیں ہے ۔ باقی رھی مشرکین کے لیے دعائے خیر کہ وہ ایمان لے آویں اور کفر و شرک سے نجات پاویں جو اُن کے ساتھ اصلی محبت و رحم ہے اُس کی ممانعت نہیں ہے خود انبیاء نے ایسا کیا ہے اور ھر ایک مسلمان کو ایسا کرنا چاھیے بلکہ مشرکین سے جو زیادہ تر قرابت قریبہ رکھتا ھو اُن کے لیے اور زیادہ اور دلی اضطرار اور رنج و غم سے ایسی دعا کرنی لازم ہے ۔

حضرت یوسف کا قصہ

(حقیقت کی روشنی میں)

قرآن کریم نے حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کو
"احسن القصص" فرمایا ہے اور مفسرین نے اس پر
ایسے عجیب و غریب حاشیے چڑھائے ہیں جن کی انتہا
نہیں - سرسید نے اس واقعہ کو نہایت سنجیدگی کے ساتھ
لکھا ہے اور بڑی تحقیق کے ساتھ اس پر قلم اٹھایا ہے -
حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں جو جو اہم
آیات قرآنی آئی‌ہیں سب کی الگ الگ تشریح اور تفصیل
اپنے مخصوص نقطہ نگاہ سے کی ہے نیچے وہ سارا بیان درج
کیا جاتا ہے جو سرسید نے اس سلسلے میں تحریر کیا ہے
ناظرین سے امید ہے کہ سرسید کی اس تحقیق اور
تلاش کو بہت دل چسپ پائیں گے -

(محمد اسماعیل پانی پتی)

ولقد ھمت بہ و ھم بھا - کی نسبت مفسرین نے بہت
لمبی لمبی دور ازکار بحثیں کی ہیں - کہیں اس پر بحث ہے کہ ھم
بھا کے لفظ سے حضرت یوسف سے گناہ صادر ہوا یا نہیں - کہیں
اس پر بحث ہے کہ رویت برہان سے کیا مراد ، پھر ایک روایت
کہی جاتی ہے کہ حضرت یعقوب کی صورت دانتوں سے انگلی کاٹتے
ہوئے دکھائی دی ایک روایت بتائی جاتی ہے کہ مکان کی چھت پر

کچھ الفاظ لکھے ہوئے دکھ ئی دیے اسی طرح کی بہت سی بے فائدہ اور بے ہودہ باتیں تفسیروں میں لکھی ہیں اور ان پر جرح ، قدح و تعدیل و تصویب کی ہے مگر قرآن مجید کا مطلب بہت صاف ہے البتہ کسی قدر قواعد نحو کے مطابق اس پر بحث ہو سکتی ہے اگرچہ ہمارے نزدیک اخفش و سیبویہ یا بصرئین و کوفیین کے مستنبطہ قواعد نحو سے قرآن مجید کو جکڑنا اور اس پر جرح محض غلط ناواجب ہے کیوں کہ کتنا ہی استغرا کیا جاوے کسی زبان کے تمام محاورات و طرز ادا اور ایڈیم کا استغراء نہیں ہو سکتا لیکن ہم اول اصلی و صاف معنی قرآن مجید کے بیان کر کے بقدر ضرورت مسئلہ نحوی پر بھی بحث کریں گے ۔

پہلی آیت میں خدا نے فرمایا تھا کہ اس عورت نے مکان کے دروازے بند کر دیے اور یوسف سے کہا کہ آؤ میں تیرے لیے ہوں یعنی حضرت یوسف سے فحش کی خواہش کی حضرت یوسف نے کہا خدا کی پناہ یعنی انکار کیا اور یہ دلیل پیش کی کہ جس نے مجھ کو گھر میں رکھا ہے یعنی اس عورت کا شوہر وہ میرا رب یعنی مربی ہے اور مجھ کو عزت سے رکھا ہے اور ظلم کرنے والے فلاح نہیں پاتے ۔

اب دوسری آیت میں جو لفظ و ھم بھا کا ہے اس کے یہ معنی کہ حضرت یوسف نے اس عورت سے فحش کا قصد کیا یا ان کے دل میں اس کا ارادہ آیا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتے کیوں کہ پہلی آیت میں صاف اس کام سے انکار بطور نص قطعی بیان ہو چکا ہے اور اس لیے ضرور ہے کہ ھم بھا کے معنی عدم وقوع "ھم" کے ہوں پس 'ھم بھا ، لولا ' کی جزا ہے اور جزا بسبب اہم اور مقصود بالذات ہونے کے شرط پر مقدم ہو گئی ہے ۔ اس لیے دوسری آیت کے صاف معنی جو نص قرآنی سے پائے جاتے ہیں یہ

ہیں کہ ’’اگر یوسف نے دلیل اپنے رب کی نہ دیکھی ہوتی یعنی نہ سمجھی ہوتی تو یوسف نے اس کے ساتھ قصد کیا ہوتا‘‘ پس قرآن مجید سے فحش کا قصد کرنا یا اس کا ارادہ دل میں آنا حضرت یوسف کی نسبت بیان نہیں ہوا ہے ۔

رویت کا لفظ آنکھ سے ہی دیکھنے پر مخصوص نہیں ہے بلکہ دل میں جو بات یقین اور استحکام سے آ جاتی ہے اس پر بھی رویت کا اطلاق ہوتا ہے ۔ اس آیت میں جو لفظ ’را‘ کا ہے اس کی نسبت بھی تفسیر کبیر میں آنکھ سے دیکھنے کے معنی نہیں بیان ہوئے ہیں بلکہ اس رویت قلبی کے معنی لیے ہیں جو انبیاء و صلحا کو منکرات پر اقدام کرنے سے روکتی ہے ۔

فا المراد با لروئة حصول تلک الاخلاق (یعنی تطہیر نفوس الانبیاء و تذکیر الا حوال الرادعة لھم عن الا قدام علی المنکرات ۔ (تفسیر کبیر)

فالھم عبادة عن جواذب الطبیعه و روئة البرھان عبارة عن جواذب العبوریة ۔ (تفسیر کبیر)

اب یہ بات غور طلب ہے کہ ’’ برھان ربہ ‘‘ سے کیا مراد ہے ۔ تعجب ہے کہ تمام مفسرین نے پہلی آیت میں جو لفظ ’’ ربی ‘‘ ہے اس سے وہ شخص مراد لیا ہے جس نے حضرت یوسف کو خرید کر اپنے گھر میں رکھا تھا اور پرورش کیا تھا اور دوسری آیت میں جو لفظ ’’ ربہ ‘‘ ہے اس سے خدا مراد لیا ہے جس کے لیے کوئی قرینہ نہیں ہے بلکہ بلحاظ سباق پہلی آیت کے دوسری آیت میں بھی وہی شخص مراد لیا ہے جو پہلی آیت میں تھا ۔

یعنی اب معنی آیت کے اور لفظ ’’ برھان ‘‘ کے بالکل صاف ہیں اگر یوسف نے یہ دلیل نہ سمجھی ہوتی کہ جس نے مجھ کو اپنے گھر میں رکھا ہے اور میرا رب یعنی مربی یا پرورش کرنے والا

ہے اُس کی عورت کے ساتھ فحش ظلم ہے اور ظلم کرنے والے فلاح نہیں پاتے تو یوسف نے اس کے ساتھ قصد کیا ہوتا ۔

اب رہی یہ بحث کہ ''لولا'' جب بطور شرط کے واقع ہو تو جزا کا اس پر مقدم کرنا بموجب قواعد مستنطبہ نحو جائز ہے یا نہیں اس کی نسبت تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ :

لا نسلم ان یوسف علیہ السلام ھم بھا والدلیل علیہ انہ تعالیٰ قال و ھم بھا لولا ان راء برھان ربہ و جواب لولا ھہنا مقدم و ھو کما یقال ۔ قد کنت من الھالکین لولا ان فلانا خلصک ۔ (تفسیر کبیر)

ہم اس بات کو نہیں مانتے کہ حضرت یوسف نے اُس عورت کے ساتھ قصد کیا تھا کیوں کہ خدا نے کہا ہے کہ اس کے ساتھ قصد کیا ہوتا اگر نہ دیکھتا دلیل اپنے پروردگار کی ۔ اس جگہ لولا مقدم ہے اور اس کی ایسی مثال ہے کہ کوئی کہے کہ تو ہوتا مرے ہوؤں میں سے اگر نہ فلاں شخص تجھ کو بچاتا ۔

اس پر زجاج کا اعتراض نقل کیا ہے اس کا اعتراض یہ ہے کہ ' لولا ' کا جواب پہلے لانا شاذ ہے اور کلام فصیح میں موجود نہیں ہے ۔

اس کا جواب اُنھوں نے یہ دیا ہے کہ جواب ' لولا ' کا مؤخر لانا بہتر ہے مگر مقدم لانا نا جائز نہیں ہے اور جواب ' لولا ' کے مقدم آنے پر سورہ قصص کی اس آیت سے سند لی ہے کہ :

و اصبح فواد موسیٰ فارغا ان کادت لتبدی بہ لولا ان ربطنا علیٰ قلبھا لتکون من المؤمنین ۔ (سورہ قصص)

موسیٰ کی ماں کا دل بے صبر ہو گیا ، قریب تھا کہ [illegible] ظاہر کر دیوے اگر ہم نے بندش رکھی ہوتی اس کے دل [illegible]

اس پر زجاج کا دوسرا اعتراض نقل کیا ہے کہ ' لولا ' کا جواب بغیر لام کے نہیں آتا ۔ اگر ' ہم بہا ، لولا ' کا جواب ہوتا تو یوں کہا جاتا ۔ ولقد ہمت بہ ولہم بہا لولا ان راء برہان ربہ' ۔

اس کا جواب یہ دیا ہے کہ ' لولا ' کا جواب لام کے ساتھ آتا ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ بغیر لام کے لانا جائز نہیں ہے ۔

اس کے بعد تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ ' لولا ' جواب چاہتا ہے اور یہ یعنی ' وہم بہا ' اس کا جواب ہو سکتا ہے پھر ضرور ہے کہ وہ اس کا جواب ہو ۔ یہ بات کہنی نہیں چاہیے کہ ہم اس کے جواب کو مضمر مانیں گے اور بہت جگہ قرآن میں جواب کو چھوڑ دیا جاتا ہے کیوں کہ ہم کہتے ہیں کہ اس بات میں کہ قرآن میں جواب چھوڑ دیا گیا ہے کچھ جھگڑا نہیں ہے مگر اصلی بات یہ ہے کہ جواب کا محذوف ہونا نہیں چاہیے ۔ صرف اسی جگہ اس کا حذف کرنا یا چھوڑنا بہتر ہوتا ہے جب کہ لفظ میں ایسی دلالت پائی جاوے کہ اس سے وہ جواب محذوف متعین ہو جاوے اور اگر اس جگہ ہم جواب کو محذوف مانیں تو لفظ میں کوئی دلالت ایسی نہیں ہے جو جواب محذوف کو متعین کر دے اور اس جگہ بہت سے جواب مضمر ہو سکتے ہیں اور ایک کو باقیوں سے بہتر سمجھنے کی دلیل نہیں ہے ۔ انتہٰی ۔

صاحب تفسیر کبیر نے اس بات کی کوئی مثال نہیں دی کہ ' لولا ' کا جواب بغیر لام کے بھی آیا ہے مگر قرآن مجید میں متعدد اس کی مثالیں ہیں ۔ سورۂ نور میں ہے ۔ ولولا فضل اللہ علیکم و رحمتہ ما زکی منکم من احد ابدا (آیت ۲۱) اور سورہ واقعہ میں ہے '' فلولا ان کنتم غیر مدینین ترجعونہا

ان کنتم صدقین (آیت ۸۵ و ۸۶) اور اس شعر زمانه جاهلیت میں بھی جواب ' لولا ' کا بغیر لام کے آیا ہے اور وہ شعر یه ہے ۔

و لولا اننی رحیل حرام
هصرت قرونها ولثمت فاها

اور فرزدق نے حضرت امام زین العابدین علیه السلام کی شان میں کہا ہے ۔

ما قال لاقط الا فی تشهد
لولا التشهد کانت لاوه نعم

اگرچه ان آیتوں اور شعروں میں ' لولا ' کا جواب مؤخر ہے مگر جب که اس کا جواب بحالت مؤخر ہونے کے بغیر لام کے آیا ہے تو کوئی وجه نہیں ہے که بحالت مقدم ہونے کے بغیر لام کے نه آوے چناں چه هم اس کی مثال بھی پیش کریں گے ۔

بلا شبه تفسیر کبیر نے نہایت عمده طریق پر بیان کیا ہے که ' وهم بها ' جواب مقدم ہے ، 'لولا ' کا ، لیکن هم مختصر طور پر یه بات کہتے ہیں که خود قرآن مجید سے ثابت ہے که ' وهم بها ' جواب مقدم ہے ' لولا ' کا ، کیوں که پہلی آیت سے کسی قسم کے ' هم ' یعنی قصد سے انکار بیان ہو چکا ہے تو آیت میں ہر قسم کے ' هم ' یعنی قصد سے نفی ہونی چاهیے اور اس کی نفی نہیں ہوتی جب تک که ' وهم بها ' کو ' لولا ' کا جواب مقدم نه قرار دیا جاوے پس نص قرآنی سے ثابت ہے که ' هم بها ' جواب مقدم ' لولا ' کا ہے ۔

هم اسی قدر پر اکتفا کرنا نہیں چاہتے بلکه بیان کرتے ہیں که عرب کے اشعار میں بغیر لام کے بھی لولا کا جواب مقدم آیا ہے ۔ امرا القیس کہتا ہے ۔

یغالین فیہ الخبرء لولا ھو اجر
جناد بھا صرعی لھن نصیص

غلو کرتیں وہ آونٹنیاں قناعت کرنے میں پانی سے چارہ پر اگر ایسی دوبھر نہ ھوتی جس پر ٹڈیاں زمین پر گر پڑی ھیں اور وہ چرچر بول رھی ھیں گویا بھنے کی وہ چرچراھٹ ھے ۔

زھیر جو بہت مشہور اور قدیم شاعر زمانہ جاھلیت کا ھے کہتا ھے ۔

المجد فی غیر ھم لولا ماثرہ
و صبر نفسہ والحرب تستعر

بزرگی اس کے سوا اوروں میں ھوتی ھے اگر نہ ھوتی اس کی یعنی ممدوح کی خوبیاں اور استقلال نفس ایسی حالت میں کہ لڑائی بھڑک رھی ھے ۔

(شہد شاھد) ۔ شاھد کا لفظ زیادہ تر گواہ کے معنوں میں مستعمل ھے مگر ایسے گواہ پر جس نے اس واقعہ کو جس کا وہ گواہ ھے بچشم خود دیکھا ھو اس لیے قرآن مجید کے مترجموں نے اس کا ترجمہ کیا ھے (گواھی داد گواھے) اور اردو میں ترجمہ کیا ھے (گواھی دی گواہ نے) مگر یہ ترجمہ صریح غلط ھے کیوں کہ اگر 'شاھد' کے معنی گواہ کے لیے جاویں تو اس کی گواھی "ان کان قمیصہ قدمن قبل الی آخرہ" ھوگی اور صاف ظاھر ھے کہ وہ گواھی نہیں ھے بلکہ وہ ایک واقعہ کی نسبت حکم یا فیصلہ ھے پس خود سیاق قرآن ان معنوں سے جو مترجموں نے اختیار کیے ھیں انکار کرتا ھے اسی لیے اس تفسیر کے مصنف نے جو تفسیر ابن عباس کے نام سے مشہور ھے 'شہد شاھد' کی تفسیر میں لکھا ھے 'حکم حاکمہ' شاھد سے حاکم مراد لینا گو سیاق قرآن کے مناسب ھو مگر لفظ کی دلالت سے بہت بعید ھے ۔

شہد اور شاھد کا لفظ جیسا کہ گواہ کے معنوں میں مستعمل ھے اُس سے زیادہ حاضر اور موجود ھونے کے معنوں میں مستعمل ھے پس صحیح ترجمہ اُن لفظوں کا وہ ھے جو ھم نے اختیار کیا ھے کہ (حاضر ھوا حاضر ھونے والا) یعنی اس تنازع کے وقت جو اُس عورت اور حضرت یوسف میں ھوا ایک شخص آیا اور اس نے یہ فیصلہ کیا کہ ” ان کان قمیصہ قدمن قبل الخ۔“

اب اس بات پر بحث ھے کہ وہ شاھد کون تھا۔ تفسیر کبیر میں متعدد روائتیں اس کی نسبت لکھی ھیں جو اُسی قسم کی ھیں جیسے کہ بے سر و پا روائتیں تفسیروں میں ھوتی ھیں مگر وہ روایت جس پر ایک گروہ مفسرین کو اتفاق ھے اس قابل ھے کہ اس پر اعتماد کیا جاوے اور وہ یہ ھے کہ۔

انہ کان لھا ابن عم و کان رجلا حکیما واتفق فی ذالک الوقت انہ کان مع الملک یریدان یدخل علیھا فقال قد سمعنا الجلبة من وراء الباب و شق القمیص الا انا لا ندری ایکما صاحبہ فان کان شق القمیص من قدامہ فانت صادقة و الرجل کاذب و ان کان من خلفہ فالرجل صادق وانت کاذبة فلما نظروالی القمیص و راؤالشق من خلفہ قال ابن عمھا انہ من کیدکن عظیم ای من عملکن ثم قال لیوسف اعرض عن ھذا واکتمہ و قال لھا استغفری لذنبک وھذا قول طائفة عظیمة من المفسرین۔ (تفسیر کبیر)

اس عورت کا چچا زاد بھائی تھا اور وہ ایک حکیم آدمی تھا اتفاق سے اُس وقت وہ بادشاہ کے ساتھ تھا اور اس عورت کے پاس جانے والا تھا اس نے کہا کہ میں نے دروازہ سے ورے کھینچاتانی اور آواز قمیص پھٹنے کی سنی، مگر میں نہیں جانتا کہ تم

دونوں میں کون آگے تھا ۔ پس اگر کرتا آگے سے پھٹا ھو تو تو سچی ھے اور وہ شخص جھوٹا ھے اور اگر پیچھے سے پھٹا ھو تو وہ شخص سچا ھے اور تو جھوٹی ھے ۔ پھر جب قمیص کو دیکھا اور معلوم ھوا کہ وہ پیچھے سے پھٹا ھے تو اس عورت کے چچا ذاد بھائی نے کہہ دیا بیشک تمہارا مکر ھے اور بیشک تمہارا مکر بڑا ھے یعنی یہ کام تمہارا ھے ۔ پھر اس نے یوسف سے کہا کہ اس سے در گذر کرو اور اس کو پوشیدہ رکھو اور اس عورت سے کہا کہ تو معافی مانگ اپنے گناہ سے ۔ یہ قول ھے ایک گروہ عظیم کا مفسرین میں سے ۔ پس یہ روایت ایسی ھے کہ اس کو تسلیم کیا جا سکتا ھے اور اس روایت سے بھی معلوم ھوتا ھے کہ شہد شاھد کا لفظ بمعنی گواہ کے نہیں آیا بلکہ ایسے شخص کی نسبت آیا ھے جو وھاں حاضر تھا ۔

انیسویں اور بیسویں آیت کے اکثر الفاظ نہایت غور طلب ھیں اور مفسرین نے بلاشبہ ان پر غور کی ھے اور اپنی سمجھ کے مطابق ان کی تفسیر بھی بیان کی ھے مگر تشفی کے قابل نہیں ھے خصوصاً اس وجہ سے کہ وہ تفسیر نا معتمد روایتوں پر مبنی ھے ھم چاھتے ھیں کہ جہاں تک ھو سکے خود قرآن مجید کی دوسری آیتوں سے ان کی تفسیر سمجھیں ۔

ان آیتوں میں ھے کہ جب شہر کی عورتوں نے حضرت یوسف کے ساتھ عزیز مصر کی عورت کے عشق کا چرچا کیا اور کہا کہ وہ علانیہ گمراھی میں ھے اور جب عزیز مصر کی عورت نے ان کا چرچا کرنا سنا تو ان کو دعوت میں بلایا جس میں حضرت یوسف بھی موجود ھوئے ۔ مفسرین لکھتے ھیں کہ وہ چار پانچ عورتیں تھیں ایک عزیز مصر کے شراب پلانے والے کی عورت ۔ دوسری اس کی روٹی پکانے والے یعنی داروغہ باورچی خانہ کی عورت ، تیسری افسر جیل خانہ کی عورت ۔ چوتھی داروغہ اصطبل کی عورت ۔ پانچویں

حاجب یعنی افسر منتظم دربار کی عورت ۔

ان آیتوں میں جو الفاظ قابل غور ہیں منجملہ اُن کے ایک لفظ 'بـمـکـرھـن' ہے یعنی جب عزیز مصر کی عورت نے اُن عورتوں کا چرچا کرنا سنا تو اس کو بلفظ بـمـکـرھـن سے تعبیر کیا ۔ پس غور کرنے کی بات ہے کہ ان کے اس چرچے کو کیوں اس لفظ سے تعبیر کیا ۔ تفسیر کبیر میں اور اسی طرح اور تفسیروں میں لفظ 'بـمـکـرھـن' کی تفسیر 'بـقـولـهـن' کی ہے پھر اس پر بحث کی ہے ان کے قول کو 'مکر' کے لفظ سے کیوں تعبیر کیا ہے ۔ تفسیر کبیر میں اس کی تین وجہیں لکھی ہیں جو صحیح نہیں معلوم ہوتیں ۔

اول یہ کہ ۔ اس چرچہ سے ان کا مطلب یہ تھا کہ عزیز مصر کی عورت ہم کو بھی یوسف دکھا دے ۔ مگر یہ کسی قدر بعید از عقل ہے کہ اُن عورتوں نے جو عزیز مصر کے محل میں آنے جانے والی اور اس کے افسروں کی عورتیں تھیں اور حضرت یوسف بھی وھیں رہتے تھے اور انھوں نے ان کو کبھی نہ دیکھا ہو ۔

دوسرے یہ کہ عزیز مصر کی عورت کے عشق کا راز ان کو معلوم تھا مگر اس کے چھپانے کو کہا تھا جب اُنھوں نے اس کا چرچا کیا تو یہ دغا بازی و مکر ہوا ۔ تسلیم کرو کہ دغا بازی اور خلاف وعدگی ہوئی رازداری نہ ہوئی مگر اُس میں مکر کیا ہوا ۔

تیسرے یہ کہ اُنھوں نے عزیز مصر کی عورت کی پوشیدہ پوشیدہ غیبت کی جو مکر کے مشابہ تھی اس توجیہہ کا بودا پن خود اس سے ظاہر ہے ۔ اب ہم قرآن مجید ھی سے تلاش کرتے ھیں کہ اُن عورتوں نے جو چرچا کیا اُس پر مکر کا کیوں اطلاق کیا قرآن مجید کی اور آیتوں سے جن کا ہم ذکر کریں گے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عورتیں خود حضرت یوسف کے عشق میں مبتلا تھیں اور حضرت

یوسف کو اپنی طرف ملتفت کرنا چاہتی تھیں اور ظاہر میں عزیز مصر کی عورت کو یوسف کے عشق پر ملامت کرتی تھیں اور اس لئے اُن کے اُس چرچے اور ملامت کرنے کو اُن کے مکر سے تعبیر کیا ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عورتیں مع عزیز مصر کی عورت کے اُس عشق بازی میں شریک تھیں اور ایک کو دوسری کا حال معلوم تھا اور اسی سبب سے عزیز مصر کی عورت نے ان کی بات چیت کو مکر سے تعبیر کیا اور بسبب راز دار ہونے کے یوسف کی دعوت میں ان کو بلایا اور سب نے مل کر حضرت یوسف کو فحش کے ارتکاب پر مجبور کرنا یا ان کو کسی جرم کے حیلہ میں پھنسانا چاہا تھا کیوں کہ حضرت یوسف پہلے جرم کے اتہام سے بری ہو چکے تھے اور وہ مجلس جس میں حضرت یوسف اور وہ عورتیں بلائی گئی تھیں دعوت کی تھی جس میں متعدد قسم کے کھانے تھے اور اُن کے کاٹنے کے لیے ہر ایک کو ایک چھری دی گئی تھی چناں چہ تفسیر کبیر اور نیز تفسیر موسوم بہ ابن عباس میں لکھا ہے کہ وہ عورتیں دعوت میں بلائی گئی تھیں اور پھل کاٹنے یا گوشت کاٹنے کو چھریاں ان کو دی تھیں اور وہ گوشت کو چھری سے کاٹ کر کھاتے تھے مگر ان عورتوں نے صرف حضرت یوسف کو جرم میں پھنسانے کے لیے خود دانستہ اپنے ہاتھ کاٹ لیے اور اسی جرم کے اتہام میں ان کو قید خانہ میں بھیجا ۔ تفسیر کبیر اور تفسیر ابن عباس کی اصل عبارتیں یہ ہیں ۔

حاصل الکلام انها دعت اولئک النسوة و اعتدت لکل واحدة منهن سکینا اما لاجل اکل الفاکهة او لاجل قطع اللحم ۔ (تفسیر کبیر)

و اقعت (اعطت) کل واحدة منهن سکینا ۔ تقطع بها اللحم لانهم کانوا لا یاکلون الا ما یقطعون بکا لما کینم ۔ (تفسیر ابن عباس)

اب اس مطلب کو ہم قرآن مجید کی آیتوں سے ثابت کرتے ہیں - جب بادشاہ نے خواب کی تعبیروں کو جو حضرت یوسف نے دی تھیں سن کر کہا کہ حضرت یوسف کو قید خانہ سے لاؤ تو جو شخص لینے آیا تھا اس سے حضرت یوسف نے کہا کہ -

فارجع الی ربک فسئلہ ما بال النسوۃ التی قطعن ایدیھن ان ربی بکیدھن علیم - (آیت ۵۰)

تو پھر جا اپنے مالک کے پاس اور اس سے پوچھ کہ کیا حال ہے ان عورتوں کا جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹے تھے بے شک میرا رب یعنی وہ جس نے میری پرورش کی ہے اُن کے مکر کو جانتا ہے - اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُنھوں نے اپنے ہاتھ خود مکر کرنے کے لیے کاٹے تھے -

اس پر بادشاہ نے یا عزیز مصر نے ان سے پوچھا کہ -

ما قال خطبکن اذ راد دتن یوسف عن نفسہ قلن حاش اللہ ماعلمنا علیہ من سوء - (آیت ۵۱)

تمھاری کیا حالت تھی جب کہ تم نے لگاوٹ کی یوسف سے اُس کو اپنے آپے کی حفاظت سے ڈگمگا دینے کو اُن عورتوں نے کہا دہائی خدا کی ہم نے یوسف میں کوئی برائی نہیں جانی - اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ جس طرح عزنز مصر کی عورت نے حضرت یوسف سے لگاوٹ کی باتیں کی تھیں وہی حال ان عورتوں کا تھا جنھوں نے دانستہ مکر کرنے کے لیے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے -

تفسیر کبیر میں بادشاہ کے اس قول کی نسبت " اذ راد دتن یوسف عن نفسہ " دو احتمال لکھے ہیں ایک یہ کہ -

ان قولہ اذ راد دتن یوسف عن نفسہ و ان کانت صیغۃ الجمع فالمراد منھا الواحدہ کقولہ تعالی

الـذيـن قـال لـهـم الـنـاس ان الـنـاس جـمـعـوا لـكـم (والثانی) ان الـمـراد مـنـه خـطـاب الـجـاعـتـه ثم هـنـهـا وجـهـان (الاول) ان کان واحـدۃ مـنـهـن راودت يـوسـف عـن نـفـسـهـا (والـثـانی) ان کل واحـدۃ مـنـهـن راودت يـوسـف لاجـل امراۃ الـعـزيـز - (تفسیر کبیر)

اگرچه راو دتـن صیغه جمع کا ھے لیکن اُس سے مراد واحد ھے یعنی وھی عورت عزیز مصرکی - مگر یه احتمال محض غلط ھے - اول تو اس لیے که صیغه جمع سے واحد مراد لینےکی کوئی وجه نہیں دوسرے یه که بادشاہ نے یوسف کے پیغام پر سوال کیا تھا اور حضرت یوسف نے صاف کہا تھا که ان عورتوں کا کیا حال ھے جنھوں نے اپنے ھاتھ کاٹ لیے تھے پس اُنھی عورتوں سے بادشاہ نے ' اذ راو دتـن يـوسـف عـن نـفـسـه ' کہه کر سوال کیا پس تحقیق معلوم ھوا که وہ صیغه جمع کا ھے اُن عورتوں کی نسبت بولا گیا ھے جو تعداد میں چار پانچ تھیں پھر اُس سے واحد مراد لینا خلاف واقع اور خلاف حقیقت ھے - دوسرا احتمال یه لکھا ھے که اس سے گروہ عورتوں کا مراد ھے خواہ اُن میں سے ھر ایک نے حضرت یوسف کو خود اپنے نفس کے ساتھ فحش کرنے کی لگاوٹ کی ھو خواہ عزیز مصر کی عورت کے ساتھ مگر گو یه احتمال اس تفسیر کا موید ھے جو ھم نے بیان کی ھے مگر اس احتمال میں بھی جو دو شقیں بیان ھوئی ھیں اُن میں سے ھم پہلی شق کو ترجیح دیتے ھیں کیوں که وہ زیادہ تر الفاظ قرآن کے مناسب ھے -

ان آیتوں کے بعد کی آیت میں جو عزیز مصر کی عورت کا یه قول ھے که - قـالـت فـذلـکـن الـذی لـمـتـنـی فـيـه - (آیت ۳۲)

یعنی وھی شخص ھے جس کی بابت تم مجھ کو ملامت کرتی ھو اس

کی تفسیر میں مفسرین نے لکھا ہے کہ ان کی ملامت یوسف کے ساتھ عشق رکھنے کی تھی - مفسرین نے اس واقعہ کی صورت اس طرح سمجھی ہے کہ ان عورتوں نے حضرت یوسف کو کبھی نہیں دیکھا تھا اور عزیز مصر کی عورت نے اُن کو دعوت میں بلایا کہ جب وہ یوسف کے حسن و جمال کو دیکھیں گی تو ملامت نہیں کرنے کیں جب اُنھوں نے دفعةً حضرت یوسف کو دیکھا تو اُن کے حسن و جمال کے سبب اُن کو ہوش نہ رہا اُنھوں نے بجائے گوشت یا میوہ کے اپنے ھاتھ کاٹ لیے اور کہا کہ یہ تو انسان نہیں ہے بلکہ فرشتہ ہے - اس وقت عزیز مصر کی عورت نے کہا کہ یہ وہی ہے جس کے عشق کی بابت تم مجھ کو ملامت کرتی ہو -

مگر جس طرح کہ ہم نے قرآن مجید کی ایک آیت کی دوسری آیت سے تفسیر بیان کی ہے اس سے صورت واقعہ کی اس کے برخلاف ہے جو مفسرین نے نکالی ہے بلکہ صورت واقعہ یہ تھی کہ اُن عورتوں کی ملامت اس بات پر تھی کہ عزیز کی عورت جو بہت اعلی درجہ کی ہے اپنے ایک غلام پر اس طرح فریفتہ ہو جاوے اور وہ اُس پر ملتفت نہ ہو - پس اس مجلس دعوت میں جب اُن عورتوں نے بھی ہر طرح سے حضرت یوسف کی خوشامد اور ان سے لگاوٹ کی اور آخرکار ان کو دھمکانے اور ڈرانے اور مجرم ٹھہرانے کے لیے اپنے ھاتھ بھی کاٹ لیے اور جب بھی حضرت یوسف فحش کے مرتکب نہ ہوئے تو ان عورتوں نے کہا کہ یہ تو انسان نہیں ہے بلکہ ایک بزرگ فرشتہ ہے کہ کسی داؤ میں نہیں آیا - اُس پر عزیز مصر کی عورت نے کہا کہ یہ وہی ہے جس کی بابت تم مجھ کو ملامت کرتی ہو کہ میں تو اس پر فریفتہ ہوں اور وہ مجھ پر ملتفت نہیں ہوتا اس کے بعد عزیز مصر کی عورت کا یہ کہنا کہ -

ولقد راودتہ عن نفسہ فاستعصم ولئن لم یفعل

ما امرة یسجنن ولیکونا من الصاغرین - (آیت ۳۲)

میں نے اس سے لگاوٹ کی اس کو اپنے آپے کی حفاظت سے ڈگمگانے کو مگر وہ نہیں ڈگمگایا اور بچا رہا اور اگر وہ نہ کرے گا جو میں اس کو کہتی ہوں تو وہ ضرور قید کیا جاوے گا اور البتہ ہوگا چھٹ بھیوں میں سے اس پر حضرت یوسف کا یہ کہنا کہ -

قال رب السجن احب الی مما تدعوننی الیہ (آیت ۳۳)

اے میرے خدا قید خانہ مجھے زیادہ پیارا ہے اس بات سے جو وہ مجھ سے چاہتی ہیں ، بالکل موید و مثبت اس واقعہ کا ہے جو ہم نے بیان کیا ہے پس ان تمام آیتوں کے ملانے سے اس واقعہ کی وہی تصویر سامنے آ جاتی ہے جو ہم نے بیان کی ہے -

(ثم بدالھم من بعد ماراؤ الایات) -

اس میں کچھ شبہ نہیں ہو سکتا کہ حضرت یوسف کے قید میں بھیجنے کا ارادہ مجلس دعوت کے بعد پیدا ہوا پس سوال یہ ہے کہ قید میں بھیجنے کی بنیاد وہی پہلا واقعہ تھا جس میں کرتا پھٹا تھا یا اور کوئی نیا امر پیدا ہوا ہمارے نزدیک دعوت کے جلسہ میں ان عورتوں کا مکر سے ہاتھ کاٹ لینا ایک نیا واقعہ حضرت یوسف کو قید میں بھیجنے کا پیدا ہوا لیکن مفسرین اس پہلے ہی واقعہ کو قید کا سبب قرار دیتے ہیں بہر حال یہ ایک ایسا خفیف امر ہے جس میں زیادہ بحث کی ضرورت نہیں مگر تفسیر کبیر میں جو کچھ اس کی نسبت لکھا ہے - اس کو اس مقام پر نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے چناں چہ تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ -

اعلم ان زوج المراۃ لما ظہر لہ براۃ ساحۃ یوسف علیہ السلام فلا جرم لم یتعرض لہ فاحتالت المراۃ بعد ذالک لجمیع الحیل حتی تحمل یوسف علیہ السلام علی موافقتہا علی مراد ھا فلم یلتفت یوسف الیہا

فلما ایست دنه احتالت فی طریق اخرو قالت لزوجها ان هذا العبد العبرانی فضحنی فی الناس یقول لهم انی راوته عن نفسه و انا لا اقدر علی اظہار عذری فاما ان تاذن لی فاخرج و اعتذرو اما ان تجسه کما حبستنی مغند ذالک وقع فی قلب العزیز ان الا صلح حسبه حتی یسقط عن السنة الناس فکر هذا لحدیث حتی تقلی الفضیحة فهذا هوالمراد من قوله ـ ثم بدالهم من بعد ماروا وا الایات یسبحنه حتی حین لان البدء عبارة عن تعیز المرای عما کان علیه فی الاول والمراد من الایة براته بقد القمیص من و بروخش الرحبه والزام المحکم یاهلہ قوله انه من کید کن عظیم ـ (تفسیر کبیر)

جب عورت کے شوھر کو حضرت یوسف کی پاک دامنی معلوم هوئی تو اس نے حضرت یوسف سے کچھ تعرض نہیں کیا پس عورت نے اس کے بعد هر طرح کے حیلے کیے تاکہ یوسف اس کے ڈھب پر چڑھ جائیں ـ لیکن وہ بالکل ملتفت نہ ھوئے پس جب وہ مایوس ھوگئی تو ایک طریقہ نکالا اور اپنے شوھر سے کہا کہ اس عبرانی غلام نے مجھ کو لوگوں میں رسوا کیا ـ لوگوں سے کہتا ھے کہ میں نے اس کو پھسلایا اور میں اس کی کوئی تاویل نہیں کر سکتی یا تو مجھ کو اجازت دو کہ میں گھر سے نکل کر اس کا دفعیہ کروں یا اس کو قید کر دو جیسا کہ تم نے مجھے قید کر دیا ھے ـ اس بات پر عزیز مصر کو خیال ھوا کہ یوسف کا قید ھی کرنا مناسب ھے تاکہ لوگوں کی زبانوں پر یہ تذکرہ نہ رھے اور رسوائی کم ھو جائے اور خدا کے اس قول میں ثم بدالھم من بعد ماروا والایات کا یہی مطلب ھے کیوں کہ بدء کے یہ معنی ھیں کہ پہلے جو رائے تھی وہ بدل جائے اور آیت سے مراد حضرت یوسف کی پاک دامنی

ہے - قمیص کے پیچھے کی جانب سے پھٹے ہونے سے اور فیصلہ کرنے والے کے اس الزام دینے سے کہ یہ تمہارا فریب ہے اور تمہارا فریب بہت بڑا ہے -

اس کے بعد جو آیتیں ہیں وہ حضرت یوسف کے قید میں جانے اور دو قیدیوں اور فرعون مصر کی خوابوں کے متعلق ہیں جن کی تفسیر بیان ہو چکی ہے -

اب تمام سورہ میں صرف دو تین مقام قابل غور باقی رہ گئے ہیں ایک یہ '' وابیضت عیناہ من الحزن فھو کظیم '' دوسرے یہ کہ '' اذھبو بقمیصی ھذا فالقوہ علی وجہ ابی یات بصیرا - فلما ان جاء البشیرا التاہ علی وجھہ فاغ قد بصیرا '' - تیسرے یہ کہ '' ولما فصلت العیر قال ابوھم انی لاجد ریح یوسف لولا ان تغندون '' پس اب ہم تینوں مقاموں کی تفسیر بیان کرنی چاہتے ہیں -

' ابیضت عیناہ ' سے زوال بصارت یعنی اندھا ہو جانا مراد لینا صحیح نہیں ہے غم سے اور زیادہ رونے سے انسان کی آنکھوں میں اس کی بینائی میں ضعف آ جاتا ہے اور آنکھوں کے ڈھیلوں میں جو سفیدی ہے اس کی رنگت اصلی سفید رنگ میں اور پر رونق نہیں رہتیں بلکہ بے رونق اور اصلی رنگ سے زیادہ سفید ہو جاتی ہیں اور تراوت کے بجائے خشکی آ جاتی ہے یہاں تک کہ آنسو نکلنے بھی موقوف ہو جاتے ہیں اور آنکھیں ڈگر ڈگر کرنے لگتی ہیں پس یہی حال حضرت یعقوب کی آنکھوں کا ہو گیا تھا قرآن مجید کے یہ الفاظ ' من الحزن فھو کظیم ' صاف اسی مطلب کو ظاہر کرتے ہیں -

لیکن یہ حالت دفعۃً بدل جاتی ہے جب کہ وہ غم دور ہو جاوے دل میں طاقت اور دماغ میں قوت آ جاتی ہے خون کی گردش

نیز ہو جاتی ہے اور ان سب باتوں سے آنکھوں پر رونق ہو جاتی ہے ۔ ضعف بصر جاتا رہتا ہے اور اصلی بصارت پھر آ جاتی ہے اسی حالت کی نسبت یات بصیرا ۔ اور فاء قد بصیرا کہا گیا ہے ۔ یہ سب امور طبعی ہیں جو انسان پر ایسی حالت میں گزرتے ہیں پس کوئی ضرورت نہیں کہ ہم ان طبعی واقعات کو بے ہودہ اور بے سروپا روایتوں کی بناء پر دوراز کار قصے بناویں اور چھوٹے قصوں کو قرآن مجید کی تفسیر میں داخل کرکے کلام الٰہی کے ساتھ بےادبی کریں ۔

تفسیر کبیر میں بھی بعض اقوال ایسے لکھے ہیں جو بہت کچھ اس تفسیر سے جو ہم نے بیان کی ہے مناسبت رکھتے ہیں اس مقام پر ان کا نقل کرنا خالی از لطف نہ ہوگا ۔

تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ ۔ انہ لما قال یا اسفی علی یوسف غلبہ للبکاء وعند غلبة البکاء یکثر الماء فی العین فتصیر العین کانہا ابیضت من بیاض ذالک الماء وقولہ ابیضت عیناہ من الحزن کنایة عن غلبة البکاء والدلیل علی صحتہ ھذ القول ان تاثیر الحزن فی غلبة البکاء لا فی حصول العمی فلو حملنا الا بیضا من علی غلبة البکاء وکان ھذا القلیل حسنا ولو حملناہ علی العمی لا یحسن ھذ القلیل فکان ما ذکرناہ اولی و ھذا التفسیر مع الدلیل رواہ الواحدی فی البسیط عن ابن عباس رضی اللہ عنہما ۔ (تفسیر کبیر)

یعنی جب حضرت یعقوب نے کہا کہ ہائے افسوس یوسف پر تو ان پر رونے نے غلبہ کیا اور رونے کے وقت آنکھ میں پانی بہت ہو جاتا ہے اور آنکھ ایسی ہو جاتی ہے گویا سپید ہو گئی ہے اس پانی سے اور خدا کا یہ قول کہ یعقوب کی آنکھیں غم سے سپید ہو

گئیں رونے کے غلبہ سے کنایہ ہے اور اس قول کے صحت کی دلیل یہ ہے کہ غم کا اثر رونے کا غلبہ ہے نہ اندھا ہو جانا پس اگر ہم سپیدی کو غلبہ بکا پر محمول کریں تو یہ تعلیل معقول نہ ہوگی۔ اس لیے ہم نے جو ذکر کیا وہی بہتر ہے اور یہ تفسیر باوجود اس دلیل کے حضرت ابن عباس سے مروی بھی ہے جیسا کہ واحدی نے بسیط میں روایت کیا ہے پس اس روایت سے جو حضرت ابن عباس سے بیان ہوئی ہے صاف ظاہر ہے کہ ابیضت عیناہ سے حضرت یعقوب کا اندھا ہو جانا مراد نہیں ہے۔

ایک اور قول اسی مقام پر تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ و منہم من قال ماعمی لکنہ صار بحیث یدرک ادرا کا ضعیفا۔ (تفسیر کبیر) بعضوں نے کہا ہے کہ وہ اندھے نہیں ہو گئے تھے بلکہ ان کو نظر آتا تھا لیکن کم نظر آتا تھا۔

اس کے بعد تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ۔ فارقد بصیرا ای رجع بصیراً و معنی الارتداد انقلاب الشی الی حالۃ قد کان علیھا و قولہ فارتد بصیرا ای صیرہ اللہ بصیرا کما یقال طالت النخلۃ واللہ تعالی اطالھا واختلفوا فیہ فقال بعضھم انہ کان قد عمی بالکلیۃ فاللہ تعالی جعلہ بصیرا فی ھذا الوقت قال آخرون بل کان قد ضعف بصرہ من کثرۃ البکاء و کثرۃ الاحزان فلما القوا القمیص علی وجھہ و بشر بحیاۃ یوسف علیہ السلام عظم فرحہ و انشرح صدرہ و زالت احزانہ فضد ذالک قوی بصرہ و زال النقصان عنہ۔ (تفسیر کبیر)

یعنی پھر وہ بصیر ہو گئے اور ارتداد کے معنی کسی شے کا اس حالت پر واپس آ جانا ہے جو پہلی تھی اور خدا کا یہ قول فارتد بصیرا اس کے یہ معنی ہیں کہ خدا نے ان کو بصیر کر دیا

جیسا کہ محاورہ میں کہتے ہیں کہ کھجور لمبی ہو گئی اور خدا نے اس کو لمبی کر دیا اور اس میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے سو بعضوں نے کہا کہ وہ بالکل اندھے ہو گئے تھے اور اللہ نے اُن کو اُس وقت بصیر کر دیا اور بعضوں نے کہا ہے کہ اُن کی نگاہ زیادہ رونے سے اور غم سے ضعیف ہو گئی تھی پس جب اُن پر کرتہ ڈالا اور یوسف کی زندگی کی خوش خبری دی تو ان کو بہت خوشی حاصل ہوئی اور ان کا سینہ کھل گیا اور غم جاتا رہا ۔ پس اُن کی نگاہ ٹھیک ہو گئی اور جو نقصان تھا جاتا رہا ۔

اب 'لا جدریج یوسف' پر غور کرنی باقی ہے ۔ یہ بات بخوبی ظاہر ہے کہ حضرت یعقوب کو اس بات پر کہ حضرت یوسف کو بھیڑیا کھا گیا ہرگز یقین نہیں تھا اور وہ بلاشبہ اُن کو زندہ سمجھتے تھے اور ایسے موقع پر یہی خیالات ہوتے ہیں کہ وہ کہیں چلا گیا ہوگا اور کسی نے اس کو اپنے پاس رکھ لیا ہوگا یا بطور غلام کے بیچ ڈالا ہوگا اور اس زمانہ کی حالت کے موافق یہ اخیر خیال زیادہ قوی ہوگا اُنھی وجوہات سے ان کو ہمیشہ یوسف کی تلاش رہتی تھی اور ہمیشہ اس کے ملنے کی توقع رکھتے تھے اور ان کے تلاش کرنے کی تاکید کیا کرتے تھے ۔ یہ ایسا امر ہے جو ہمیشہ ہوتا ہے اس زمانہ میں بھی اگر کسی کا لڑکا گم ہو جاتا ہے یا کہیں نکل جاتا ہے تو ہمیشہ اس کی تلاش میں رہتا ہے اور اس سے ملنے یا اُس کے مل جانے کی توقع رکھتا ہے ۔

اس زمانہ میں مصر کی ایسی حالت تھی کہ لڑکے اور لڑکیوں کو پکڑ لے جا کر وہاں بیچ ڈالنا زیادہ قرین قیاس تھا اور کچھ تعجب نہیں ہے کہ حضرت یعقوب کو بھی یہ خیال ہو کہ کسی شخص نے یوسف کو پکڑ لیا ہو اور مصر میں لے جا کر بیچ ڈالا ہو ۔ تفسیر کبیر میں ایک روایت لکھی ہے گو اُس روایت کا طرز

بیان کیسا ھی فضول ہو مگر اس کی فضولیات چھوڑ کر دو نتیجے اُس سے نکالے جا سکتے ھیں ایک یہ کہ حضرت یعقوب کو یوسف کے زندہ ہونے کا یقین تھا دوسرے یہ کہ اُن کو یوسف کے مصر میں ہونے کا احتمال تھا اور وہ روایت یہ ھے کہ ۔ قال یعقوب علیہ السلام و اعلم من اللہ مالا تعلمون ای اعلم من رحمۃ و احسانہ مالا تعلمون وھو انہ تعالیٰ یاتینی بالفرح من حیث لا احتسب فھو اشارۃ الی انہ کان بتوقع وصول یوسف الیہ و ذکر والسبب ھذا التوقع اسورا احدھا ان ملک الموت اتاہ فقال لہ یا ملک الموت ھل قبضت روح ابنی یوسف قال لا یا نبی اللہ ثم اشار الی جانب مصر وقال اطلبہ ھٰھنا ۔ (تفسیر کبیر) ۔ یعنی حضرت یعقوب نے کہا کہ میں خدا کی طرف سے وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے یعنی میں خدا کا وہ احسان اور رحمت جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے اور وہ یہ ھے کہ خدا میرے لیے خوشی لائے گا اور مجھے پہلے سے اس کی کچھ خبر نہ ہوگی پس یہ اشارہ ھے اس بات کی طرف کہ حضرت یعقوب یوسف کے ملنے کی اُمید رکھتے تھے اور لوگوں نے اس اُمید کے مختلف وجوہ بیان کیے ھیں ایک یہ کہ ملک الموت ان کے پاس آیا تو اُن سے یعقوب نے پوچھا کہ تم نے میرے بیٹے کی روح قبض کر لی اُنھوں نے کہا اے خدا کے پیغمبر! نہیں ۔ پھر ملک الموت نے مصر کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ ادھر تلاش کیجیے ۔

بلاشبہ حضرت یعقوب نے مصر میں بھی تلاش کی ہوگی مگر وہ عزیز مصر کے ھاتھ بیچے گئے تھے اور محلوں میں داخل تھے اور ایک مدت تک قید رہے ان کا پتہ نہیں لگ سکتا ہوگا مگر جب حضرت یوسف کے بھائی مصر میں گئے اور حضرت یوسف بھی اُس زمانہ

میں عروج کی حالت میں تھے اور رعایت اور سلوک جو آنھوں نے اپنے بھائیوں کے ساتھ کیا تھا اور پھر اپنے حقیقی بھائی کے لانے کی بھی تاکید کی تھی اور کچھ حالات بھی آن کے سنے ہوں گے تو ان کے بھائیوں اور ان کے باپ کے دل میں ضرور شبہ پیدا ہوا ہوگا کہ کہیں یہ یوسف ہی نہ ہو مگر جس درجۂ شاہی پر آس وقت حضرت یوسف تھے یہ شبہ پختہ نہ ہوتا ہوگا اور دل سے نکل جاتا ہوگا۔

اس بات کا ثبوت کہ یوسف کے بھائیوں کے دل میں بھی شبہ تھا کہ وہ یوسف ہی نہ ہو خود قرآن مجید سے پایا جاتا ہے کیوں کہ جب حضرت یوسف نے آن سے کہا کہ "تم جانتے ہو کہ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا تھا تو بغیر اس کے کہ حضرت یوسف کہیں کہ میں یوسف ہوں آن کے بھائی بول آٹھے کہ ء انک لانت یوسف یعنی کیا سچ مچ تم یوسف ہو۔ اسی طرح حضرت یعقوب کے بیٹوں کے مصر میں آنے جانے اور حالات سننے سے یوسف کی نسبت مصر میں ہونے بلکہ یوسف کے یوسف ہونے کا شبہ قوی ہو جاتا تھا اس امر کی تقویت کے علاوہ اس پہلی روایت کی موید چند اور روایتیں تفسیر کبیر میں موجود ہیں۔

ایک روایت یہ ہے کہ۔ قال السدی لما اخبرہ بنوہ بسیرۃ الملک و کمال حالہ فی اقوالہ و افعالہ طمع ان یکون ہو یوسف و قال یبعدان یظہر فی الکفار مثلہ۔ (تفسیر کبیر)

یعنی سدی کا قول ہے کہ جب حضرت یعقوب کو ان کے بیٹوں نے عزیز مصر کے صفات اور ان کے اقوال و افعال کے کمال سے مطلع کیا تو ان کو آمید ہوئی کہ وہ یوسف ہی ہوں گے اور

یہ کہا کہ کافروں میں تو ایسا شخص پیدا نہیں ہو سکتا ۔

ایک یہ کہ ۔ علم قطعا ان بنیامین لا یسرق وسمع ان الملک ما اذاہ وما ضربہ فغلب علی ظنہ ان ذالک الملک ھو یوسف (تفسیر کبیر) ۔ یعنی اُنھوں نے قطعاً جان لیا کہ بنیامین چوری نہیں کر سکتا اور یہ سنا کہ بادشاہ نے اس کو نہ ستایا نہ مارا پس اُن کو گمان غالب ھوا کہ یہ بادشاہ یوسف ھی ھوگا ۔

ایک یہ ھے کہ ۔ انہ رجع الی اولادہ وتکلم معھم علی سبیل اللطف وھو قولہ یابنی اذھبوا فتحسسوا من یوسف و اخیہ و اعلم انہ علیہ السلام لما طمع فی وجدان یوسف بناء علی الامارات المذکورۃ قال لبنیہ تحسسوا من یوسف ۔ (تفسیر کبیر)

یعنی وہ اپنی اولاد کی طرف مخاطب ھوئے اور ان کے ساتھ مہربانی سے باتیں کیں جیسا کہ خدا نے کہا اذھبوا فتحسسوا من یوسف و اخیہ ۔ اور جان تو کہ حضرت یعقوب کو جب اُن نشانیوں کی اُمید بندھی تو اُنھوں نے بیٹوں سے کہا کہ یوسف کا پتہ لگاؤ ۔

پس جب کہ حضرت یعقوب کا شبہ اس قدر قوی ھو گیا اور جو مہربانی یوسف نے اپنے بھائی کے ساتھ کی تھی اس کو سن کر ان کو گمان غالب ھو گیا تھا کہ وہ بنیامین کا بھائی یوسف ھے تو ان کو یقین کامل ھوا کہ اب کے جو قافلہ واپس آوے گا تو ٹھیک خبر یوسف کی لاوے گا جب کہ تیسری دفعہ یہ لوگ مصر میں گئے تو حضرت یوسف نے سب کے سامنے کہہ دیا تھا کہ میں یوسف ھوں اور حضرت یعقوب کو معہ تمام کنبہ کے بلانے کے لیے کہا تھا اور ان کے لیے بہت سا سامان مہیا کرنے کو حکم دیا

تھا جس کے لیے کچھ عرصہ لگا ھوگا اس عرصہ میں حضرت یوسف کے مصر میں موجود ھونے کی خبر افواھاً حضرت یعقوب کو پہنچ گئی ھوگی اُس افواہ پر ان کو یقین ھوا اور انھوں نے فرمایا کہ "انی لا جدریح یوسف لولا ان تفندون" یعنی میں پاتا ھوں خبر یوسف کی اگر تم مجھ کو بہکا ھوا نہ کہنے لگو۔

هم کو نہیں معلوم کہ قرآن مجید میں کہیں "ریح" کا لفظ بمعنی بو کے آیا ھو اس مقام پر "ریح" کا لفظ یوسف کی طرف مضاف ھے تو اب ھم کو دیکھنا چاھیے کہ قرآن مجید میں اور کہیں بھی ریح کا لفظ کسی شخص یا اشخاص کی نسبت مضاف ھو کر آیا ھے یا نہیں اگر آیا ھے تو اس کے کیا معنی ھیں تلاش کے بعد ھم کو یہ آیت ملی و اطیعوا اللہ و رسولہ ولا تنازعوا فتفشلوا و تذھب ریحکم ۔ (سورہ انفال آیت ۴۸) یعنی جاتی رھے گی ھوا تمھاری یعنی قوت و اتفاق کی جو خبر مشہور ھے اُس کی شہرت جاتی رھے گی ۔

علاوہ اس کے خود ریاح کو بشرا یعنی خبر دینے والی خدا نے کہا ھے "ھو الذی یرسل الریاح بشرا بین یدی رحمتہ ۔ (سورۂ اعراف آیت ۵۵) اور ریاح کو مبشرات بھی کہا ھے یعنی خبر دینے والیاں " ومن آیاتہ ان یرسل الریاح مبشرات " (سورہ لقمان آیت ۴۵) پس ریح یوسف سے صاف مراد اُس افواھی خبر سے ھے جس سے یوسف کا ھونا حضرت یعقوب نے سنا تھا ۔

مفسرین کے دل میں یہ کہانی بسی ھوئی تھی کہ جب حضرت ابراھیم کو آگ میں ڈالا ھے تو حضرت جبریل نے بہشت سے ایک قمیص لا کر حضرت ابراھیم کو پہنا دیا تھا جس کے سبب سے وہ آگ میں نہیں جلے ۔ وہ قمیص حضرت اسحاق اور اُن کے بعد حضرت یعقوب کے پاس آیا حضرت یعقوب نے اس کو بطور

تعویذ کے چاندی میں منڈھ کر حضرت یوسف کے گلے میں لٹکا دیا جب ان کو اندھے کنوئیں میں ڈالا ھے تو وہ تعویذ اُن کے گلے میں رہ گیا تھا وھی قمیص اُنھوں نے بھیجا تھا جب وہ نکلا تو ھوا لگ کر تمام دنیا میں بہشت کے قمیص کی خوشبو پھیل گئی اوروں نے تو جانا کہ کاھے کی بو ھے مگر حضرت یعقوب نے بو کو پہچان لیا اور جان گئے کہ بہشت کی یا یوسف کے قمیص کی ھے پس اس خیال پر قرآن مجید میں بھی ریح کے معنی بو قرار دے دیے۔ یہ قصہ تفسیر کبیر میں بھی مندرج ھے مگر افسوس ھے کہ ھم اس پر یقین نہیں کر سکتے جو اپنا کرتا کہ انھوں نے بھیجا تھا وہ بلا شبہ ایک شاھانہ کرتا ھوگا اور صرف بطور نشانی کے بھیجا تھا کوئی اور عجیب بات اس کرتے میں نہ تھی بہ جز اس کے کہ اُس سے حضرت یعقوب کو پورا یقین اور ان کے دل کو تسلی ھو جاوے کہ یوسف زندہ ھے اور ایسے عالی درجہ پر خدا نے اس کو پہنچا دیا ھے۔

(لقد کان فی قصصہم عبرۃ) اب ھم کو غور کرنی چاھیے کہ اس قصے میں عبرت پکڑنے کی کیا چیزیں ھیں۔ مفسرین نے جو کچھ لکھا ھو لکھا ھو مگر چند باتیں بلاشبہ اس میں نہایت عبرت پکڑنے کی ھیں۔

سب سے اول حضرت یوسف کی پاک دامنی ھے حضرت یوسف جوان تھے اور انسان کا نفس امارہ جوانی کے زمانہ میں ادنٰی سی بات میں پاک دامنی سے ڈگمگا دیتا ھے۔ حضرت یوسف کو اس ڈگمگا دینے کی اس قدر زیادہ ترغیبیں تھیں۔ جو بہت کم کسی انسان کو ھو سکتی ھیں۔ عزیز مصر کی عورت جو ایک بادشاہ کی بیگم ھونے کا درجہ رکھتی تھی اس کی خواست گار تھی وہ خود بھی جوان اور خوب صورت تھی دنیا کی تمام نعمتیں یوسف کو

دینے پر موجود تھی ۔ وہ اور یوسف ایک محل میں رهتے تھے جب چاهیں تنہائی میں مل سکتے تھے متعدد دفعه وہ عورت اس طرح پیش آئی که اس حالت میں ایک جوان مرد کا ایک جوان عورت کی خواهش کا نه پورا کرنا اگر نا ممکن نہیں تو حد سے زیادہ مشکل ہے اور باوجود ان باتوں کے حضرت یوسف کا صرف خدا کے ڈر سے اور اس احسان مندی کی وجه سے که اُس کے شوهر نے مجھے خریدا ہے اور پرورش کیا ہے اور اپنے گھر میں رکھا ہے میں کیوں کر اس کی خیانت کر سکتا هوں پاک دامن رهنا بے انتہا غور کرنے اور نصیحت پکڑنے کے قابل ہے اُدهر خدا کا خوف اور خدا کے احکام کی اطاعت نصیحت دیتی ہے اور ادهر محسن کے احسان کو کبھی نه بھولنا اور قدرتی جذبات انسانی پر بھی احسان مندی کو غالب رکھنا انسانوں کے واسطے بہت بڑی نصیحت ہے ۔

جب عزیز مصر کی عورت نے کہا که اگر تو میری بات نه مانے گا تو میں تجھ کو قید خانه میں بھیج دوں گی اور ذلیل کر دوں گی تو یوسف نے اُس مصیبت اور دقت کو گوارا کر کے کس سچے دل اور خلوص نیت سے کہا که اے میرے پروردگار قید خانه مجھ کو بہت پیارا ہے اُس بات سے جو وہ مجھ سے چاهتی ہے ۔ یه قول حضرت یوسف کا کس قدر دل میں اثر کرنے والا اور عبرت اور نصیحت دینے والا ہے ۔

باپ سے کم سنی میں مفارقت ، بھائیوں کا ظلم ، اندھے کنوئیں ڈال دیے جانے کی مصیبت ، بطور غلام کے پکڑے جانے اور بیچے جانے کی ذلت اور پھر عیش و آرام میں آ کر قید خانه میں ڈالے جانے کی ذلت و مصیبت سب کو صبر سے سہنا اور هر حالت میں خدا کی مرضی پر راضی رهنا کبھی اُس کی شکایت نه کرنا کیا انسانوں کے لیے عمدہ سے عمدہ نصیحت نہیں ہے ۔

اس کے بعد جب یوسف بادشاہت کے درجہ پر پہنچ گئے اور بھائیوں پر بخوبی قابو پایا تو ان کے تمام ظلموں کو جو ان کے ہاتھ سے سہے تھے اور ان کی تمام برائیوں اور بد سلوکیوں کو یک لخت بھلا دینا اور نہایت اخلاق و محبت سے ان کے ساتھ پیش آنا اور نہایت مصیبت کے وقت پے در پے اور طرح بطرح سے ان کے ساتھ سلوک کرنا دنیا میں ان کی خطاؤں سے در گذر کرنا اور عاقبت میں ان کے گناہوں کی معافی چاہنا کیا انسانوں کے لیے اپنے اخلاق درست کرنے کے لیے کچھ کم نصیحت ہے ۔

ماں باپ کی خدمت اور تعظیم و ادب جو عین بادشاہت کے کے درجہ پر پہنچ کر حضرت یوسف نے ادا کیا ہمارے لیے کیسی عمدہ نصیحت ہے ۔

حضرت یوسف کے بھائیوں نے جو بد سلوکی اپنے بھائی اور اپنے بڈھے باپ کے ساتھ کی اور آخر کار اس سے نادم اور پشیمان ہوئے کیا ہمارے لیے ایسے یا اس کی مانند کاموں سے بچنے کے لیے عمدہ نصیحت نہیں ہے ۔

حضرت یعقوب کو اس واقعہ سے جو رنج پہنچا اور زمانہ دراز تک اس رنج و مصیبت میں مبتلا رہے مگر ہر حال میں خدا ہی کو یاد رکھا اسی سے کہا جو کچھ کہا اسی سے توقع رکھی جو توقع رکھی اور اگر کوئی لفظ زبان سے نکلا تو یہی نکلا کہ انما اشکوا بثی و حزنی الی اللہ تو کیا ان کی یہ حالت ہم کو خدا کی مرضی پر راضی اور احسان کا شکر ادا کرنے اور اس کے رحم کے ہر حالت میں متوقع رہنے کے لیے کیسی کچھ نہایت موثر نصیحت نہیں ہے ۔

پھر اس چھوٹی صورۃ اور مختصر الفاظ میں ان واقعات کو کو ایسی عمدگی سے بیان کیا ہے کہ لفظوں پر غور کرنے سے ہر

ایک بات کی تفصیل اور جزئیات اور انسانی جذبات کا نقشہ آنکھوں کے سامنے بندھ جاتا ہے اور وہ واقعات دل میں اثر کرتے ہیں اور خدا کے اس فرمانے پر کہ ۔ ما کان حدیثا یفتری ولکن تصدیق الذی بین یدیہ و تفصیل کل شئی و ھدی و رحمتہ لقوم یومنون ۔ دل سے ایمان آ جاتا ہے ۔

قوم عاد اور قوم ثمود کے حالات

(سرسید کا ایک نہایت تحقیقی مضمون)

عاد اور ثمود کی نسبت کچھ لکھنے سے پہلے مندرجہ ذیل شجرہ انساب لکھنا مناسب ہے۔ (سید احمد)
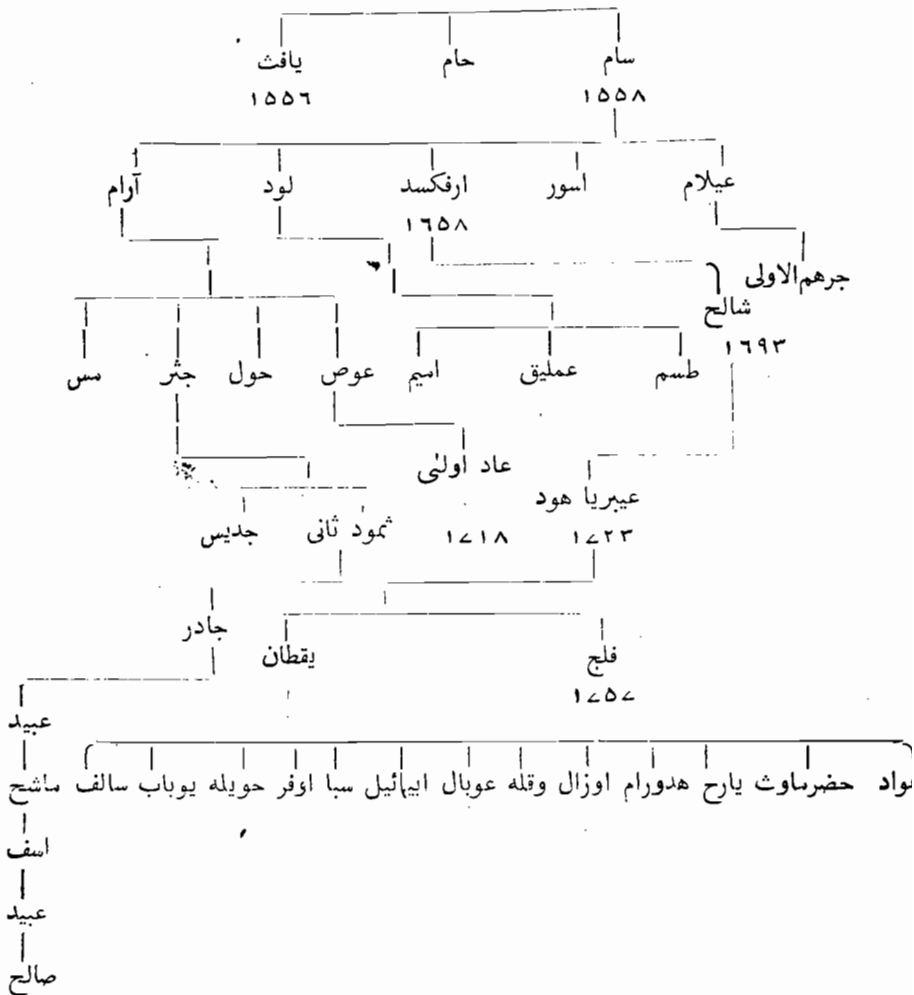
قوم عاد اولیٰ

عاد اولاد سام بن نوع سے ہے - سام کا بیٹا آرام اور اُس کا بیٹا عوص اور اس کا بیٹا عاد - معالم التنزیل میں لکھا ہے و ھو عاد بن عوص بن آرام بن سام و ھم عاد الاولیٰ - قوم عاد کی آبادی عربیا ڈرزتا یعنی عرب کے ریتلے میدان میں تھی اور الاحقاف کہلاتی تھی معالم التنزیل میں لکھا ہے - کانت منازل قوم عاد بالاحقاف وھی رمال بین عمان و حضر موت - عرب کے نقشہ میں جو ریگستان پچاس درجہ طول اور بیس درجہ عرض پر واقع ہے وہ جگہ الاحقاف ہے جہاں قوم عاد آباد تھی -

یہ قوم عاد اولیٰ کہلاتی ہے جس کی نسبت قرآن مجید میں کہا گیا ہے - " و انہ اھلک عاد الاولیٰ " (سورہ نجم آیت ۵۱) ثمود جس کا ذکر آگے آوے گا وہ عاد ثانی کہلاتا تھا اور ایک تیسرا عاد ہے جو عبد شمس یعنی سبا اکبر کی اولاد میں ہے اور جس کا بیٹا شداد ہے جو سنہ ۲۰۹۲ دنیوی میں پیدا ھوا تھا پہلی دونوں قومیں عاد کی حضرت ابراھیم سے پہلے تھیں اور تیسری قوم حضرت ابراھیم کے زمانہ میں - ھمارے مفسروں نے علاوہ اُن لغو قصوں کے جو قوم عاد کی نسبت لکھے ھیں ایک اور غلطی یہ کی ہے کہ ان تینوں قوموں کے واقعات کو گڈ مڈ کر دیا ہے -

قوم عاد اولیٰ کا واقعی زمانہ بتلانا نہایت مشکل ہے مگر انگریزی مورخوں نے جو توریت میں بیان کیے ھوئے حساب کے زمانے قائم کیے ھیں اُسی حساب کی بنا پر ھم بیان کرتے ھیں کہ سام ۱۵۵۸ دنیوی میں پیدا ھوا تھا اور ارفکسد جو آرام کا بھائی ہے ۱۶۵۸ دنیوی میں یعنی سو برس بعد پس یہی زمانہ قریباً آرام کی پیدائش کا خیال ھو سکتا ہے اور عاد دو پشت بعد آرام سے ہے پس اگر ساٹھ برس دو پشت کے لیے ھم اضافہ کریں تو ظاھر

هوتا ہے کہ عاد ۱۷۱۸ دنیوی یعنی اٹھارھویں صدی دنیوی میں هوا تها ۔

هود جن کا نام توریت میں عیبر لکھا ہے وہ بهی اولاد سام بن نوح سے هیں عیبر کی پیدائش توریت کے حساب سے ۱۷۲۳ دنیوی کی ہے اور اس سے ثابت ہے کہ عاد اور هود ایک هی زمانه میں تھے اسی صدی میں نمرود نے بابل یا سریا میں بادشاهت قائم کی تهی اور حام پدر مصریم نے مصر میں اور عاد بن عوص نے الاحقاف میں اور عیبر یعنی هود کے بیٹے یقطان نے یمن اور اُس کے اطراف میں ۔ حضر موت یقطان کا ایک بیٹا تها جس کے نام سے یمن کے قریب کا وہ ملک جو انڈین اوشن یا بحر عرب کے کناره پر ہے مشهور ہے ۔

یه قوم عاد اولٰی کی نهایت قوی اور قد آور تهی جیسے که اب بهی بعض ملکوں کے لوگ قوی اور قد آور هوتے هیں یهی بات خدا تعالٰی نے اس قوم کی نسبت فرمائی ہے " و زادکم فی الخلق بصطة (سوره اعراف ٦٧) اُن کے قد معمولی قد آور آدمیوں سے زیاده نه تھے ۔ تفسیروں میں جو یه بات لکھی ہے که چھوٹے سے چھوٹا آدمی اُن میں کا ساٹھ ذراع کا لمبا تها اور اوسط آدمی سو ذراع کا لمبا تها اور لمبے سے لمبا چار سو ذراع کا محض غلط ہے ۔ نه قرآن مجید سے یه ثابت ہے نه اور کسی سند سے ۔ قدیم علماء نے بهی اس سے انکار کیا ہے ۔ تفسیر کبیر میں لکھا ہے که ۔ وقال قوم یحتمل ان یکون المراد من قوله وزادکم فی الخلق بصطة کونهم من قبیلة واحدة متشارکین فی القوة والشدة و الجلادة و کون بعضهم محبا للباقین ناصر الهم و زوال العداوة و الخصومة من بینهم فانه تعالٰی لما خصهم بهذه الانواع من الفضائل و المناقب فقد قرر

لھم حصولھا فصح ان یقال و زادکم فی الخلق بسطة (تفسیر کبیر) یعنی عالموں نے " زادکم فی الخلق بصطة " سے اُن کا زیادہ وہ قوی ہونا مراد لیا ہے نہ لمبا قد ہونا ۔ بعض عالموں نے ان لفظوں سے یہ مراد لی ہے کہ اس قوم کے لوگ کثرت سے تھے اور آپس میں محبت رکھتے تھے اور ایک دوسرے کے مددگار ہوتے تھے اور اس ارتباط کے سبب سے گویا ایک جسم ہو گئے تھے نہ یہ کہ اُن کے قد بہت لمبے تھے اور وہ تمام دنیا کے لوگوں سے زیادہ چوڑے چکلے تھے ۔

سورۃ الفجر میں خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے " الم ترکیف فعل ربک بعاد ارم ذات العماد التی لم یخلق مثلھا فی البلاد ۔

اس آیت میں بھی اسی قوم عاد اولیٰ کا تذکرہ ہے ۔ ارم عاد کے دادا کا نام ہے جو کہ متعدد قومیں عاد کے نام سے مشہور تھیں جیسے کہ ہم نے اوپر بیان کیا اسی لیے خدا تعالیٰ نے ایک جگہ اس قوم کو عاد اولیٰ کر کے بیان کیا اور اس جگہ اس کے دادا کے نام سے ۔ پس ارم بیان ہے یا بدل ہے لفظ عاد سے یعنی ارم کی اولاد والا ۔ عاد ذات العماد سے بھی اسی طرح اُن کا قوی اور قد آور ہونا بتایا ہے جیسے کہ لفظ زادکم فی الخلق بسطة سے بتایا ہے ۔ لفظ لم یخلق مثلھا فی البلاد سے صاف پایا جاتا ہے کہ عاد سے اُن کے مخلوق قد مراد ہیں نہ کسی مکان کے مصنوعی ستون ۔ چنانچہ اکثر تفسیروں میں اور نیز تفسیر کبیر میں ہے اسی کے مطابق علماء و مفسرین کے اقوال نقل کیے ہیں مگر اس کے سوا اور قول بھی ہیں جن میں غلطی سے ارم کو شہر کا نام سمجھا ہے اور " ذات العماد " سے عمارات رفیعہ مراد لی ہے اور یہ محض غلط ہے اس لیے کہ قوم عاد اولیٰ

ریگستان میں رہتی تھی اور آن کی کوئی عالی شان عمارتیں نہ تھیں ۔ بعض عالموں نے غلطی پر غلطی یہ کی ہے کہ ارم کو باغ تصور کیا ہے اور لکھا ہے کہ عدن کے پاس شداد نے بنایا تھا مگر یہ محض نا واقفیت سے لکھا ہے شداد کے باپ کا نام بھی عاد ہے مگر وہ آس زمانہ میں نہ تھا اور نہ اس نے کوئی ایسا باغ جیسا کہ مفسرین بیان کرتے ہیں بنایا تھا ۔

بعض مفسرین کی یہ رائے ہے کہ قوم ارم خیموں میں رہتی تھی اور خیموں میں ضرور ہے کہ عماد یعنی استا دے ہوں جن پر خیمے کھڑے ہوتے ہیں اور عمد کی جمع عماد آئی ہے مگر اس رائے سے یہ الفاظ قرآن مجید کے کہ ''لم یخلق مثلها فی البلاد'' مساعدت نہیں کرتے ۔ رورنڈ فارسٹر نے ایک تاریخانہ جغرافیہ عرب کا لکھا ہے اور آس میں نویری کے تاریخانہ جغرافیہ سے بعض حالات نقل کیے ہیں ۶۶۰ عیسوی اور ۶۷۰ عیسوی کے درمیان یعنی مطابق ۴۰ھ و ۵۰ ھجری کے معاویہ ابن ابی سفیان کے عہد حکومت میں عبدالرحمان یمن کا حاکم تھا آس نے چند کتبے قدیم زمانہ کے یمن و حضر موت کے نواح کے کھنڈرات میں پائے تھے اور پڑھے گئے تھے اور لوگوں نے خیال کیا تھا کہ یہ کتبے قوم عاد کے زمانہ کے ہیں ۔ آن کا عربی ترجمہ تویری کے جغرافیہ میں مندرج ہے آن میں سے چند کتبوں کے ترجموں کو آس کتاب سے ہم اس مقام پر لکھتے ہیں :

ترجمہ کتبہ اول مندرجہ جغرافیہ نویری

غنینا زمانا فی عراصة ذا القصر
بعیش غیر ضنک ولا نذر
یفیض علینا البحر بالمد زاجرا
فانهارنا مبزعة یجر

خلال نخيل باسقات نواطرها
نفق بالقسب المجزع و التمر
نصطاد صيد البر بالخيل والقنا
و طور انصيد النون من لجبح الجر
و نرفل فى الخز المرقم تارة
و فى القزاحيانا و فى الحلل الخضر
يلينا ملوک يبعدون عن الخنا
شديد على اهل الخيانه والعذر
يقيم لنا من دين هود شرايعا
و نوسن بالا يات و البعث و النشر
اذا ما عدو حل ارضا يريد نا
بزرنا جميعا بالمثقفة السمر
نحاسى على اولادنا و نسائنا
على الشهب والكميق المنيق والشقر
نقارح من يبغى علينا و يعتدى
با سيافنا حتى يولون يالدبر

دوم ـ ترجمه كتبه مندرجه جغرافيه نويرى

غنينا بهذ القصر و هو افلم يكن
لنا همة الا البلد ذو القطف
تروح علينا كل يوم هنيدة
من الابل يعشق فى معاطننا الطرف
و اضعاف تلک الابل شاء كانها
من الحسن ارام او البقر القطف
فعشنا بهذا القصر سبعة احقب
با طيب عيش جل عن ذكره الوصف

فجات سنون مجدبات قواحل
اذا ماسضا علم اتی اخر یقفو
فظلنا کان لم تغن فی الخیرلمحة
فما تواو لما یبق خف ولا ظلف
کذالک من لم یشکر اللہ لم یزل
معالمه من بعد ساحته تعفو

سوم ـ کتبه مندرجه کتاب ابن هشام

قال ابن هشام حضر السیل عن قبر بالیمن فیه امراة فی عنقها سبع مخانق من برو فی یدیها و رجلیها من الا سورة و الخلاخیل والد ما لیج سبعة سبعة و فی کل اصبع خاتم فیه جوهرة مثمنة و عندراسها تابوت ـ مملوما لا و لوح فیه مکتوب ـ

باسمک اللهم اله حمیر

انا تاجة بنت ذی شفر بعثت مایرنا الی یوسف
فابطا علینا فبعثت لا ذتی
بمد من ورق لتا تینی بمد من طحبن
فلم تجده فبعثت بمدمن ذهب
فلم تجده فبعثت بمدمن بحری
فلم تجده زامرت به فطحن
فلم انتفع به فاقتفلت
فمن سمع بی فلیر حمنی
و اية امراة لیست حلیامن حلیي
فلا ماتت الا میتتی

۱۸۳۴ء میں سرکار انگریزی نے یمن کی پیمائش کے لیے کچھ افسر بھیجے اُنھوں نے حضرموت میں جو سمندر کے کنارے پر ہے

ایک پہاڑ پر ایک قلعه کے کھنڈرات معلوم کیے اور ان کھنڈرات میں پتھر پر کھدے ہوئے کتبے دیکھے تحقیق سے معلوم ہوا که وہ قلعه حصن غراب کے نام سے مشہور ہے (طول بلد ۴۸ درجه ۳۰ دقیقه اور عرض بلد ۱۴ درجه) ۔ وہاں ایک اونچی جگه پر ایک کتبه ملا ۔ پرانے حرفوں میں پتھر پر کھدا ہوا جو حرف که کوفی حرفوں سے بھی بہت پہلے کے ہیں اور اس سے کسی قدر نیچے ایک اور کتبه پایا اور ایک پہاڑی کی چوٹی پر ایک اور چھوٹا سا کتبه ملا ۔ علاوہ اس کے حصن غراب سے پچاس میل کے فاصله پر اور کھنڈرات ملے ۔ نقب الحجر کے نام سے اور اس کے دروازہ پر ایک کتبه ملا ان کتبوں کی بعینه نقل کر لی گئی ۔

ان کتبوں کی تحقیقات ہوتی رہی جب وہ پڑھے گئے تو معلوم ہوا که نویری کے جغرافیه میں جو کتبه ہے وہ ترجمه ہے حصن غراب کے بڑے کتبه کا چناں چه اصلی کتبه کا ترجمه انگریزی میں کیا گیا جس کا اردو ترجمه ہم اس مقام پر لکھتے ہیں ۔

ترجمه حصن غراب کے بڑے کتبه کا

ہم رہتے تھے رہتے ہوئے مدت سے عیش و عشرت میں زمانه میں اس وسیع محل کے ہماری حالت بری تھی مصیبت اور بدبختی سے بہتا تھا ہمارے تنگ راسته میں ۔

سمندر زور سے لہراتا ہوا اور غصه سے ٹکراتا ہوا ہمارے قلعه سے ۔ ہمارے چشمے بہتے تھے ۔ گنگناتی ہوئی آواز سے گرتے تھے ۔

کھجور کے بلند درختوں سے اوپر جن کے رکھوالے کثرت سے بکھیرتے تھے خشک کھجور (یعنی ان کی گٹھلیاں) ہماری گھاٹی کی کھجور کی زمین میں وہ اپنے ہاتھ سے پھیلاتے تھے سوکھے چانول (یعنی بوتے تھے) ۔

ہم شکار کرتے تھے پہاڑی بکروں کو اور نیز خرگوش کے

بچوں کو بہاڑیوں رسیوں اور سر کنڈوں سے بھگا کر ہلاتے تھے جھگڑتی ہوئی مچھلیوں کو ۔

ہم چلتے تھے آہستہ مغرور چال سے پہنے ہوئے سوئی کے کام کیے ہوئے مختلف رنگ کے ریشمی کپڑے بالکل ریشم کے کاھی سبز رنگ کی چارخانہ دار پوشاک ۔

ہم پر حکومت کرتے تھے بادشاہ جو بہت دور تھے ذلت سے اور سخت سزا دینے والے تھے بدکار اور منکبر آدمیوں کے اور انھوں نے لکھی ہمارے واسطے مطابق اصول ہود کے ۔

عمدہ فتوی ایک کتاب میں محفوظ رہنے کے لیے اور ہم یقین کرتے تھے معجزہ کے بھید میں مردوں کے بھید میں اور ناک کے سوراخ کے بھید میں ۔

ایک حملہ کیا لٹیروں نے اور ہم کو ایذا پہنچاتے ہم اور ہمارے فیاض نوجوان جمع ہو کے سوار ہو کر چلے معہ سخت اور تیز نوکدار برچھیوں کے آگے کو جھپٹتے ہوئے ۔

مغرور اور بہادر حمایتی ہمارے خاندانوں اور ہماری بیویوں کے لڑتے ہوئے دلیری سے گھوڑوں پر سوار جن کی لمبی گردنیں تھیں اور جو سمندر اور لوھیا رنگ اور سرنگ تھے ۔

ہم اپنی تلواروں سے زخمی کرتے ہوئے اور چھیدتے ہوئے اپنے دشمنوں کو یہاں تک کہ دھاوا کر کے ہم نے فتح کیا اور کچل ڈالا ان ذلیل آدمیوں کو ۔

ترجمہ اس کتبہ کا جو اس کتبہ کے نیچے کھدا ہوا ہے

علیحدہ حصوں میں تقسیم کیا گیا اور لکھا گیا ۔ سیدھے ہاتھ سے الٹے ہاتھ کی طرف اور نقطہ لگے ہوئے یہ گیت فتح کا سرش

اور زرغانے عوص نے چھید ڈالا (یعنی زخمی کر دیا) اور تعقب کیا بنی عک کا اور اُن کے چہروں کو سیاهی سے بھر دیا ۔

ترجمه چھوٹے کتبه کا جو پہاڑی کی چوٹی پر ھے

دشمن کی سی نفرت سے گناه گار آدمیوں پر ۔
هم نے حمله کیا آگے کو دوڑا کر اپنے گھوڑوں کو اُن کو پاؤں کے نیچے روند ڈالا ۔

ترجمه کتبه کا جو نقب الحجر کے دروازه پر ھے

رهتے تھے اس محل میں اب (ابو) محارب اور بحثه جب که یه ابتداء میں تیار هوا رهتے تھے اُس میں خوشی سے فرزندانه اطاعت کے ساتھ نواس اور ونیا حاکم اعلیٰ حربحل مالک محل کا جس نے فیاضی سے بنایا کاروان سرائے اور کنؤاں ۔ ۔ ۔ ۔ اُس نے نیز بنایا عبادت خانه فؤاره اور تالاب اور بنایا زمانه اپنے عهد میں ۔

ریورنڈ فاسٹر نے اس بڑے کتبه کے نیچے جو کتبه ھے اُس میں عک کا نام دیکھ کر اس کتبه کا زمانه قرار دینے پر توجهه کی اور کہا که عک بیٹا تھا عدنان کا اور مسلمانوں کی حدیث کے مطابق جو ام سلمه سے منقول ھے عدنان حضرت اسماعیل کی چوتھی پشت میں تھا پس اس حساب سے که ایک پشت کا زمانه تیس برس لگایا جاوے تو عک یعقوب کی زندگی کے اُس زمانه میں هوگا جب که یوسف بھی موجود تھے اور قریب پچاس برس کے قبل اُس وقت کے جب که مصر اور اُس کے قرب و جوار کے ملکوں میں قحط هوا تھا ۔

ریورنڈ فاسٹر لکھتے هیں که یوسف کی تاریخ سے هم کو معلوم هوتا ھے که اُس زمانه میں اسماعیل کی اولاد مختلف فرقوں اور قوموں میں منقسم هو کر پھیل گئی تھی اور نویری کے جغرافیه میں جو

دوسرا کتبہ ہے اُس سے قحط کا حال معلوم ہوتا ہے جس میں وہ قوم تباہ ہو گئی ۔ ان وجوہ سے وہ ان کتبوں کو یعقوب علیہ السلام کے زمانہ کا قرار دیتے ہیں ۔

جب کہ ریورنڈ فاسٹر نے یہ تسلیم کر لیا کہ یہ کتبے قوم عاد کے ہیں جس کا قرآن مجید میں ذکر ہے اور اُن کا زمانہ اُنھوں نے حضرت یعقوب کے زمانے کے مطابق قرار دیا تو اب وہ قرآن مجید پر گویا دو اعتراض کرتے ہیں ایک یہ کہ قوم عاد کا نوح کی قوم کے بعد ہونا جیسا کہ قرآن مجید میں بیان ہوا ہے کہ '' اذ جعلکم خلفاء من بعد قوم نوح '' صحیح نہیں ہے دوسرے یہ کہ کتبہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگ اپنے بادشاہوں کے قوانین پر عمل کرتے تھے اور حضرت ہود کا اُن لوگوں میں جانا جیسا کہ قرآن مجید میں بیان ہوا ہے کہ '' و الی عاد اخاھم ھودا '' ثابت نہیں ہوتا ۔

مگر یہ دونوں اعتراض جیسے عجیب ہیں ویسے غلط بھی ہیں ۔ اول یہ کہ قوم عاد اولٰی جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے وہ یمن یا حضرموت میں نہیں بستی تھی ۔ یمن و حضرموت و حویلہ میں خود حضرت ہود کی اولاد بستی تھی اور حضرموت اور حویلہ اورسبا جن کے نام سے اب تک وہ مقامات مشہور ہیں حضرت کے پوتے تھے اور یقطان ابن عیبر یعنی ہود وہاں جا کر بسے تھے پس اُنھوں نے جو ان کتبوں کو عاد کی قوم کے کتبے قرار دیے ہیں یہ محض غلطی ہے ۔

دوسرے یہ کہ جو زمانہ ان کتبوں کا ریورنڈ فاسٹر نے قرار دیا ہے وہ بھی غلط ہے ۔ ام سلمہ کی روایت جس کی بناء پر ریورنڈ فاسٹر نے عدنان کو حضرت اسماعیل کی چوتھی پشت میں قرار دیا ہے وہ روایت ہی غلط اور محض نا معتبر و بے سند ہے

صحیح نسب نامه کے بموجب جو برخیا کاتب وحی ارمیا نبی نے لکھا ھے (دیکھو خطبات احمدیه) اس کے مطابق عدنان باپ معد و عک کا اکتالیسویں پشت میں حضرت ابراھیم سے تھا حضرت ابراھیم بموجب حساب مندرجه توریت کے ۲۰۰۸ دنیوی میں پیدا ھوئے تھے پس جو حساب نسلوں کے پیدا ھونے کا ھے اس حساب سے عک قریباً ۳۴۰۰ دنیوی میں ھوگا یعنی چوده سو برس بعد حضرت ابراھیم کے اور کتبه میں عک پر فتح یابی نہیں لکھی ھے بلکه بنی عک پر لکھی ھے جس سے ثابت ھوتا ھے که عک کی بھی کئی پشت کے بعد کا ھے -

نویری کے دوسرے کتبه کو جس میں قحط کا ذکر ھے مسٹر فاسٹر پہلے کتبه کا تتمه سمجھتے ھیں تا که پہلے کتبه کو بھی یعقوب و یوسف کے زمانے کا قرار دیں - مگر وه اصلی کتبه دستیاب نہیں ھوا اور نه یه معلوم ھے که وه کہاں تھا نه یه معلوم ھے که کس خط میں تھا پس کوئی دلیل نہیں ھے که نویری کے پہلے اور دوسرے کتبه کو ایک زمانه کا قرار دیا جائے -

کچھ عجب نہیں که یه کتبے قوم حمیر کے ھوں جس میں سلاطین نام دار اور با وقار گذرے ھیں - یقطان ابن عیبر یا ابن ھود یمن میں آباد ھوا اس کا بیٹا سبا تھا اور سبا کا بیٹا حمیر اس کی اولاد میں بڑے بڑے بادشاه گذرے ھیں اور اسی کی اولاد کی سکونت حضرموت میں تھی جو اس کے ایک بیٹے کے نام سے مشہور ھے پس یه کتبے قوم حمیر کے ھو سکتے ھیں نه قوم عاد کے - اس کی تائید اس کتبه سے ھوتی ھے جس کا ذکر ابن ھشام نے کیا ھے - جو اطراف یمن کی ایک قبر میں سے نکلا ھے - کیونکه اس کے شروع میں لکھا ھے "باسمک اللھم اله حمیر" اور یه ایک ایسا ثبوت ھے جس سے قوم حمیر کے کتبه ھونے سے

انکار ھی نہیں ھو سکتا ۔

حصن غراب کے چھوٹے کتبه میں بلا شبه بنی عک پر فتح پانے کا ذکر ھے عک جو حضرت اسماعیل کی اولاد میں سے تھا اور جن کا مسکن حجاز میں تھا معلوم ھوتا ھے کہ اس کی اولاد یعنی بنی عک نے کسی زمانه میں یمن پر یا حضرموت پر حمله کیا ھوگا زمانه کے حساب سے معلوم ھوتا ھے که یه واقعه اُس زمانه میں ھوا جس زمانه میں که بخت نصر نے مصر اور عرب پر حملے کئے تھے اُس حمله میں بنی عک کو شکست ھوئی ھوگی جس کا ذکر اس کتبه میں ھے ۔

حصن غراب کے بڑے کتبه سے جو اب موجود ھے نہایت استحکام سے قرآن مجید کے اس تاریخی واقعه کا ثبوت ھوتا ھے که خدا تعالیٰ نے عرب میں ھود پیغمبر کو لوگوں کی ھدایت کے لیے مبعوث کیا تھا اور بعث و نشر کے عقاید اُنھوں نے تعلیم کیے تھے اور جو که قوم حمیر اور تمام بادشاھان یمن حضرت ھود کی اولاد میں تھے اُن کے بادشاھوں نے اُن تمام عقاید کو جو حضرت ھود نے تعلیم کیے تھے اپنی کتابوں میں لکھے تھے جس پر وہ یقین کرتے تھے مگر افسوس ھے که اُن تمام عقائد کے ساتھ آخر کو اُن لوگوں میں بت پرستی بھی پھیل گئی تھی جس کو محمد رسول اللہ نبی آخر الزمان نے تمام جزیرۂ عرب سے بلکه دنیا کے بہت بڑے حصه سے معدوم کیا اور خدا کی وحدانیت کے اصول کو ایسی وضاحت اور عمدگی سے بتا دیا جس سے اُمید ھے که اُن کے پیرؤں میں بت پرستی قائم ھونی ممتنعات عقلی سے ھے اور یہی ایک امر ھے جس کے سبب ابراھیم خلیل اللہ کے پوتے اور عبداللہ کے بیٹے نے خاتم الانبیاء ھونے کا تاج پہنا اور اس کے دین نے "الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی

و رضیت لکم الاسلام دینا '' کا خطاب حاصل کیا ۔

و صلی اللہ تعالیٰ علی جدی محمد رسول اللہ وعلیٰ آلہ و انا منہم اجمعین ۔

اب ہم کو اُس عذاب کا بیان کرنا باقی ہے جو قوم عاد پر نازل ہوا تھا اور جس کا ذکر اُن آیتوں میں آیا ہے جو حاشیہ پر مندرج ہیں[1] ۔ وہ عذاب آندھی تھی جو اس ریگستان کے رہنے

۱۔ فارسلنا علیہم ریحاً صرصراً فی ایام نحسات لنذیقہم عذاب الخزی فی الحیواۃ الدنیا ولعذاب الاخرۃ اخزی و ہم لا ینصرون ۔ ۴۱ صورہ فصلت ۱۵ ۔

و اماعا دفا ہلکوا بریح صرصر عاتیۃ سخرھا علیہم سبع لیال و ثمانیۃ ایام حسوما فتری القوم فیہا صرعی کانہم اعجاز نخل خاویۃ ۔ ۶۹ سورۃ الحاقہ ۶ و ۷ ۔

فان اعرضوا فقل انذر تکم صاعقۃ مثل صاعقۃ عاد و ثمود ۔ ۴۱ فصلت ۔ ۱۲ ۔

و فی عاد اذا ارسلنا علیہم الریح العقیم ۔ ماتذر من شی اتت علیہ الاجعلتہ کالرمیم ۵۱ سورہ زاریات ۴۱ ۔ ۴۲ ۔

و انہ اہلک عاد الاولیٰ ۔ ۵۳ ۔ سورۃ النجم ۵۱ ۔

'' کذبت عاد فکیف کان عذابی و نذر ۔ انا ارسلنا علیہم صرصرا فی یوم نحس مستمر ۔ تنزع الناس کانہا اعجاز نخل منقعر ۵۴ سورۃ القمر ۱۸ و ۱۹ و ۲۰ ۔

واذکرا خا عاد اذا انذر قومہ بالاحقاف و قد خلت النذر من بین یدیہ و من خلفہ الاتعبدوا الا اللہ انی اخاف علیکم عذاب یوم عظیم قالو اجتنا لتا فکنا عن آلہتنا فاتنا بماتعدنا ان کنت من الصادقین ۔ قال انما العلم عند اللہ ابلغکم ما ارسلت بہ ولکنی اراکم قوما تجہلون ۔ فلما راوہ عارضا مستقبل اودیتہم قالوا ہذا عارض ممطرنا بل ہو ما استعجلتم بہ ریح فیہا عذاب الیم ۔ تدمرہ کل شی بامر ربہا فاصبحوا الا یری الامساکنہم کذالک نجزی المجرمین ۔ ۴۶ ۔ سورۂ احقاف ۱۰ ۔ لغایت ۲۴ ۔

لوں پر نازل ہوئی تھی آٹھ دن اور سات رات برابر آندھی
ی اور بخوبی یہ بات خیال میں آ سکتی ہے کہ جب ایسی آندھی
گستان کے ملک میں چلی جو گرم ملک تھا اور جس میں نہایت
خت لو کی بھی کیفیت ہوگی تو وہاں کے رہنے والوں کا کیا
ل ہوا ہوگا ۔ بے شک اُن کی لاشیں ایسی ہی پڑھی ہوں گی کہ
یا درخت جڑ سے اکھڑ کر گر پڑے ہیں جس کی تشبیہ خدا نے
ہے "کانہم اعجاز نخل منقعر ۔ کانہم اعجاز نخل
اویہ" لوکی گرمی کے مارے اُن کے بدن بھگڑی ہوکر بکس گئے
ں گے جیسے نو زدہ انسان کا بدن ہو جاتا ہے جس کی تشبیہ خدا
اس طرح پر دی ہے کہ "ما نذر من شئی اتت علیہ
جعلتہ کالرمیم" ۔

ارفسکد بن سام کی اولاد میں حضرت ہود تھے اور آرام بن سام
اولاد میں عاد اور قوم عاد تھی اسی وجہ سے خدا نے حضرت ہود
قوم عاد کا بھائی کہا ۔ حضرت ہود احقاف میں گئے جہاں قوم
بستی تھی اور بت پرستی کرتی تھی ۔ تین بت تھے جن کو وہ
تے تھے ۔ حضرت ہود نے اُن کو بت پرستی سے منع کیا اور
ا کہ سوائے خدا کے اور کسی کی عبادت مت کرو ۔ مجھ کو
ہے تم پر کسی دن سخت عذاب آوے گا ۔ اُن لوگوں نے
کہ کیا تم اس لیے آئے ہو کہ ہمارے خداؤں کو ہم سے
ا دو اور جس عذاب سے تم ڈراتے ہو اُس کو لاؤ اگر تم
ہو ۔ حضرت ہود نے کہا اس کا علم تو خدا کو ہے میں
خدا کا پیغام تم تک پہنچا دیتا ہوں ۔ ایک دن انھوں نے دیکھا
ان کے ریگستان کی طرف کچھ گھٹا سی چلی آتی ہے انھوں نے
کیا بادل ہے جو خوب برسے گا مگر وہ نہایت سخت آندھی تھی
نے سب چیز کو اکھیڑ کر پھینک دیا ۔

یہ تو قصہ قوم عاد کے عذاب کا ہے مگر جو بحث کہ اس واقع پر اور مثل اس کے دیگر واقعات ارضی و سماوی پر ہو سکتی ہے جن کو قرآن مجید میں کسی قوم کی معصیت کے سبب سے اُس واقعہ کا بطور عذاب کے اُس قوم پر نازل ہونا بیان ہوا ہے غور طلب ہے - آندھی اور طوفان - پہاڑوں کی آتش فشانی اُن سے ملکوں کا اور قوموں کا برباد ہونا زمین کا دھنس جانا قحط کا پڑنا کسی قسم کے حشرات کا زمین میں پانی میں ہوا میں پیدا ہو جاتا کسی قسم کے وباؤں کا آنا اور قوموں کا ھلاک ہونا سب امور طبعی ہیں جو اُن کے اسباب جمع ہو جانے پر موافق قانون قدرت کے واقع ہوتے رہتے ہیں انسانوں کے گنہگار ہونے یا نہ ہونے سے فی الواقع اس کو کچھ تعلق نہیں ہے اگرچہ توریت میں اور دیگر صحف انبیا میں اس قسم کے ارضی و سماوی واقعات کا سبب انسانوں کے گناہ قرار دیے ہیں جو مثل ایک پوشیدہ بھید کے سمجھ سے خارج ہے اُس سے ہم کو اس مقام پر بحث نہیں ہے - مگر قرآن مجید میں بھی ایسے واقعات کو انسانوں کے گناہوں سے منسوب کرنا بلاشبہ تعجب سے خالی نہیں ہے -

اس قسم کے شبہے بلاشبہ انسان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں اور وہ شبہات بے شک اصلی ہوتے ہیں کیوں کہ حوارث ارضی و سماوی حسب قانون قدرت واقع ہوتے ہیں - اُن کو انسانوں کے گناہوں سے کچھ تعلق نہیں ہوتا اور نہ انسانوں کے گناہ اُن حوادث کے وقوع کا باعث ہوتے ہیں مگر ان شبہات کے پیدا ہونے کا منشاء یہ ہے کہ لوگ حقیقت نبوت اور اُس کی غایت کے سمجھنے میں پہلے غلطی کرتے ہیں اور پھر اُس غلطی کی بناء پر اُس شبہ کو قائم کرتے ہیں - نبوت ہمیشہ فطرت کے تابع ہوتی ہے - اُس کا مقصد حقائق اشیاء کو علے ما ھی علیه بیان کرنا نہیں ہوتا بلکہ

اُس کی غایت تہذیب نفس ھوتی ھے پس جو امور کہ کسی قوم میں یا انسان کے خیال میں ایسے پائے جاتے ھیں جو موید تہذیب نفس کے ھیں گو کہ وہ مطابق حقائق اشیاء علٰی ما ھی علیہ کے مذھوں تو انبیا اُس سے کچھ تعرض نہیں کرتے بلکہ وہ اس کو بلا لحاظ اس بات کے کہ وہ مطابق حقیقت اشیاء علٰی ماھی علیہ کے ھے یا نہیں بطور ایک امر مسلمہ مخاطب کے تسلیم کر کے لوگوں کو ھدایت کرتے ھیں اُس کی مثال ایسی ھے جیسے کہ ایک شخص بحث کرنے والا اپنے مخالف کے امر مسلمہ کو باوجودیکہ وہ اس کو صحیح نہ جانتا ھو تسلیم کر کے مخالف ھی کے امر مسلمہ سے مخالف کو ساکت کرنا چاھے پس ایسے موقع پر یہ سمجھنا کہ جو کچھ انبیاء نے تسلیم کیا یا اُس کو اپنے مقصد کے لیے کام میں لائے اُسی کے مطابق حقائق اشیاء بھی ھیں یہ پہلی غلطی ھے اور یہی غلطی باعث اس قسم کے شبہات کے پیدا ھونے کی ھوتی ھے - مثلاً مثلاً لوگ یقین کرتے تھے کہ خدا نے چھ دن میں زمین و آسمان پیدا کیے اُسی کی عبادت کرو اس بیان سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اُس پیغمبر کا بیان نسبت چھ دن میں آسمان و زمین کی پیدائش کے بطور بیان حقیقت اشیا ماھی علیہ کے ھے سخت غلطی ھے کیوں کہ اُس پیغمبر نے اس قوم کے امر مسلمہ ھی کو تسلیم کر کے آسمان و زمین کے پیدا کرنے والے کے استحقاق عبادت کو ثابت کیا ھے -

انسان کی ابتدائی حالت کی فلاسفی پر غور کرنے سے جو وحشی قوموں کی حالت یا وحشی زمانہ سے شروع ھوتی ھے ثابت ھوتا ھے کہ جس طرح انسان کے دل میں اپنے سے زیادہ قوی و زبردست اشیا کو اپنے گرد دیکھ کر کسی وجود قوی کا جس کو انھوں نے خدا تسلیم کیا خیال آیا ھے اُسی کے ساتھ ساتھ اُس کے

خوش رکھنے کے لیے اُسی کی عبادت کا بھی خیال ھوا ھے اور اسی کے ساتھ یہ خیال بھی پیدا ھوا ھے کہ دنیا میں جو مصیبتیں آتی ھیں وہ اُس کی خفگی کے اور انسانوں کے افعال سے ناراض ھو جانے کے سبب آتی ھیں - پس یہ خیال کہ تمام آفات ارضی و سماوی انسانوں کے گناھوں کے سبب سے ھوتی ھیں ایک ایسا خیال تھا جو تمام انسانوں کے دلوں میں بیٹھا ھوا تھا اور اس زمانہ میں بھی جاھل قوموں کے دلوں میں ویسی ھی مضبوطی سے جما ھوا ھے - یہ خیال خواہ وہ حقیقت اشیاء علیٰ ما ھی علیہ کے مطابق ھو یا نہ ھو ایک ایسا خیال ھے جو تہذیب نفس انسانی کا نہایت موید ھے اور بہ موجب اُس اصول فطرت کے جس کے تابع انبیا علیہم السلام ھوتے ھیں - اُن کو ضرور تھا کہ اس امر مسلمہ کو تسلیم کر کے لوگوں کو تہذیب نفس کی ھدایت کریں - پس قرآن مجید کے اس قسم کے بیانات کو جن میں حوادث ارضی و سماوی کو انسان کے گناھوں سے منسوب کیا ھے یہ سمجھنا کہ وہ ایک حقیقت اشیا علیٰ ماھی علیہ کا بیان ھے اُن سمجھنے والوں کی غلطی ھے نہ قرآن مجید کی -

یہ اصول جو میں نے بیان کیا ایک ایسا اصول ھے کہ اگر وہ ذھن میں رکھا جاوے تو بہت سے مقامات قرآن مجید کی اصلی حقیقت منکشف ھوتی ھے مگر یہ اصول ایسا نہیں ھے جس کو میں نے ایجاد کیا ھو اور نبوت کو ماتحت فطرت قرار دیا ھو بلکہ اور محققین علماء کی بھی یہی رائے ھے جس کا بیان بہت مختصر طور پر ”ستۃ ایام“ کے بیان میں گذرا ھے مگر شاہ ولی اللہ صاحب نے تفہیمات الٰہیہ میں اس اصول کو زیادہ تر وضاحت سے بیان کیا ھے اور شاہ ولی اللہ صاحب نے جو کچھ اس کی نسبت لکھا ھے اُس کا مطلب بالکل اُسی کے مطابق ھے جو میں نے بیان کیا گو کہ دونوں کے طرز

ادا اور طریق تقریر اپنی اپنی طرز پر جدا گانہ مذاق سے ہو۔

شاہ ولی اللہ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ :

اعلم ان النبوة من تحت الفطرة كما ان الانسان قد يدخل فی صميم قلبه و جذر نفسه علوم و ادراكات عليها تبتنی ما يقاض عليه من رويا فيری الامور مشبحة بما اخترته دون غيرها كذالک كل قوم و اقليم لهم فطرة فطروا عليها امورهم كلها كاستقباح الذبح والقول بالقدم فطرة فطر الهنود عليها و جواز الذبح و القول بحدوث العالم فطرة فطر عليها بنو سام من العرب و الفارس فانما يجی النبی يتامل فيما عند هم من الاعتقاد العمل فما كان موافقا لتهذيب النفس يثبة لهم ويرشدهم اليه وما كان يخالف تهذيب النفس فانه ينهاهم عنه وقد يحصل بعض الاختلاف من قبل اختلاف نزول الجود كما ذكر نا فی توجه المجوس الی القوی الفلكية و توجهه الحنفاء الی الملاء الاعلیٰ لا غير وكما ذكرنا فی عموم بعثت النبی و خاتمته بخلاف سائر النبوة فالنبوة سويته و تهذيبه وجعله كاحسن ما ينبغی سواء كان ذالک الشی شمعا اوطينا والفطرة والملة بمنزلة المعاد كالشمع والطين فلا تعجب باختلاف احوال الانبياء عليهم السلام واختلاف امورهم عما يتعلق بالمادة فاصل النبوة تهذيب النفس باعتقاد تعظم الله والتوجه اليه و كسب ماينجی من عذاب الله فی الدنيا والاخره واما مجازات السيئة ففی الدورة الاولیٰ كان لا يتوقف علی معرفة البعث بعد الموت ولا الملئكة و فی الدورة الاخری توقف علی ايمان بالله بالصفات التعظميه والملائكه

وکتبه و رسله والایمان بالبعث بعد الموت امامسئلة قدم العالم و حدوثه و مسئلة التناسخ و مسئلة تحریم الذبح وحله و مسئلة الصفات الله التی من التجدد والتنقل والصفات المحدثة کالروية والنزول والارادة المتجددة والبداء وغیر ذالک فانها کلها من الفطرة والمادة لیست ببحث عن ذالک بالاصالة ۔ (تفہیمات)

یعنی یہ بات جان لینی چاہیے کہ نبوت فطرت کے ماتحت ہے جیسا کہ انسان کے کبھی دل میں بہت سے علوم اور باتیں جم کر بیٹھ جاتی ہیں اور اُنھی پر مبنی ہوتی ہیں وہ چیزیں جو اُس پر اُس کے رویا میں فائض ہوتی ہیں پھر وہ اُن چیزوں کی صورتوں کو دیکھتا ہے جس کو اس نے پیدا کیا ہے اور نہ اس کے سوا اور کسی کو ایسے ہی ہر ایک قوم اور اقلیم کی ایک فطرت ہے جس پر اُس کی سب باتیں پیدا کی گئی ہیں ۔ جیسے جانور کے ذبح کرنے کو برا جاننا اور عالم کو قدیم کہنا یہ ایک فطرت ہے کہ فطرت ہنود کی اس پر ہے اور ذبح جانور کو جائز ماننا اور عالم کو حادث کہنا فطرت ہے جس پر بنی سام یعنی عرب اور فارس مخلوق ہوئے ہیں نبی جو آیا کرتا ہے وہ ان کے علوم اور اعتقادات اور اعمال میں تامل کیا کرتا ہے جو اُن میں سے موافق تہذیب نفس کے ہوتا ہے اس کو ثابت رکھتا ہے اور ان کو وہی راہ چلاتا ہے اور جو کہ تہذیب نفس کے خلاف ہو اُس سے منع کرتا ہے اور کبھی کچھ اختلاف ہو جاتا ہے بوجہ اختلاف فیض الٰہی جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے بیچ معاملہ متوجہ ہونے مجوس کے قوائے فلکیہ کی جانب اور متوجہ ہوئے حنفا کے ملاء اعلیٰ کی جانب اور جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے بعثت نبی کے عام ہونے اور خاتم النبیین کے بیان میں بخلاف اور نبیوں کے پس نبوت اُس فطرت کا درست اور

آراستہ کرتا ہے اور اس کو درست کرتا جس قدر اُس کا عمدہ تر ہونا ممکن ہے خواہ وہ شے موم ہو خواہ گارا فطرت مذہب کے لیے بمنزلہ مادہ کے ہے مثل موم اور گوندھی مٹی کے پس تعجب نہ کرنا چاہیے اختلاف احوال دنیا سے اور ان کے اس اختلاف سے جو اُن امور سے متعلق ہیں جو بمنزلہ مادہ کے ہے پس اصل نبوت تہذیب نفس کی ہے اللہ تعالیٰ کی عظمت کے اعتقاد سے اور اُس کی طرف متوجہ ہونے سے اور اُن امور کے کرنے سے جو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے دنیا اور آخرت میں بچاوے برائی کا بدلہ پہلے زمانہ میں اس پر موقوف نہ تھا کہ مرنے کے بعد اٹھنے کو جانیں اور پچھلے زمانہ میں اس پر موقوف ہے کہ اللہ پر ایمان لاویں اور اُس کی صفات تعظیمیہ پر اور فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے سب رسولوں پر اور مرنے کے بعد اٹھنے پر ایمان لاویں اور مسئلہ قدم عالم اور حدوث عالم اور مسئلہ تناسخ اور مسئلہ حرام ہونے ذبح جانور کا اور مسئلہ صفات کا جو کہ بدلتے رہتے ہیں اور صفات جو کہ حادث ہیں جیسے دیکھنا اور اُترنا اور نیا ارادہ اور ایسے ہی اور صفات پس یہ مسئلہ فطرتی ہے اور بمنزلہ مادہ کے ہے ایسے مسائل سے اصلی طور پر نبی بحث کرتا ہے۔

یہ بیان شاہ ولی اللہ صاحب کا ہماری دلیل سے بالکل مطابق ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہماری دلیل کا ماخذ یہی بیان ہے جو نہایت عالی دماغی اور بلا خوف لومتہ لایم کے شاہ صاحب نے فرمایا ہے۔

قوم ثمود

ثمود جس کے نام سے قوم ثمود مشہور ہوئی جثر بن آرام بن سام بن نوح کا بیٹا ہے اور عاد اولیٰ اور ہود کا ہمعصر ہے حضرت صالح پیغمبر اُس کی چھٹی پشت میں ہیں اور اسی لیے زمانہ حضرت

صالح کا اخیر آنیسویں یا شروع بیسویں صدی دنیاوی میں اور قریباً سو برس پیشتر حضرت ابراهیم سے پایا جاتا ہے۔

قوم ثمود الحجر میں آباد تھی اور پہاڑ کو کھود کر اس میں گھر بنائے تھے تقویم البلدان میں اسماعیل ابو الفدا نے ابن حوقل کا قول نقل کیا ہے کہ وہ ان پہاڑوں میں گیا تھا اور اس نے آن مکانات کو دیکھا تھا جو پہاڑ کو کھود کر بنائے تھے افسوس ہے کہ سلاطین اسلامیہ نے اس طرح پر عرب کے قدیم حالات کی تحقیقات نہیں کی ، کچھ شبہ نہیں ہو سکتا کہ جزیرہ عرب میں بہت سی ایسی چیزیں موجود ہوں گی جن سے پرانے تاریخی حالات کی صحت پر بہت کچھ مدد مل سکتی ہے۔

عاد اولیٰ حضرت نوح سے پانچویں پشت میں تھا اور عاد اور ثمود دونوں آپس میں بھائی تھے قوم عاد کے برباد ہونے کے بعد قوم ثمود نے ترقی کی تھی جس کی نسبت خدا نے فرمایا ''و اذکروا اذ جعلکم خلفاء من بعد عاد'' اور جو کہ قوم ثمود نے قوم عاد کے بعد ترقی کی تھی اسی سبب سے ثمود کو عاد ثانی کہتے ہیں جیسے کہ نوح کو آدم ثانی۔

حضرت صالح قوم کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوئے جو واقعات کہ ان کے زمانہ نبوت میں گذرے آن کا بیان مندرجہ حسب ذیل آیتوں میں ہے۔

و الیٰ ثمود اخاهم صالحا قال یا قوم اعبدوا الله ما لکم من اله غیره قد جاء تکم بینة من ربکم هذه ناقة الله لکم آیة فذروها تاکل فی ارض الله ولا تمسوها بسوء فیاخذکم عذاب الیم - و اذکروا اذ جعلکم خلفاء من بعد عاد وبواکم فی الارض تتخذون من سهولها قصوراً و تنتحون الجبال بیوتاً فاذکروا الاء

الله ولا تعثوا فی الارض مفسدین ـ فعقروا الناقة وعتوا عن امر ربهم و اخذتهم الرجفة فاصبحوا فی دارهم جاثمین ـ (الاعراف)

قال یا قوم ارائیتهم ان کنت علی بینة من ربی و اتانی منه رحمة فمن ینصرنی من الله ان عصیة فما تزیدوننی غیر تخسیر ـ و یا قوم هذه ناقة الله لکم آیة فذروها تاکل فی ارض الله ولا تمسوها بسوء فیاخذکم عذاب قریب فعقروها فقال تمتعوا فی دارکم ثلثة ایام ذالک وعد غیر مکذوب فلما جاء امرنا نجینا صالحا والذین آمنوا معه برحمة مناومن خذی یومئذان ربک هوا لقوی العزیز و اخذ الذین ظلموا الصیحة فاصبحوا فی دارهم جاثمین ـ (١١ هود ٦٦ - ٧٠)

قالو انما انت من المسحرین ما انت الا بشر مثلنا فات بایات ان کنت من الصدقین ـ قال هذا ناقة لها شرب ولکم شرب یوم معلوم ـ ولا تمسوها بسوء فیاخذکم عذاب یوم عظیم ـ فعقروها فاصبحوا نادمین فاخذهم العذاب ان فی ذالک لایة وما کان اکثر هم موقنین ـ (٢٦ ـ الشعراء ١٥٣ - ١٥٨)

و اما ثمود فهدینا هم فاستحبو العمی علی الهدی فاخذتهم صاعقة العذاب الهون بما کانوا یکسبون ـ (٤١ ـ فصلت ١٦٠)

انا مرسلوا الناقة فتنة لهم فارتقبهم و اصطبرو نئبهم ان الماء قسمة بینهم کل شرب محتضر ـ فنادوا صاحبهم فتعاطی فعقر ـ فکیف کان عذابی و نذر ـ انا ارسلنا علیهم صیحة واحدة فکانوا کهشیم المحتظر ـ (٥٤ ـ سورة القمر ٢٧ ، ٢١)

فاما ثمود فاهلکوا بالطاغیه ۔ (۹ ۔ الحاقه ٦)

کذبت ثمود بطغوٰها ۔ اذ نبعث اشقٰها فقال لهم رسول الله ناقة الله وسقیاها فکذبوه فعقروها فدمدم علیهم ربهم بذنبهم فسوّاها ۔ (۹۱ - سورة الشمس ۱۱ - ۱۴)

ان آیتوں کا خلاصه یه ھے که حضرت صالح نے ان لوگوں سے کہا که اے میری قوم کے لوگو خدا کی عبادت کرو تمهارے لیے اس کے سوا کوئی خدا نہیں ھے اُن لوگوں نے کہا که تم تو سحر زده هو تم تو هم هی جیسے ایک آدمی هو اگر تم سچے هو تو کوئی نشانی لاؤ ۔ حضرت صالح نے کہا که تمهارے پاس ایک دلیل تمهارے پروردگار کے پاس سے آئی ھے ۔ یه الله کی اُونٹنی تمهارے لیے نشانی ھے اس کو چھوڑ دو که خدا کی زمین میں چرتی پھرے ۔ باقی رها پانی ایک دن اس کو پی لینے دیا کرو اور ایک دن تم لے لیا کرو اور اس کو کچھ برائی مت پہنچاؤ نہیں تو تم کو دکھ دینے والا عذاب پکڑ لے گا ۔ وه لوگ اُونٹنی سے تنگ آ گئے اُنهوں نے اس کو ذبح کر ڈالا یا اُس کی کونچیں کاٹ دیں که مر گئی ۔ حضرت هود نے کہا که تم تین دن اپنی جگه میں چین کر لو عذاب آنے کا وعده نہیں ٹلنے کا اُس کے بعد اُن پر یه خدا کا عذاب پڑا که بڑی گڑگڑھٹ سے اور حد سے زیاده بھونچال آیا اور وه اپنے رهنے کی جگه میں گھٹنوں کے بل گر کر مر گئے ۔

قرآن مجید میں تو یه قصه اسی قدر ھے مگر همارے مفسرین نے اس قصه کو ایک توده طوفان بنا دیا ھے ۔ جس کے لیے کوئی معتبر سند بھی نہیں ھے ۔ اُنهوں نے قرآن مجید کے ان لفظوں کو که ”فات بایة ان کنت من الصادقین“ اور ان لفظوں کو که ”قد جائتکم بینة من ربکم“ دیکھ کر یه تصور کیا

که وه آونٹنی کسی عجیب و معجز طریقه سے پیدا ہوئی ہوگی ۔ کچھ عجب نہیں که پہلے سے عرب میں اس آونٹنی کی نسبت عجیب باتیں مشہور ہوں گی مفسروں نے آن افواہی باتوں کو قرآن مجید کے آن الفاظ کے خیال سے سچ سمجھا اور تفسیروں میں لکھ دیے ۔ حالاں که اس کے لیے کوئی معتبر سند نہیں ہے ۔ آنھوں نے لکھا ہے که جب حضرت صالح ۔ بتوں کی پرستش سے ان کو منع کیا اور خدائے واحد کی پرستش کی ہدایت کی تو قوم ثمود نے جس میں که خود حضرت صالح بھی تھے معجزه طلب کیا حضرت صالح نے کہا که تم کیا چاہتے ہو ۔ آنھوں نے کہا که تم ہمارے تیوہار کے دن ہمارے ساتھ چلو ہم اپنے بتوں کو نکالیں گے تم خدا سے معجزه مانگنا ۔ ہم اپنے بتوں سے مانگیں گے ۔ اگر تمھاری دعا کا اثر ہوا تو ہم تمھارے مرید ہو جاویں گے اور اگر ہماری دعا کا اثر ہوا تو تم ہمارے مرید ہو جانا ۔ اس اقرار پر دونوں شہر کے باہر گئے ۔ آنھوں نے اپنے بتوں سے کچھ دعا مانگی مگر کچھ نه ہوا ۔ حضرت صالح سے کہا که ہم چاہتے ہیں که اس پہاڑ کے ٹکڑے میں سے ایک اونٹنی نکلے ۔ حضرت صالح نے آن سے اقرار لیا که اگر نکلے تو تم ایمان لے آؤ گے ۔ سب نے اقرار کیا ۔ جب بات پکی ہو گئی تو حضرت صالح نے دو رکعت نماز پڑھی اور خدا سے دعا مانگنی شروع کی ۔ وه پہاڑ کا ٹکڑا پھولنا شروع ہؤا اور حامله کے پیٹ کی مانند پھول گیا ۔ پھر پھٹا اور آس میں سے نہایت بڑی موٹی مشٹنڈی آونٹنی نکلی اور آسی وقت آس نے اپنے برابر کا بچه بھی دے دیا ۔

اس آونٹنی کا پیدا ہونا ہی عجیب طرح پر بیان نہیں کیا بلکه آس کی عجیب عجیب صفات بھی بیان کی ہیں لکھا ہے که جہاں قوم ثمود رہتی تھی وہاں پانی بہت کم تھا اور ٹھیرا تھا که ایک

دن وہ پانی اونٹنی پیا کرے اور ایک دن وہ لوگ لیا کریں اونٹنی میں یہ عجیب صفت تھی کہ وہ سارا پانی جس کو تمام لوگ پی سکتے تھے سڑپ جاتی تھی اور پہاڑ پر چلی جاتی تھی پھر وہاں سے آتی تھی اور لوگ اس کا دودھ دوھتے تھے اور اس قدر کثرت سے دودھ ہوتا تھا کہ تمام قوم کے لیے بجائے پانی کے کافی ہوتا تھا ۔

حضرت صالح نے کہا کہ تمھارے شہر میں ایک لڑکا پیدا ہونے کو ہے کہ تمھاری موت اس کے ھاتھ سے ہوگی انھوں نے یہ بات سن کر جو لڑکا پیدا ہوا اس کو مار ڈالا یہاں تک کہ نو لڑکوں کو مارا جب دسواں لڑکا پیدا ہوا کہا کہ بھئی اب تو ہم نہ ماریں گے مگر بدبختی سے یہ وہی لڑکا تھا جس کے ھاتھ سے ان کی موت ہونے والی تھی ۔

بہرحال وہ لڑکا بڑا ہوا جوان ہوا یاروں میں بیٹھنے لگا ایک دن وہ اپنے یاروں کی مجلس میں تھا اور سب نے شراب پینے کا ارادہ کیا اور شراب میں پانی ملانے کو پانی چاہا مگر وہ دن اونٹنی کے پانی پینے کا تھا وہ سب پانی پینے کا تھا وہ سب پانی پی گئی تھی ایک قطرہ شراب میں ملانے کو بھی نہیں چھوڑا تھا ۔

اس جوان کو نہایت غصہ آیا وہ پہاڑ میں گیا اور اونٹنی کو بلایا جب آئی تو اس کو ذبح کر ڈالا یا کونچیں کاٹ ڈالیں کہ وہ مر گئی ۔ پھر ان پر تین دن میں عذاب آیا پہلے دن سب کے بدن سرخ ہو گئے ۔ دوسرے دن زرد ہو گئے ۔ تیسرے دن کالے ہو گئے ۔ اس پر بھی نہ مرے تب بھونچال آیا اور اس کے سبب سے مر گئے اس قصہ کا لغو اور مہمل ہونا خود اس قصہ سے ظاہر ہوتا ہے مفسرین نے اس قصہ کو اگرچہ لکھا ہے مگر چنداں اعتبار نہیں کیا ۔ بعضوں نے تو " روی " کر کر لکھا ہے کہ یہ لفظ خود قصہ کے ضعیف اور بے سند ہونے پر دلالت کرتا ہے ۔ صاحب

تفسیر کبیر نے لکھا ہے کہ :

اعلم ان القرآن قددل علیٰ ان فیہا آیۃ فاما ذکر انہا کانت آیۃ من ای الوجوہ فہو غیر مذکور والعلم حاصل بانہا کانت معجزۃ من وجہ الا محالۃ۔ (تفسیر کبیر جلد ۳ صفحہ ۲٦١)

یعنی قرآن سے پایا جاتا ہے کہ اس اونٹنی میں کچھ نہ کچھ ایک نشانی تھی مگر یہ بات کہ وہ کیا نشانی تھی اور کس طرح پر تھی بیان نہیں ہوئی مگر اتنی بات معلوم ہے کہ وہ کسی نہ کسی وجہ سے معجزہ تھی۔

مگر میں کہتا ہوں کہ جس وجہ سے صاحب تفسیر کبیر نے اس کو معجزہ مافوق الفطرت قرار دیا ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے۔

ثمود کی قوم نے بتوں کی پرستش اختیار کی تھی اور کئی نسلیں ان کی بت پرستی میں گذر گئی تھیں جب حضرت صالح نے ایسے خدائے واحد کی پرستش کی ہدایت کی جس کی نہ کوئی صورت ہے، نہ شکل ہے، نہ اس کا وجود دکھائی دیتا ہے، نہ کوئی اس کے پاس جا کر اسے دیکھ سکتا ہے صرف خیال ہی خیال میں وہ ہے اور خیال میں بھی بیچون و بیچگوں میرا حیزو۔ مکان اور شکل و صورت وجہت و مثال سے تو ایک فطرتی بات تھی کہ ایک پشتینی بت پرست کہتے کہ اگر تم سچے ہو تو اس کی نشانی لاؤ۔ جس کے ذریعہ سے وہ اس بن دیکھے خدا کی پرستش کریں کیوں کہ بغیر کسی ظاہری وجود کے ان کے دل کو تسلی نہیں ہو سکتی تھی۔ انھوں نے ایک اونٹنی کو بطور سانڈ کے چھوڑ دیا کہ یہ خدا کی اونٹنی ہے اور تمہارے لیے خدا کی نشانی ہے اس کو کسی قسم کی ایذا مت پہنچاؤ اور چرنے پھرنے دو۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح پر جانوروں کے چھوڑنے کی قدیم رسم تھی عرب متعدد طرح

پر سانڈ چھوڑتے تھے - اونٹنی جب پانچ بچے جن لیتی تھی تو اس کو بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے تھے اور جہاں وہ چرتی چرنے دیتے تھے اور پانی پینے سے نہ ھکاتے تھے - بیماری سے اچھا ھونے یا سفر سے آنے پر یا دس برس خدمت لیے کے بعد اونٹ کو بتوں کے نام پر بطور سانڈ کے چھوڑتے تھے جو بحیرہ اور سائبہ اور حام کے نام سے مشہور ھیں - حضرت صالح نے بھی اسی طرح اس اونٹنی کو چھوڑا صرف اتنا فرق کیا کہ کسی بت یا کسی مخلوق کے نام پر نہیں چھوڑا بلکہ خدا کے نام پر چھوڑا -

آیت کے لفظ کے معنی معجزہ کے نہیں ھیں اور اس لیے مصنف تفسیر کبیر کا یہ لکھنا کہ " والعلم حاصل بانھا کانت معجزة بوجه مالا محالة " صحیح نہیں ھے - آیت کے معنی نشانی کے ھیں - محمد بن ابی بکر الرازی نے لغات قرآن میں لکھا ھے کہ الایة العلامة و منه قوله تعالیٰ ان آیة ملکه ، و قوله تعالیٰ ، وجعلنا اللیل والنھار آیتین ، ای علامتین ، پس آیت کے لفظ سے یہ قرار دینا کہ وہ اونٹنی یا سانڈھنی ایک معجزہ تھی جو خلاف قانون قدرت یا مافوق الفطرت پیدا ھوئی تھی قابل تسلیم نہیں ھے -

دوسرا لفظ ان آیتوں میں " بینة من ربکم " کا ھے - ان الفاظ کا جو قرآن مجید میں ھیں ترجمہ یہ ھے کہ کہا (صالح) نے اے میری قوم عبادت کرو اللہ کی نہیں ھے تمھارے لیے کوئی خدا سوائے اس کے بے شک آئی ھے تمھارے پاس دلیل تمھارے پروردگار سے - یہ اونٹنی اللہ کی تمھارے لیے نشانی ھے - اگر یہ کہا جاوے کہ اونٹنی ھی وہ دلیل تھی تو الفاظ " لکم آیة " بیکار ھو جاتے ھیں کیوں کہ اس حالت میں صرف اتنا کہنا کافی تھا کہ قد جاءتکم بینة من ربکم ھٰذہ ناقة اللہ فذروھا تاکل الخ"

دوسرے یه که خدا کی تمام مخلوقات وہ کسی طرح پر پیدا ہو خدا پر دلیل هے اونٹنی کے پیدا ہونے سے گو که وہ کسی عجیب طرح سے پیدا ہوئی ہو خدا پر دلیل ہونے کی کچھ خصوصیت نہیں ہو سکتی ۔ پس صاف ظاہر هے که قد جاء تکم بینة من ربکم جدا جمله هے اور اس سے وہ دلیل مراد هے ۔ جو انبیاء اپنی اُمت کو خدا تعالیٰ کے وجود اور اس کی توحید اور اس کے استحقاق عبادت کی نسبت بتاتے ہیں اور هذه ناقة الله لکم آیة الی اخرہ جمله مستانفه هے اُس کو بینة من ربکم سے کچھ تعلق نہیں هے ۔

اگر ہم یه بھی تسلیم کر لیں که اُس کو بینة من ربکم سے تعلق هے تو بھی اُس سے کوئی نتیجه سوائے اس کے نہیں نکلتا که حضرت صالح نے اس اونٹنی کو جس طرح ایک نشانی بتایا تھا اُسی طرح اور اُسی مقصد سے اس کو دلیل یا گواہ بھی کہا تھا ۔ بینة کے لفظ سے اُس سانڈھنی کا معجزہ ہونا اور خلاف قانون قدرت یا مافوق الفطرت پیدا ہونا کس طرح تسلیم کیا جا سکتا هے ۔ تعجب هے که خدا تعالیٰ نے تمام قصه حضرت صالح کا بیان کیا اور جو بات سب سے مقدم اور سب سے زیادہ عجیب تھی که پہاڑ کو فی الفور اونٹنی کا حمل رہا اور وہ مثل حامله کے پیٹ کے پھولنا شروع ہوا اور شق ہو گیا اور اونٹنی پلی پلائی ساٹھ گز چوڑی اور معلوم نہیں کس قدر لمبی سنڈ مسنڈ اُس میں سے پیدا ہوئی اور پیدا پیدا ہوتے ہی اپنی برابر کا بچه جنا اور قدرتی مسئله المظروف اقصر من الظرف والجزا قصر من الکل کو بھی باطل کر دیا ۔ اُس کا بیان بالکل چھوڑ دیا اور مفسرین کو اس کا الہام کیا کیوں که اُنھوں نے بغیر غور و فکر اور بغیر کسی معتبر سند کے اس قصه کو لکھا هے جو بغیر الہام کے اور کسی طرح لکھا نہیں جا

سکتا تھا افسوس ہے کہ ہمارے مفسرین نے ایسے ہی لغو بے معنی قصوں کو قرآن مجید کی تفسیروں میں داخل کر کے مسائل مستحکم اسلام کو مضحکہ اطفال بنایا ہے اور اس کے نور عالم افروز کو لغویات کے گرد و غبار سے دھندلا کر دیا ہے ۔ خدا ان پر رحم کرے آمین ۔

جب کہ اُن لوگوں نے اُس سانڈھنی کو مار ڈالا اور کفر و بت پرستی کو نہ چھوڑا تو حضرت صالح نے فرمایا کہ تم تین دن اور چین کر لو پھر تم پر خدا کا عذاب ضرور آوے گا ۔ اعداد جو ایسے مقام پر بیان ہوتے ہیں اُن سے وہی عدد مقصود نہیں ہوتا بلکہ ایک زمانہ مراد ہوتا ہے اس طرح کے کلام کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ چند روز تم اور چین کرو پھر تم پر عذاب ہوگا ۔ بدکار انسان کی نسبت بھی کہا جاتا ہے کہ تین دن کا یا چند روز کا یہ عیش و آرام ہے اور اس سے اُس کی تمام عمر مراد ہوتی ہے اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد اُس کا حال معلوم ہوگا پس اسی طرح حضرت صالح نے فرمایا " تمتعوا فی دیارکم ثلٰثة ایام " ۔

جو آفت کہ قوم ثمود پر آئی وہ شدید بھونچال تھا ۔ لفظ طاغیہ جو بعض آیتوں میں ہے وہ اس کی شدت اور حد سے زیادہ ہونے پر دلالت کرتا ہے ۔ لفظ صیحہ کا اس بھونچال کی آواز گڑگڑاہٹ پر اشارہ کرتا ہے اور رجفہ کے معنی بھونچال کے ہیں ۔ غرض کہ جس طرح عادت اللہ جاری ہے بھونچال کے آنے وہ قوم غارت ہو گئی یعنی اس کے بہت سے آدمی مر گئے اور بہت سے بچے بھی رہے قوم ثمود کے مکانات پہاڑوں میں بھی تھے اور میدانوں میں بھی تھے ۔ میدانوں کے مکانات پر تو بھونچال سے صدمہ ظاہر ہے ۔ مگر پہاڑ کے اندر کے مکانات پر بھی متعدد

طرح سے صدمہ پہنچ سکتا ہے یہ واقعہ کوئی ایسا واقعہ نہیں ہے جس کو معجزہ یا خلاف قانون قدرت یا ما فوق الفطرت تصور کیا جاوے ۔

قصہ طالوت و جالوت

طالوت و جالوت کی لڑائیوں کا ذکر سورۂ بقر میں آیا ھے اور یہ وہ زمانہ ھے کہ جب بنی اسرائیل میں شموئیل نبی تھے اور ان آیتوں میں پانچ واقعوں کا بیان ھے ۔

(۱) بنی اسرائیل کا اپنے نبی سے درخواست کرنا کہ ان پر کوئی بادشاہ مقرر کرے ۔
(۲) شموئیل نبی کا بنی اسرائیل پر طالوت کو بادشاہ مقرر کرنا ۔
(۳) تابوت سکینہ کا طالوت کے عہد میں بنی اسرائیل کے پاس آ جانا ۔
(۴) طالوت کے لشکر کو دریا کے پا' سے منع ھونا ۔
(۵) فلسطینیوں کا شکست پانا اور جالوت کا داؤد کے ھاتھ سے مارا جانا ۔

یہ تمام واقعات توریت کی کتاب شموئیل میں مندرج ھیں مگر تیسرے اور چوتھے واقعہ میں کسی قدر اختلاف ھے ۔ یعنی کتاب شموئیل میں تابوت سکینہ کا طالوت کے عہد سے پہلے آ جانا لکھا ھے ۔ اور قرآن مجید میں طالوت کے عہد میں اور اس پر عیسائی مؤرخوں نے اعتراض کیا ھے کہ غلطی سے ماقبل کے واقعے کو مابعد کے واقعے میں شامل کر دیا ۔

کتاب شموئیل سے پایا جاتا ھے کہ تابوت سکینہ بمقام شیلوہ تھا جہاں عیلی بنی اسرائیل پر حاکم تھا اس کے عہد میں بنی اسرائیل اور فلسطینیوں میں بمقام ابن عیدز لڑائی ھوئی اور

بنی اسرائیل کی شکست ہوئی - (دیکھو کتاب شموئیل ۱ باب ۴
ورس ۲) تب بنی اسرائیل نے تابوت سکینہ کو شیلوہ سے لشکر گاہ میں
منگایا اور دوبارہ لڑے اور شکست عظیم ہوئی اور عیلی کے دونوں
بیٹے مارے گئے اور تابوت سکینہ کو فلسطینی چھین لے گئے (دیکھو
کتاب شموئیل ۱ باب ۴ ورس ۱۰ ، ۱۱) - عیلی بھی یہ خبر سن کر
کرسی سے گر پڑا اور مر گیا - اس زمانہ میں شموئیل نبی ہو چکے
تھے مگر ان کی عمر چھوٹی تھی -

فلسطینی تابوت سکینہ کو مقام ابن عیزر سے جہاں سے انھوں
نے فتح کیا تھا بمقام اشدود لے گئے اور واگون بت کے مندر میں رکھا
(دیکھو کتاب شموئیل ۱ باب ۵ ورس الغایت ۵) - پھر وہاں سے
بمقام گٹ لے گئے - (دیکھو کتاب مذکور ورس ۸) پھر وہاں سے
بمقام عقرون لے گئے - (دیکھو کتاب مذکور ورس ۱۰) اس کے بعد
فلسطینیوں نے ایک گاڑی میں دو گایوں کو جوت کر اور
تابوت سکینہ کو اس پر رکھ کر جنگل میں چھوڑ دیا اور وہ
گائیں اس کو لے کر بمقام بیت الشمس چلی آئیں اور یوشع کے کھیت
میں جا کھڑی ہوئیں اس نے تابوت اتار لیا اور اپنے ہاں رکھا -
(دیکھو کتاب شموئیل ۱ باب ۶) کتاب شموئیل میں لکھا ہے کہ
یہ واقعہ بنی اسرائیل کی شکست ہونے اور تابوت چھین لے جانے
کے سات مہینہ بعد ہوا -

اس کے بعد تابوت سکینہ قریات یعاریم میں آیا اور ابینا داب
کے گھر میں بمقام گبعاہ رکھا گیا - (دیکھو کتاب شموئیل ۱ باب
۷ ورس ۱) مگر کتاب شموئیل میں نہیں لکھا کہ بیت الشمس میں
کس قدر مدت رہا عیسائی مؤرخوں کے نزدیک سن ۱۱۴۱ قبل
مسیح کے تابوت سکینہ فلسطینیوں نے چھین لیا تھا اور سن ۱۱۴۰ میں
قریات یعاریم میں آ گیا - وہاں آنے کے بیس برس بعد یہودیوں نے

بتوں کی عبادت شموئیل نبی کی فہمائش سے موقوف کی اور خدا کی
پرستش اختیار کی - (دیکھو کتاب شموئیل ۱ باب ۷ ورس ۱ ، ۲)
اور بنی اسرائیل سے شموئیل کی سرداری میں ایک لڑائی فلسطینیوں
سے ہوئی اور فلسطینیوں نے شکست کھائی - جب شموئیل ضعیف
ہوئے تب بنی اسرائیل نے کسی بادشاہ کے مقرر کرنے کو کہا
اور طالوت کو سن ۱۰۹۵ قبل مسیح میں بادشاہ مقرر کیا -

کتاب شموئیل میں طالوت یعنی شاؤل اور جالوت کی لڑائی اور
اس کے مارے جانے کا ذکر ہے - مگر طالوت کے لشکر کو دریا کے
پانی پینے سے منع کرنے کا ذکر نہیں ہے بلکہ توریت کی کتاب
قضاۃ باب ہفتم میں جدعون کے لشکر کو ایک چشمہ کے پانی پینے
سے منع کیا گیا تھا اور یہ واقعہ سن ۱۲۴۹ قبل مسیح کے ہوا تھا
اس لیے عیسائی مؤرخ اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن مجید میں غلطی
سے جدعون کے لشکر کے واقع کو طالوت کے لشکر کے واقعہ سے
ملا دیا ہے -

ان دونوں اعتراضوں کے تسلیم کرنے کے لیے جو مخالفت
کتاب شموئیل پر مبنی ہے ضرور ہے کہ کتاب شموئیل میں جو
واقعات اور جو ترتیب آن واقعات کی ہے ان کو صحیح تسلیم کر لیا
جاوے اور یہ بات بھی مان لی جاوے کہ کوئی واقعہ طالوت کے
لشکر کا ایسا نہیں ہے جو کتاب شموئیل میں لکھنے سے رہ گیا ہو -
حالاں کہ خود عیسائی مؤرخ ان باتوں کو تسلیم نہیں کرتے شموئیل کی
کتابوں کے مضامین میں باہم اختلاف - کتاب اول شموئیل باب ۱۶
ورس ۲۱ ، ۲۲ سے ظاہر ہے کہ طالوت داؤد سے اور اس کے باپ
یشی سے بخوبی واقف تھا - داؤد کو اس کے باپ کے پاس سے بلایا
تھا اور اپنا سلح دار کیا تھا - اسی کتاب کے باب ہفتدھم ورس ۵
سے ظاہر ہے کہ داؤد طالوت سے رخصت ہو کر اپنے گھر چلا

تھا - لڑائی کے ھنگامہ میں جب داؤد اپنے بھائیوں کی خبر لینے آیا تو داؤد نے کہا کہ جالوت سے میں لڑوں گا - یہ خبر سن کر طالوت نے داؤد کو بلایا اور گفتگو کے بعد لڑنے کی اجازت دی اور اپنی زرہ وخود و تلوار بھی دی جس کو داؤد نے لے کر پھر دے دیا - (دیکھو کتاب اول شموئیل باب ۱۷ ورس ۳۱ لغایت ۳۹) مگر اسی باب کے ورس ۵۵ میں لکھا ھے کہ جب داؤد لڑنے کو بڑھا تو طالوت نے اپنے لشکر کے سردار سے پوچھا کہ یہ جوان کس کا بیٹا ھے اور ورس ۵۸ میں لکھا ھے کہ جب داؤد نے جالوت کا سر کاٹ لیا اور طالوت کے پاس لے آیا تو طالوت نے پوچھا کہ تو کس کا بیٹا ھے - پس ان آیتوں سے معلوم ھوتا ھے کہ اس وقت تک طالوت داؤد سے مطلق واقف نہ تھا - اس اختلاف کے سبب خود عیسائی مؤرخوں کی یہ رائے ھے کہ کتاب شموئیل میں قصہ آلٹ پلٹ ھو گیا ھے - جالوت کی لڑائی کے بعد داؤد طالوت کا مصاحب اور سلح دار ھوا ھے اس پر بھی اختلاف رفع نہیں ھوتا کیونکہ سولھویں باب سے داؤد کی پہلی دفعہ بطور مطرب بربط نواز کے طالوت سے ملاقات ھونی پائی جاتی ھے -

متقدمین علمائے عیسائی نے خیال کیا ھے کہ باب ھفت دھم کتاب اول شموئیل کے ورس ۱۱ لغایت ۳۱ ورس ۵۵ لغایت ۵۸ و باب ھیجدھم کے ورس ۱ لغایت ۵ صحیح نہیں ھیں اور ان کو خارج کر دیا ھے - چناں چہ سیپٹو ایجنٹ کے قلمی نسخہ وٹیکن میں وہ آیتیں نہیں ھیں اور اگر وہ آیتیں نکال ڈالی جاویں تب بھی اور آیتوں میں جیسے کہ باب ۱۶ کے ورس ۱۸ لغایت ۲۱ و باب ۱۷ کے ورس ۳۳ لغایت ۴۰ کی مطابقت ھی نہیں ھو سکتی - انھی اختلافات کے سبب بعض عیسائی عالموں کی یہ رائے ھے کہ سارے کا سارا سترھواں باب الحاق و نا معتبر ھے جان کیٹو نے اپنی کتاب

سیکلو پیڈیا میں لکھا ہے کہ "یہی کافی نہیں ہے کہ جس مقام کو ہم غلط سمجھیں اُسے الحاق سمجھ کر خارج کر دیں اور باقی کو بلا کم و کاست صحیح جانیں کیوں کہ ممکن ہے کہ جنھوں نے الحاق کیا تھا اُنھوں نے باقی حصوں میں بھی تصرف کیا ہو ۔

علاوہ اس کے یہ بھی تحقیق نہیں ہے کہ شموئیل کی کتابیں کب لکھی گئیں اور کس نے لکھی ہیں ۔ یہودی اور بڑے بڑے عیسائی عالم خیال کرتے ہیں کہ شموئیل کی کتاب کا بڑا حصہ یا پہلے چوبیس باب شموئیل کے لکھے ہوئے ہیں اور باقی ناثان نبی و گید نبی کے لکھے ہوئے ہیں ۔ ابر بانیل اور کروشیس خیال کرتے ہیں کہ یہ سب کتابیں یرمیاہ نبی نے لکھی ہیں ۔ جان کی یہ رائے ہے کہ یہ کتابیں شموئیل کے بہت زمانہ بعد یعنی قید بابل کے تیسویں سال میں لکھی گئی ہیں اگر در حقیقت ایسا ہی ہو کہ تین ہاتھوں نے ان کتابوں کو لکھا ہو تو واقعات کا اُلٹ پلٹ ہو جانا یا بعض واقعات کا تحریر سے رہ جانا ایک ایسا امر ہے جو آسانی سے خیال میں آ سکتا ہے ۔

ہماری غرض **اس** بحث سے شموئیل کی کتابوں پر جرح و قدح کی نہیں ہے بلکہ صرف یہ بات ثابت کرنی ہے کہ قرآن مجید پر اس وجہ سے کہ شموئیل کی کتابوں سے بیان مختلف ہے اعتراض نہیں ہو سکتا جب تک کہ اور طرح پر اُس کی غلطی ثابت نہ کی جاوے ۔

میں یہ نہیں چاہتا کہ قرآن مجید میں جو کچھ لکھا ہے اس کی صحت پر کسی کو اس وجہ پر مجبور کروں کہ قرآن میں لکھا ہے ۔ بلکہ میں دونوں واقعوں پر جو قرآن و کتاب شموئیل میں مندرج ہیں بطور ایک نکتہ چین مؤرخ کے غور کرنا اور اُس نکتہ چینی سے دونوں قولوں میں سے ایک کو ترجیح دینا چاہتا ہوں ۔

تابوت سکینہ کو فلسطینی فتح کر کے چھین لے گئے تھے ۔
کتاب شموئیل میں اس کا واپس بھیج دینا ایسے عجیب اور کراماتی
واقعوں پر مبنی کیا ھے جس کو کوئی آزاد رائے کا مؤرخ جو
واقعات کو انسانوں کے حالات اور افعال کا نتیجہ سمجھتا ھے تسلیم
نہیں کر سکتا ۔ لڑائی کی شکست ہونے کے بعد بنی اسرائیل نہایت
ضعیف ھو گئے تھے اور رفتہ رفتہ اُنھوں نے پھر قوت حاصل کی تھی
تابوت سکینہ کا دشمنوں کے ھاتھ میں چلا جانا بلاشبہ ان کو نہایت
رنج دیتا ھوگا اور ان کی نہایت آرزو یہ ھوگی کہ وہ اس کو پھر
اپنے دشمنوں سے واپس لیں ۔

اس شکست کے بیس برس بعد وہ فلسطینیوں سے پھر لڑے اور
فلسطینیوں نے شکست پائی ۔ جس سے معلوم ھوتا ھے فلسطینی کمزور
ھو گئے تھے ۔ فلسطینی خوب جانتے ھوں گے کہ بنی اسرائیل جب
تک کہ تابوت سکینہ اُن کے ھاتھ نہ لگے لڑائی سے باز نہیں آنے کے ۔
اس عرصہ میں بنی اسرائیل کو زیادہ قوت ھو گئی اور شموئیل
نبی نے تمام فرقوں کو جو عیلی کے مرنے کے بعد متفرق ھو گئے
اکٹھا کر لیا اور طالوت کو بادشاہ مقرر کیا اور یہ امر بنی اسرائیل
کی زیادہ قوت کا اور فلسطینیوں کو جو کمزور ھوتے جاتے تھے
زیادہ خوف کا باعث ھوا ھوگا ۔ اُنھوں نے سمجھا ھوگا کہ اگر
تابوت سکینہ واپس کر دیا جاوے تو شاید مصیبت جنگ سے حفاظت
ھو جاوے اُنھوں نے جابجا اس کو منتقل کیا اور آخرکار ایک
گاڑی میں لاد کر مع زر و تحائف کے بیت الشمس کی سرحد میں جو
بنی اسرائیل کا ایک شہر فلسطینیوں کی سرحد سے ملا ھوا تھا
چھوڑ آئے اور اس تمام اصلی واقعہ پر خیال کرنے سے اس بات کو
کہ تابوت سکینہ طالوت کے عہد میں آیا ھوگا ۔ جیسا کہ قرآن
میں مندرج ھے زیادہ ترجیح ھوتی ھے ۔

دریا کے پانی پینے سے منع کرنے کی نسبت اول ہم کو خیال کرنا چاہیے کہ جہاں طالوت و جالوت میں لڑائی ہوئی تھی وہ کیا مقام تھا ۔ فلسطینی مقام سوکوہ غریقاہ دمیم میں جمع ہوئے تھے اور بنی اسرائیل وادیٔ ایلاہ میں دونوں لشکروں کے درمیان دریائے شورق واقع تھا ۔ فلسطینی اس کے بائیں کنارہ پر یعنی جانب جنوب تھے اور بنی اسرائیل اس کے دائیں کنارہ پر یعنی جانب شمال تھے اور بنی اسرائیل نے دریا کو عبور کرکے فلسطینیوں پر حملہ کیا تھا ۔ پس قرآن مجید کے ان لفظوں کی کہ ''ان اللہ مبتلیکم بنہر'' جغرافیہ اور تاریخ سے بخوبی تصدیق ہوتی ہے ۔

باقی رہا اس کے پانی پینے سے منع کرنا ۔ ہر شخص جو لڑائیوں کے حالات سے واقف ہے اس بات کو بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ جب ایک قوم دوسری قوم پر فوج کشی کرتی ہے تو ہر ایک شخص اس کی قوم کا بہادر اور غیر بہادر اور دل چلا اور دل کا بودا قومی لحاظ سے اس کے ساتھ ہو لیتا ہے لیکن جب وقت حملہ کرنے کا آتا ہے تو سپہ سالار ایک طریقہ ایسے لوگوں کے انتخاب کرنے کا مقرر کرتا ہے جس کے سبب حملہ میں وہی لوگ شریک رہیں ۔ جو نہایت بہادر اور دل چلے ہوں اور در حقیقت اپنے دلی جوش سے لڑائی میں شریک ہوئے ہوں ۔

جب جدعون نے مدیانیوں پر فوج کشی کی تھی تو اس نے حملہ کے وقت یہ قرار دیا تھا کہ جو شخص اس چشمہ سے جو اس لشکر کے پاس تھا پانی پی لے وہ حملہ میں شریک نہ ہو اور جو نہ پیئے بلکہ صرف ہاتھ بھگو کے زبان تر کر لے وہ حملہ میں شریک رہے ۔ اس سے مقصود صرف یہ تھا کہ جن لوگوں کو لڑنے اور جان دینے میں تذبذب ہو وہ چھٹ جائیں اور جو بالکل لڑنے اور مرنے

پر آمادہ ہوں وہ حملہ میں شریک رہیں ۔

اگرچہ شبہ ہے کہ جہاں جدعون کی مدیانیوں سے لڑائی ہوئی تھی وہاں کوئی چشمہ نہیں تھا اور اس لیے کتاب قضاۃ میں طالوت کا واقعہ جدعون کے قصہ سے ملا دیا ہے ۔ لیکن اگر اس کو جدعون ہی کے وقت کا واقعہ تسلیم کر لیا جاوے تو طالوت کو یہ واقعہ ضرور معلوم ہوگا اور اتفاق سے طالوت کا لشکر بھی دریا کے کنارہ پڑا تھا اور دریا کے پار اتر کر حملہ کرنا قرار پایا تھا ۔ ہر طرح پر یقین کرنے کا موقع ملا ہے کہ طالوت نے بھی اسی طریقہ پر ان لوگوں کا جو حملہ میں دل سے شریک ہوں کو تھے انتخاب کرنا چاہا ہوگا ۔ اور وہی طریقہ انتخاب کا اختیار کیا ہوگا جو جدعون نے اختیار کیا تھا ۔ ہاں کتاب شموئیل میں اس انتخاب کا ذکر نہیں ہے لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے ۔ کتاب شموئیل میں اس کا ذکر نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ واقعہ نہ ہوا ہو ۔ عیسائی مؤرخوں نے کج بحثی سے یہ اعتراض کیا ہے کہ قرآن مجید میں جدعون کے قصہ کو طالوت کے قصہ میں ملا دیا ہے ۔ پس یہ اعتراض کرنے والوں کی غلطی ہے ۔ کیوں کہ تمام واقعات کو خیال کرنے سے اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ جدعون کے عہد میں جو واقعہ ہوا وہ علیحدہ ہے اور طالوت کے عہد میں جو واقعہ ہوا اور جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے وہ علیحدہ ہے اور کم سے کم اس میں تو کچھ شبہ نہیں ہو سکتا کہ اس زمانہ کے یہود جب قرآن مجید نازل ہوا ۔ اس واقعہ کا طالوت کے عہد میں بھی واقع ہونے کا یقین رکھتے تھے ۔ کیوں کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو انھی کے مقابلہ میں قرآن مجید میں اعلانیہ ایسا بیان نہیں ہو سکتا ۔

آیتیں جن میں یہ قصہ مذکور ہے نہایت صاف ہیں صرف ایک

مقام تفسیر کے قابل ہے - جہاں خدا نے فرمایا ہے کہ "طالوت کے عہد سلطنت میں تابوت سکینہ کو فرشتے اٹھا لاویں گے" "تحملہ الملائکۃ" جالوت نے جب لڑائی میں مغلوب ہونے کے ڈر سے تابوت سکینہ کو بنی اسرائیل کے ملک میں بھیج دینا چاہا تو اس کو بیلوں کی گاڑی پر لاد کر بنی اسرائیل کے ملک کی سرحد میں چھڑوا دیا تھا - یہ قصہ شموئیل کی کتاب میں ہے - ہمارے علمائے مفسرین نے کہہ دیا کہ ان بیلوں کو جن پر کوئی ہانکنے والا نہ تھا فرشتے ہنکا لائے تھے اور یہی معنی تحملہ الملائکۃ کے قرار دیے ہیں - بعض عالموں نے سمجھا کہ یہ معنی تو ٹھیک تحملہ کے لفظ کے چسپاں نہیں ہوتے - انھوں نے یہ قیاس لگایا کہ موسیٰ کے بعد سے تابوت سکینہ کو دنیا سے اوپر فرشتے ادھر اٹھائے ہوئے تھے پھر طالوت کو لا کر دے دیا یہ سب غلط قیاسات ہیں - آیت کا مطلب صاف ہے کہ بنی اسرائیل کو تابوت سکینہ کے ہاتھ آنے کی بڑی خواہش تھی - شموئیل پیغمبر نے جب طالوت کو بادشاہ مقرر کیا تو فرمایا کہ اس کی بادشاہت میں تابوت سکینہ آ جاوے گا اور جو کہ اس کا ہاتھ آنا نہایت مشکل معلوم ہوتا تھا - اس لیے انھوں نے کہا کہ اس کو فرشتے اٹھا لاویں گے - جیسے کہ ایسے موقع پر بطور تقویت قلب کے بولا جاتا ہے -

---

موسیٰ ، فرعون اور بنی اسرائیل

حضرت موسیٰ ، بادشاہ فرعون اور حضرت موسیٰ کی قوم بنی اسرائیل کے متعلق جو واقعات قرآن کریم میں بیان ہوئے ہیں وہ ۱۹ موضوعات میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے :

(۱) تحقیق لفظ آیہ و لفظ بینہ ۔ (۲) حقیقت سحر ۔ (۳) تخیل تحریک حبل و عصائے سحرہ فرعون (۴) عصائے موسیٰ اور اُس کا بطور اژدھے کے دکھائی دینا ۔ (۵) بیان ید بیضا ۔ (۶) ذکر قتل اولاد بنی اسرائیل ۔ (۷) بیان قحط ۔ (۸) ذکر طوفان ، وجراد ۔ وقمل ، وضفادع ۔ ودم ۔ (۹)غرق فی البحر ۔ (۱۰) اعتکاف حضرت موسیٰ کا پہاڑ میں ۔ (۱۱) حقیقت کلام خدا با موسیٰ ۔ (۱۲) حقیقت تجلی للجبل ۔ (۱۳) بیان کتابت فی الالواح ۔ (۱۴) اتخاذ عجل ۔ (۱۵) ستر آدمیوں کا منتخب کرنا ۔ (۱۶) ذکر استسقائے قوم موسیٰ اور ظاہر ہونا چشموں کا ۔ (۱۷) سایہ کرنا ابر کا ۔ (۱۸) من و سلویٰ کا اُترنا ۔ (۱۹) دخول باب ۔

ذیل میں ہم اُن ان اُنیسوں امور کی نسبت علیحدہ علیحدہ بیان کرنا چاہتے ہیں ۔

اول ۔ تحقیق معنی لفظ آیہ و بینہ

ہم نے حضرت عیسیٰ کے بیان میں بہ تحت تفسیر ''و اتینا عیسیٰ ابن مریم البینات'' لفظ آیہ و بینہ پر مفصل بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ ان الفاظ کے معنی معجزہ کے نہیں

هیں بلکہ احکام کے هیں اور یہ بهی ثابت کر دیا هے کہ معجزہ دلیل ثبوت نبوت نہیں هو سکتا اور اس صورت میں آیہ و بینہ کے معنی اس غرض سے معجزہ کے لینے کہ وہ مثبت نبوت هوتا هے خرط القتاد سے کچھ زیادہ رتبہ نہیں رکھتا ۔ اس بحث کو آگے کے مضمون حضرت عیسیٰ کے معجزات میں پڑھیں ۔

دوم ۔ حقیقت سحر
اور یہ کہ کن معنوں میں اس کا استعمال هوتا هے

سحر کا لفظ قرآن مجید میں بہت جگہ آیا هے مگر بہت سے الفاظ زبان عرب میں ایسے مستعمل تھے جن کے لیے فی الواقع کوئی حقیقت نہ تھی اور نہ درحقیقت اُن کا مصداق تھا نہ اُن کا کوئی مسمی حقیقتہً وجود رکھتا تھا ۔ بلکہ عرب جاهلیت نے اپنے وهم میں ایک شے غیر موجود کا وجود قرار دیا تھا اور اُس سے کچھ افعال منسوب کئے تھے اور اُس شے غیر موجود وهمی کے لئے وہ الفاظ مستعمل کرتے تھے ۔ قرآن مجید اهل عرب کی زبان میں نازل هوا اور اس لئے اُس زبان کے محاورہ کے موافق وہ الفاظ بهی قرآن مجید میں آئے هیں ۔ مگر قرآن مجید میں اُس کا استعمال اُن اثروں کے سمجھانے کے لئے هوا هے جو اثر کہ اهل عرب اُن لفظوں سے پاتے تھے نہ اس لئے کہ اُن لفظوں کے لئے فی الواقع کوئی حقیقت تھی یا در حقیقت اُن کا کوئی مصداق تھا ۔

اس کی مثال میں هم ایک مباحثہ لطیف کا ذکر کرتے هیں جو خلیفہ منصور کے وزیر ابوالفضل بن ربیع کی مجلس میں ایک بہت بڑے عالم سے هوا تھا ۔ مراۃ الجنان المشهور بہ تاریخ یافعی میں لکھا هے کہ فضل بن ربیع نے جو خلیفہ منصور کا وزیر اور

قال ابوعبیدۃ ارسل الی الفضل بن الربیع الی البصرۃ فی الخروج الیہ فقدمت علیہ وکنت اخبر عن تبحرہ فاذن لی فدخلت علیہ و هو فی مجلس طویل

عريض فيه بساط واحد قد
ملاءه و فى صدره فرش عالية
لا يرتقى عليها الا بكرسى
و هو جالس على العرش
فسلمت عليه بالوزارة فرد
و ضحك الى واستدنانى من
فرشه ثم سالنى وبسطنى و
تلطف بى و قال فانشدنى
فانشدته من عيون اشعار
جاهلية احفظها فقال قد
عرفت اكثر هذه واريد من
مليح الشعر فا نشدته
فطرب و ضحك و زاده نشا
طاثم دخل رجل فى ذى الكتاب
وله هيئة حسنة فا جلسه
الى جانبى و قال اتعرف هذا
قال لا فقال هذا ابو عبيدة
علامة اهل البصرة اقدمناه
لنستفيد من علمه فدعا له
الرجل ثم التفت الى و قال
لى كنت اليك مشتاقا و
قد سألت عن مسئلة افتاذن
لى ان اعرفك ايا ها قلت
هات فقال قال الله تعالى
طلعها كانه رؤس الشياطين

ایک بہت بڑا عالم تھا ابو عبیدہ
کے پاس جو اس زمانہ کے بہت
بڑے عالم متبحر تھے اور بصرہ
میں تھے ایک شخص بھیجا اور
اپنے پاس بلایا وہ آئے اور ان
کو وزیر کی مجلس میں آنے کی
اجازت ملی جب وہ مجلس میں
گئے تو دیکھا کہ وہ ایک بہت
لمبے چوڑے مکان میں ھے جس
میں بھرپور ایک ھی کپڑے کا
فرش بچھا ھوا ھے اور صدر میں
ایک بہت اونچی جگہ پر جس پر
بغیر زینہ کے چڑھا نہیں جا سکتا
مسند تکیہ لگا ھوا ھے اور وہ
اس پر بیٹھا ھے ۔ ابو عبیدہ نے
موافق اس آداب کے جو وزیروں
کے لئے مقرر کیا تھا سلام علیک
کی وزیر نے اس کا جواب دیا اور
اپنی مسند کے پاس بیٹھنے کی
اجازت دی ۔ پھر ابو عبیدہ کی
خیر و عافیت پوچھی اور
حالات دریافت کیے اور بہت
مہربانی کی ۔ پھر کہا کہ کچھ
اشعار پڑھو ۔ ابو عبیدہ نے عرب
جاھلیت کے نہایت عمدہ اشعار

جو اس کو یاد تھے پڑھے - وزیر نے کہا کہ ایسے تو بہت سے اشعار میں بھی جانتا ہوں میرا یہ مقصد تھا کہ کچھ نمکین چٹ پٹے اشعار سناؤ ابوعبیدہ نے ویسے ہی اشعار پڑھے جن کو سن کر وزیر خوش ہؤا اور ہنسا اور مزے میں آ گیا - اتنے میں وزیر کا ایک منشی جو وجیہ آدمی تھا آ گیا وزیر نے اس کو ابوعبیدہ کے پاس بیٹھنے کا حکم دیا اور ابوعبیدہ کی طرف اشارہ

وانما یقع الوعد والا یعاد بما قد عرف و ھذالم یعرف قال فقلت انما کلم اللہ العرب علی قدر کلا مہم اما سمعت قول امری القیس -
ایقتلنی و المشرفی مضاجعی
و مسنونة رزق کانیاب اغوال
و ھم لم یرو الغوال قط
و لکنہ لما کان امر الغول یھولھم اوعد وابہ فا ستحسن الفضل والسائل فی ذلک -
(مراۃ الجنان - ورق ١٥٧)

کر کے منشی سے پوچھا کہ تم ان کو جانتے ہو اس - عرض کیا کہ میں نہیں جانتا وزیر نے کہا کہ یہ ابوعبیدہ ہیں علامہ اھل بصرہ - میں نے ان کو بلایا ھے تا کہ ان کے علم سے ھم فائدہ اٹھاویں اس منشی نے وزیر کو دعا دی اور ابوعبیدہ کی طرف متوجہ ھوا اور کہا کہ میں آپ سے ملنے کا بہت مشتاق تھا - لوگوں نے مجھ سے ایک مسئلہ پوچھا ھے آپ مجھ کو اجازت دیتے ہیں کہ اس کو آپ سے کہوں - ابوعبیدہ نے کہا کہ کہو- اس منشی نے کہا کہ خدا تعالٰی نے دوزخ کے درخت کے پھل کو شیطان کے سروں سے تشبیہ دے کر ڈرایا ھے مگر لالچ دینا یا ڈرانا ایسی چیز سے ھو سکتا ھے جس کو لوگ جانتے ھوں مگر شیطانوں کے سروں کو تو کوئی نہیں جانتا کہ کیسے ہیں - ابوعبیدہ نے کہا کہ خدا نے عرب کے کلام کے مطابق کلام کیا ھے کیا تم نے امراء القیس کا

قول نہیں سنا چناں چہ ابوعبیدہ نے وہ شعر پڑھا جس کا مطلب یہ ھے -

کیا وہ مجھ کو مار ڈالیں گے اور تلوار میری ساتھ لیٹی ھے
اور نیلی چمک دار برچھیاں ھیں مانند دانتوں غول بیابانی کے

اُس شخص نے جس کے حق میں یہ شعر کہا ھے یا اور کسی نے غول بیابانی کو کبھی نہیں دیکھا تھا - مگر جب کہ غول بیابانی کا ھول اُس کے دل میں تھا تو اُس سے اُن کو ڈرایا - اس تقریر کو وزیر ابو الفضل اور اُس کے منشی دونوں نے پسند کیا - (انتہٰی)

غرض کہ جس طرح امراء القیس کے شعر سے یہ لازم نہیں آتا کہ درحقیقت غول بیابانی کے لمبے لمبے نیلے نیلے چمک دار دانت ہوتے ھیں اسی طرح قرآن مجید میں جو رؤس الشیاطین کا لفظ آیا ھے اُس کو یہ لازم نہیں آتا کہ درحقیقت شیطان کا ڈراؤنا سر ھوتا ھے بلکہ جس چیز سے اپنے خیالات کے موافق عرب دھشت کھاتے تھے اُسی سے اُن کے خیالات کے موافق وعید آئی ھے - اسی طرح سحر کا لفظ جہاں قرآن میں آیا ھے وہ صرف عرب جاھلیت کے خیال کے موافق آیا ھے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جس طرح پر عرب جاھلیت سحر کو سمجھتے تھے در حقیقت اُس طرح پر اُس کا وجود تھا یا خدا تعالیٰ نے اُس کا واقعی ھونا بتایا ھے یا عرب جاھلیت کے خیالات کی تصدیق کی ھے -

اسی طرح سینکڑوں لفظ قرآن مجید میں حسب محاورہ زبان عرب اور بلحاظ خیالات عرب، جاھلیت آئے ھیں جن سے اُن کا واقعی ھونا مراد نہیں ھے - علمائے متقدمین نے اس باب میں کتابیں لکھی

و عزمت منذ ذالک
الیوم ان اصنع کتابا فی القرآن
لمثل ھذا و اشباھه و لما
یحتاج الیه من علمه فلما

رجعت الی البصرة علمت کتاب لذی سمیته المجاز ـ (مراۃ الجنان یافعی صفحه ۱۵۷)

ہیں ـ چناں چه تاریخ یافعی میں لکھا ہے که اس مباحثه کے بعد ابوعبیده نے اسی دن سے اراده کیا که وه قرآن کے اس قسم کے الفاظ کے بیان میں ایک کتاب لکھے اور جب وه بصره میں واپس آگیا تو اس نے کتاب لکھی اور اس کا نام مجاز رکھا ـ افسوس ہے که اس قسم کی کتابیں دستیاب نہیں ہوتیں ہمارے زمانه کے عالم ان کتابوں سے نا واقف محض ہیں ـ اور جب کوئی شخص جس کو خدا نے بصیرت دی ہے قرآن مجید پر غور کر کے اور تمام حالات کو پیش نظر رکھ کے اس قسم کے الفاظ کی نسبت کچھ لکھتا ہے تو ان کو ایک نئی بات معلوم ہوتی ہے اور چونک اٹھتے ہیں اور کہتے ہیں که یه تو نص کے برخلاف ہے حالاں که جس کو وه نص سمجھتے ہیں در حقیقت وہی نص کے برخلاف ہے ـ

سحر جس طرح که لوگ اس پر یقین کرتے ہیں اور عرف عام میں جس طرح پر وه سمجھتاجاتا ہے اس کی کچھ اصلیت نہیں ہے اور نه قرآن مجید سے اس کی تصدیق پائی جاتی ہے ـ ہاں تمام انسانوں میں خواه وه انبیاء ہوں یا اولیا یا عوام الناس یا کسی مذہب کے ہوں حتٰی که حیوانوں میں بھی ایک قسم کی قوت مقناطیسی موجود ہے جو خود اس پر اور نیز دوسروں پر ایک قسم کا اثر پیدا کرتی ہے ـ یه قوت بمقتضائے خلقت بعضوں میں ضعیف اور بعضوں میں قوی اور بعضوں میں اقویٰ ہوتی ہے ـ اور جس طرح اور قوائے انسانی ورزش سے قوت پکڑتے ہیں جیسے که پنجه کشی کی ورزش سے پنجه میں ـ کلائی کی ورزش سے کلائی میں زیاده قوت آ جاتی ہے اسی طرح اس قوت دماغی میں بھی خاص قسم کی ورزش سے قوت زیاده ہو جاتی ہے ـ

انسان جو خواب میں عجیب عجیب چیزیں دیکھتا ہے اور

عجیب واقعات و حالات اُس پر گزرتے ہیں جن کو وہ سمجھتا ہے کہ در حقیقت وہ تمام چیزیں موجود ہیں اور فی الواقع وہ حالات اُس پر گزر رہے ہیں اُسی قوت کے اثروں میں سے ہے حالاں کہ وہ چیزیں در حقیقت نہ موجود ہوتی ہیں اور نہ فی الواقع وہ حالات اُس پر گزرتے ہیں -

یہ کیفیت جس طرح کہ خواب طبعی میں ہوتی ہے کبھی حالت بیداری میں بھی پیدا ہو جاتی ہے آدمی سمجھتا ہے کہ میں جاگتا ہوں اور در حقیقت وہ جاگتا بھی ہوتا ہے مگر اُس پر ایک قسم کی خواب طاری ہو جاتی ہے جو خواب مقناطیسی سے تعبیر کی جا سکتی ہے اور اس حالت میں انسان ایسی چیزوں کو موجود دیکھتا ہے جو فی الحقیقت موجود نہیں ہیں اور ایسے واقعات اپنے پر گزرتے ہوئے یقین کرتا ہے جو در حقیقت اُس پر نہیں گزرتے -

یہ قوت مقناطیسی جس میں قوی ہوتی ہے وہ دوسرے شخص پر بھی ڈال سکتا ہے اور اُس دوسرے شخص پر بحالت بیداری ایک قسم کی خواب مقناطیسی طاری ہوتی جاتی ہے - کبھی دوسرا شخص جاگتا رہتا ہے اور خواب مقناطیسی اُس پر طاری رہتی ہے اور کبھی وہ اُسی خواب مقناطیسی میں بیہوش ہو جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سوتا ہے -

اس قوت مقناطیسی سے کیا کیا چیزیں ظہور میں آتی ہیں بحث طلب ہیں جو لوگ اس فن کے عامل ہیں وہ اس قوت سے بہت سی عجائب و غرائب چیزوں کے ظہور کا دعویٰ کرتے ہیں مگر جب تک وہ تجربہ اور مشاہدہ میں نہ آویں اُس وقت تک اُن کے صحیح و غیر صحیح ہونے کا فیصلہ نہیں ہو سکتا - ہاں صرف اُن باتوں کے وجود سے یا اُن کے ظہور پذیر ہونے سے انکار کیا جا سکتا ہے جو معلومہ قوانین قدرت کے برخلاف ہیں - با این همه جو امور

کہ اُس سے ظہور میں آویں وہ صرف خیالی اور وہمی ہوتے ہیں جیسے خواب کی چیزیں نہ اصلی اور واقعی ۔

یہ قوت بعض آدمیوں میں خلقی نہایت قوی ہوتی ہے اور جو لوگ مجاہدات کرتے ہیں اور لطائف نفسانی کو متحرک کرتے ہیں خواہ وہ اُن مجاہدات میں خدا کا نام لیا کریں یا اور کسی کا اُن میں بھی یہ قوت نہایت قوی ہو جاتی ہے اور اُس کے اثر ظاہر ہونے لگتے ہیں ۔ اُن اثروں کو جب کہ مسلمانوں سے ظاہر ہوتے ہیں مسلمان کرامت سے تعبیر کرتے ہیں اور جب کہ غیر مذہب والے سے ظاہر ہوتے ہیں اُس کو استدراج سے تعبیر کرتے ہیں حالاں کہ دونوں کی اصلیت واحد ہے ۔ بہر حال جو کچھ کہ اُس سے ظاہر ہو اس کا کوئی وجود اصلی و حقیقی نہیں ہے بلکہ صرف وجود وہمی و خیالی ہے ۔

اسی قسم کی تاثیرات نفسانی کے ظہور کو جب کہ اُن کا برانگیختہ کرنا ایسے مجاہدات سے کیا گیا ہے جو خدا کے سوا اور اشیا یا اشخاص کے تصور و تذکر سے تعلق رکھتے ہیں سحر سے تعبیر کیا گیا ہے اگرچہ صاحب تفسیر کبیر نے بھی سحر کی نسبت بہت لمبی بحث لکھی ہے ۔ مگر ابن خلدون نے اس بحث کو نہایت خوب سے صاف صاف مختصر طور پر لکھا ہے ۔ جس کو ہم بجنسہ اس مقام پر نقل کرتے ہیں چناں چہ اُنہوں نے لکھا ہے ۔

حقیقة السحر ۔ و ذالک	کہ سحر کی حقیقت یہ ہے کہ
ان النفوس البشریة وان کانت	نفوس انسانی اگرچہ نوعیت کے
واحدة بالنوع فھی مختلفة	لحاظ سے متحد ہیں مگر خاصیتوں
بالخواص وھی اصناف کل	کے اعتبار سے مختلف ہیں ۔ اور
صنف مختص بخاصیة واحدة	وہ چند قسم کے ہیں ۔ ہر ایک
بالنوع لا توجد فی الصنف	قسم ایک نوع خاص کی خاصیت

الاخر و صارت تلک الخواص فطرة و جبلة لصنفها فنفوس الانبياء عليهم الصلواة والسلام لها خاصية تستعد بها المعرفة الربانية و مخاطبة الملائكة عليهم السلام عن الله سبحانه و تعالٰى كماموما يتبع ذلك من التاثير فى الاكوان و استجلاب روحانية الكواكب التصرف فيها والتاثير بقوة نفسانية او شيطانية فاما تاثير الانبياء فمددالهى وخاصية ربانية و نفوس الكهنة لها خاصية الاطلاع على المغيبات بقوىٰ شيطانية و هكذا كل صنف مختص بخاصية لا توجد فى الاخر و النفوس الساخرة على مراتب ثلاثة ياتى شرحهافا و لها الموثرة بالهمة فقط من غير الة و لا معين و هذا هو الذى تسمية الفلاسفة السحر و الثانى

کے ساتھ مخصوص ھے کہ جو دوسری قسم میں نہیں پائی جاتی - اور یہ خاصیتیں آن کی جبلت اور سرشت ھیں - پس انبیا علیہم اسلام کے نفوس کو ایک خاص مناسبت ہوتی ھے جس کی وجہ سے وہ خدا کی معرفت اور فرشتوں سے (جو خدا کی طرف سے آتے ھیں) بات چیت کی - اور اس قسم کے اور کام کی یعنی موجودات میں تاثیر کی - اور ستاروں کی روحانیت کی تسخیر کی آن میں تصرف کرنے کی غرض سے قائل ہوتے ھیں - اور تاثیر قوت نفسانیہ سے ہوتی ھے یا شیطانیہ سے - لیکن انبیاء کی تاثیر تو وہ امداد الٰہی اور خاصیت ربانی ھے اور جادوگروں کے نفوس کو غائب چیزوں پر اطلاع حاصل کرنے کی خاصیت قوائے شیطانیہ کے ذریعہ سے ھے اور اسی طرح ہر ایک قسم ایک خاصیت کے ساتھ مخصوص ھے جوکہ دوسری میں نہیں پائی جاتی اور جادوگروں کے نفوس کے مختلف درجے ھیں

بمعين من مزاج الافلاک
او العناصر او خواص
الاعداد و يسمونها الطلسمات
و هی اضعف رتبة من الاول
و الثالث تاثير فی القوی
المتخيلة يعمد صاحب
هذا التاثير الی القوی
المتخيله - فيتصرف
فيهابنوع من التصرف
و يلقی فيها انواعا من
الخيالات و المحاكات وصورا
مما يقصد من ذلک ثم
ينزلها الی الحس من
الرائين بقوة نفسه الموثرة
فيه فينظر الراؤن كانها
فی الخارج و ليس هناک
شيئا من ذلک كما يحكی
عن بعضهم انه يری
البساتين و الانهار و القصور
و ليس هناک شی من ذلک
ويسمی هذا عند الفلاسفة
الشعوذة او الشعبذة هذا
تفصيل مراتبه ثم هذه
الخاصية تكون فی الساحر
بالقوة شان القوی لبشرية

جن کی تفصیل آتی ہے - قسم
اول تو صرف همت کے ذریعه سے
بغیر کسی آله اور مددگار کے
تاثیر کرنے والی هیں اور فلاسفه
اسی کو سحر کہتے هیں - دوسری
قسم بذریعه کسی معین کی تاثیر
کے ہے یعنی افلاک یا عناصر
کے مزاج یا عددوں کی خاصیتوں
سے اور اس کو طلسمات کہتے
هیں اور یه قسم اول سے رتبه
میں کم ہے - تیسری قسم خیالی
قوتوں میں تاثیر کرنا ہے - اس
تاثیر والا آدمی قوائے متخیله کی
طرف توجه کرتا ہے پس اُن میں
ایک خاص قسم کا تصرف کرتا ہے
اور میں طرح طرح کے خیالات اور
گفتگو اور صورتیں جو کچھ اُس
کو مقصود هوتی هیں ڈالتا ہے
پھر اُن کو دیکھنے والوں کی
حس پر ڈھالتا ہے اپنے نفس موثره
کی قوت کے ذریعه سے - سو
دیکھنے والے ایسا دیکھتے هیں
که گویا وه خارج میں موجود
هیں اور حالاں که وهاں کچھ
نہیں هوتا - جیسا که بعض

لوگوں کا قصه بیان کیا جاتا هے وه باغ ، نهریں ، مکانات دیکھتے هیں اور وهاں کچھ نہیں هوتا ۔

کلها و انما تخرج الی الفعل بالریاضة ۔
(مقدمه ابن خلدون صفحه ۵۱۴)

فلاسفه کے نزدیک یه شعوده یا شعبده هے ۔ یه اُس کے مراتب کی تفصیل هے ۔ پھر یه خاصیت ساحر میں اور قوائے بشریه کی طرح بالقوه موجود هوتی هے مگر ریاضت کرنے سے بالفعل موجود هو جاتی هے ۔

ابن خلدون نے جو سحر کے تین درجے قرار دیے هیں حقیقت میں وه تینوں سے واحد هیں پہلا درجه صرف همت کی تاثیر قرار دیا هے اور تیسرا درجه متخیله میں چیزوں کا جمع کرکے دوسرے کے متخیله میں اُس کا القاء کرنا قرار دیا هے ۔ یه قسم درحقیقت صرف همت هی سے متعلق هے کوئی شے اُس سے علیحده نہیں هے. دوسرا درجه امداد کا مزاج افلاک و عناصر اور خواص اعداد سے قرار دیا هے حالاں که اس بات کے لیے که افلاک وکواکب و اعداد سے درحقیت اس میں کچھ اعانت هوتی هے کچھ ثبوت نہیں هے پس یه دوسری قسم محض فرضی هے اور تینوں قسمیں قسم واحد هیں ۔ یعنی صرف همت سے تاثیرات کا ظهور ۔

اسی قوت نفسی کے آثار جب انبیاء علیهم السلام سے ظاهر هوتے هیں تو اُس کو معجزه سے تعبیر کیا جاتا هے ابن خلدون نے معجزه اور سحر میں یه فرق بتلایا هے که اُن کے نزدیک (یعنی حکمائے الهیین کے نزدیک) معجزه و سحر میں یه فرق هے [illegible] معجزه ایک قوت الٰہی هے

و الفرق عند هم بین المعجزة و السحران المعجزة قوة الهیة تبعث فی النفس ذلک التاثیر فهو مؤید بروح الله علی فعله ذلک و الساحر انما یفعل ذلک من عند نفسه و بقوته

النفسانية و بامداد الشياطين
فی بعض الاحوال فبينهما
الفرق فی المعقولية و
الحقيقة و الذات فی نفس
الامر و انمانستدل نحن علی
التفرقة بالعلامات الظاهرة
وهی وجود المعجزة لصاحب
الخير و فی مقاصد الخير و
النفوس المتمحضة للخير
و التحدی بها علی دعوی
النبوة و السحر انما يوجد
لصاحب الشرو فی افعال
الشر فی الغالب من التفريق
بين الزوجين و ضرر الا عداء
و اشال ذلک و للنفوس
المتمحضة للشر هذا هو
الفرق بينهما عند الحکماء
الا لهيين و قد يوجد لبعض
المتصوفة و اصحاب
الکرامات تاثير ايضا فی
احوال العالم و ليس معدودا
من جنس السحر و انما هو
بالا مداد الا لهی لان طريقهتم
و نحلتم من اثار النبوة
توابعها و لهم فی الم...

جو نفس میں اس تاثیر کو
برانگیختہ کرتی ہے - پس وہ
شخص (صاحب معجزہ) اس کام
کے کرنے میں خدا کی روح سے
تائید یافتہ ہوتا ہے اور ساحر
اسی کام کو اپنی طرف سے اور
قوت نفسانیہ کے ذریعہ سے اور
بعض حالتوں میں شیاطین کی
مدد سے کرتا ہے - پس ان دونوں
میں معقولیت ، حقیقت ، ذات ،
کی رو سے ایک واقعی فرق ہے
اور ہم اس تفرقہ پر ظاہری
علامتوں سے استدلال کرتے ہیں
اور وہ یہ کہ معجزہ اچھے شخص
سے اچھے مقصدوں کے لیے ہوتا
ہے اور نفوس متمحصہ سے اچھے
کام کے لیے دعوای نبوت پر تحدی
کے لئے ہوتا ہے اور سحر برے
آدمی سے برے کام کے لیے -
اکثر مرد و عورت میں جدائی
ڈالنے کے لیے دشمنوں کو ضرر
پہنچانے کے لیے اور اسی قسم
کے کاموں کے لیے ہوتا ہے اور
نفوس متمحضہ سے شر کے لیے
ہوتا ہے - حکمائے الٰہیین کے

الالهٰی حظ علیٰ قدر
حالهم و ایمانهم و تمسکهم
بکلمة الله و اذ اقتدراحدمنهم
علیٰ افعال الشر فلا یاتیها
لانه متقید فیما یاتیه
ویذره لله امر الالهٰی فما لا
یقع لهم فیه الاذن لا
یاتونه بوجه و من اتاه
منهم فقد عدل عن طریق
الحق و ربما سلب حاله
و لما کانت المعجزة بامداد
روح الله و القوی الالهیة
فلذلک لا یعارضها شئی
من السحر ۔ (مقدمه ابن
خلدون ۔ صفحه ۳۱۹)

واما الفرق عندهم
بین المعجزة والسحر فالذی
ذکره المتکلمون انه راجع
الی التحدی و هو دعویٰ
وقوعها علی وفق ما ادعاه
قالوا و الساحر مصروف عن
مثل هذا التحدی فلایقع
منه و وقوع المعجزة علی
و فق دعویٰ الکاذب غیر
مقدور و لان دلالة المعجزة

نزدیک تو معجزہ و سحر میں یہ
فرق ہے اور کبھی بعض صوفیوں
سے اور کرامت والوں سے عالم
کے حالات میں تاثیر پائی جاتی
ہے مگر اس کا شمار سحر کی جنس
میں نہیں ہے ۔ بلکہ وہ تائید
الٰہی سے ہوتا ہے کیوں کہ
اُن کا طور طریق نبوت کے آثارات
اور توابع میں سے ہے اور تائید
الٰہی میں ۔ علیٰ قدر مراتب اور
خدا سے تقرب کے لحاظ سے
اُن کو بھی حصہ ملا ہوا ہے
اور جب اُن میں کا کوئی شخص
افعال شر پر قادر ہوتا ہے تو
اُس کو کر نہیں سکتا ہے کیوں کہ
وہ اپنے کام میں پابند ہے اور
اُس کو خدا کے حکم پر چھوڑ
رکھا ہے اور جس میں خدا کا
حکم نہیں ہوتا ہے اُس کو وہ
کسی طرح نہیں کرتا اور اگر
کسی نے کیا تو وہ راہ حق سے
منحرف ہوگیا اور اکثر اُس کی
کرامت مسلوب ہو جاتی ہے اور
کیوں کہ معجزہ خدا کی مدد اور
ائی قوتوں کی وجہ سے ہوتا

علی الصدق عقلیة لان صفة نفسها التصدیق فلو وقعت مع الکذب لاستحال الصادق کاذبا وهو محال فاذا لا تقع المعجزة مع الکاذب بالاخلاق و اما الحکماء فالفرق بینهما عندهم کما ذکرناه فرق بین الخیر و الشر فی نهایت الطرفین فالساحر لا یصدر منه الخیر و لا یستعمل فی اسباب الخیر و صاحب المعجزة لا یصدر منه الشر و لا یستعمل فی اسباب الشر و کانهما علی طرفی النقیض فی اصل فطرتهما (مقدمہ ابن خلدون صفحہ ٤٢٠)

ہے تو سحر اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتا لیکن اُن لوگوں کے نزدیک معجزہ و سحر میں فرق یہ ہے کہ متکلمین تو کہتے ہیں کہ اُس کا مروج تحدی کی طرف ہے اور تحدی کے معنی ہیں معجزہ کے وقوع کا دعویٰ کرنا اپنے دعویٰ کے موافق اور متکلمین کہتے ہیں کہ ساحر اس قسم کی تحدی سے معذور ہے۔ اس لیے اُس سے تحدی ہو نہیں سکتی اور جھوٹے شخص کے دعویٰ کے موافق معجزہ کا واقع ہونا ناممکن ہے کیوں کہ معجزہ کی دلالت سچائی پر عقلی ہے اس لیے کہ معجزہ تصدیق کی خاص صفت ہے تو وہ اگر جھوٹ کے ساتھ واقع ہو تو سچی چیز جھوٹی ٹھہر جائے۔ پس معجزہ مطلقاً جھوٹے سے نہیں سر زد ہو سکتا۔ لیکن حکما کے نزدیک تو جیسا ہم نے ذکر کیا معجزہ و سحر میں خیر و شر کا فرق ہے اور وہ بھی انتہا کے کناروں کا۔ تو ساحر سے اچھا کام نہیں ہوتا اور نہ وہ اس کو اچھے کام کے اسباب میں صرف کرتا ہے اور صاحب معجزہ سے شر نہیں صادر ہوتا نہ وہ اُس کو اسباب شر میں استعمال کر سکتا ہے گویا وہ دونوں خلقت ہی سے مخالفت کی اخیر سرحد پر ہیں۔

بو علی سینا نے معجزہ یا کرامات کی نسبت یہ لکھا ہے کہ۔

لا تستبعدن ان یکون | تم اس بات کو بعید نہ سمجھو

لبعض النفوس ملكة
يتعدى تاثيرها بدنها
او يكون لقوتها كانها
نفس ما للعالم وكما تاثر
بكيفية مزاجية يكون
قد اثرت لمبدأ جميع ما
عددته اذ مباديها هذه
الكيفيات لا سيما فى جرم
صارا ولى بد لمناسبة تخصه
مع بدنه لا سيما وقد
علمت انه ليس كل مسخن
بحار ولا كل مبرد ببارد و
لا تستنكرن ان يكون لبعض
النفوس هذه القوة حتى
يفعل فى اجرام اخرينفعل
عنها انفعال بدنه و
لا يستنكرن ان يتعدى من
قواها الخاصة الى قوى
نفوس اخرى يفعل فيها
لا سيما اذا كانت شحذت
ملكتها بقهر قواها
البدنية التى لها فتقهر
شهوة او غضبا او خوفا من
غيرها ـ هذه القوة
ربما كانت للنفس بحسب

که بعض نفسوں کو ایسا ملکه
هو جس سے اُس کی تاثیر اُس کے
بدن تک پہنچے یا وه اپنی قوت
کی وجه سے گویا که عالم
کے لیے بمنزله نفس کے هو اور
جیسا که وه کیفیت مزاجیه کی
وجه سے اثر کرتی هے تو وه کسی
مبدء کی وجه سے وه سب پر اثر
کرے جن کو هم نے گنایا هے
کیوں که اُس کے مبادی بھی
کیفیتیں هیں خصوصاً اس جرم
میں جس کے ساتھ وه زیاده مناسب
هے بوجه اُس مناسبت کے جو
که اُس کو اپنے بدن کے ساتھ هے ـ
بالخصوص جب تم یه بات معلوم
کر چکے هو که هر مسخن گرم
نہیں هے نه هر مبرد سرد هے اور
اس بات کا انکار نه کرو که
بعض نفسوں کو یه قوت اس
درجه تک هو که دوسرے اجسام
میں اثر کرے اور وه ایسا هی
منفعل هو جیسا که اُس نفس کا
بدن اور اس بات کا انکار نه کرو
که وه اپنی خاص قوت سے تجاوز
کر کے دوسرے نفسوں پر اثر

المزاج الا صلی لما یفیده من هیئة نفسانیة تصیر للنفس الشخصیة لتشخصها وقد تحصل لمزاج یحصل و قد یحصل بضرب من الکسب یجعل النفس کالمجردة لشدة الذکاء کما یحصل الاولیاه و للابرار ـ و الذی یقع له هذا فی جبلة النفس ثم یکون خیر ارشیدا مزکیا لنفسه فهوذ و معجزة من الانبیاء اوکرامة من الا ولیاء و تزیده تزکیة لنفسه من هذا المعنی زیادة علی مقتضی جبلة فیبلغ المبلغ الا قصی و الذی یقع له هذا ثم یکون شریرا و یستعمله فی الشر فهو الساحر الخبیث و قد یکسر قدر نفسه من غلوئه فی هذا المعنٰی فلا یلحق شیئا من الا زکیاء فیه ـ (اشارات بو علی سینا) ـ

کرے خصوصاً جب که اس نے اپنے ملکه کو قوائے بدنیه کے زیر کر لینے سے تیز کر لیا هو ـ پس وه دبا لیتا هے شهوت کو یا غصه کو یا دوسرے سے خوف کو ـ یه قوت اکثر نفس کو اصلی سرشت کے اعتبار سے هوتی هے جو که اس کو هیئت نفسانیه سے پهنچتی هے اور نفس شخصیه کے لیے بذ اتها هوتی هے اور کبهی کسی مزاج کی وجه سے حاصل هوتی هے اور کبهی کسی قسم کی کوشش کی وجه سے هوتی هے جو که نفس کو نهایت تیزی کی وجه سے مجرد سا بنا دیتی هے جیسا که اولیا اور نیک لوگوں کو حاصل هوتا هے اور جس شخص کی سرشت میں یه قوت هو پهر وه شخص نیک هدایت یافته هو اور اس کا نفس پاک هو تو وه نبی اور صاحب مُعجزه هوتا هے یا ولی صاحب کرامت هوتا هے اور جب وه نفس کا تزکیه کرتا هے تو اصل خلقت سے اور زیاده ترقی کر جاتا هے اور نهایت اونچے درجے تک پهنچ جاتا هے اور جس کو یه قوت هے

اور وہ شریر ہے اور اس قوت کو برے کام میں صرف کرتا ہے تو وہ خبیث ساحر ہے اور کبھی وہ اس کام میں زیادہ غلو کرنے کی وجہ سے اپنے نفس کی قدر کو اور بھی گھٹا دیتا ہے تو وہ اچھوں کی کسی بات کو نہیں پہنچتا ۔

ہم کو اس مقام پر اس بات سے بحث کرنی کہ معجزہ و سحر میں کیا فرق ہے اور انبیاء علیہم السلام سے جو اثر نفسی ظاھر ہوتے ھیں وہ کس مبدء سے ہوتے ھیں اور اولیاء اللہ سے کس کی تائید سے اور کفار و مشرکین یا خبیث انسانوں سے کس کی مدد سے کچھ ضرورت نہیں ہے بلکہ صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ جو کچھ ھوتا ہے اور جس سے ھوتا ہے وہ خود اس کے اثر نفسی سے ھوتا ہے جو حسب فطرت انسانی خدا نے اس میں اور کسی نہ کسی قدر تمام انسانوں میں رکھا ہے ۔ پس اگر یہ سچ ہے تو ھم اس کو نہ معجزہ قرار دے سکتے ھیں نہ سحر نہ کرامت اور نہ استدراج ۔ جیسے کہ ھم انسان کے دوسرے قوی کے اثروں کو بھی معجزہ یا سحر یا کرامت یا استدراج قرار نہیں دیتے ۔

علاوہ اس کے جب کہ یہ بات ثابت ھوتی ہے کہ اکثر ان اثروں کا ظہور ایسا ھی خیالی و وھمی ہے جیسے کہ خواب میں ان چیزوں کا ظہور جن کو دیکھنے والا صرف خواب ھی میں دیکھتا ہے اور ان کا وجود در حقیقت اور فی الواقع کچھ نہیں ھوتا تو ھم کو جرأت نہیں پڑتی کہ ایسی بے اصل چیزوں کو فخریہ طور پر انبیاء علیہم السلام کے معجزے اور اولیاء اللہ کی کرامتیں اور بے اعتقادی سے کافروں کا سحر اور استدراج قرار دیں ۔

ھم کو اور اسلام کو تو فخر اس بات پر ہے کہ ھمارے برحق پیغمبر خدا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف صاف کہہ دیا کہ میرے پاس تو کوئی معجزہ وعجزہ نہیں ہے اگر ھوگا

تو خدا کے پاس ہوگا میں تو مثل تمھارے ایک آدمی ہوں خدا نے مجھ کو وحی کی ہے میں تم کو بری باتوں سے ڈراتا ہوں اور اچھی باتوں کی خوش خبری دیتا ہوں ۔

ہم کو اور اسلام کو تو اُس سچے ہادی پر فخر ہے جس نے نہ لکڑی کو سانپ کر دکھایا اور نہ اپنے دست مبارک کو چمکایا نہ سچی بات پر کچھ پردہ ڈالا ۔ نہ خدا کی قدرت کے قانون کو توڑنے کا دعویٰ کیا اور سیدھی طرح لوگوں کو سچا رستہ بتایا اور فخر اولین اور آخرین اور خاتم النبیین ہونے کا درجہ پایا ۔ یا ایھا الذین امنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما ۔

سوم ۔ بیان تخیل تحرک حبل و عصائے سحرۂ فرعون
چہارم ۔ بیان عصائے موسیٰ علیہ السلام
پنجم ۔ بیان یدبیضاء

یہ تینوں امر ایسے ہیں جن کا یک شامل بیان کرنا مناسب ہے ۔ اس مقام پر ہم ان تمام آیتوں سے بحث کریں گے جن میں ان امورسہ گانہ کا ذکر ہے ۔

ثعبان

اس میں کچھ شبہ نہیں ہو سکتا کہ مصر میں جس قدر اُن لوگوں کی کثرت تھی جو ساحر کہلاتے تھے اور جو جو کرشمے وہ لوگوں کو دکھاتے تھے اُس سے حضرت موسیٰ بخوبی واقف تھے ۔ جب حضرت موسیٰ اپنی قوم کی ہمدردی اور اپنی قوم کو فرعون سے ظلم سے رہائی دینے پر مائل یا مامور ہوئے تو یہ ایک قدرتی بات ہے کہ اُن کو اس بات کا خیال ہوا ہوگا کہ وہاں تو بڑے بڑے کرشمے دکھانے والے ہیں میں اُن پر کیوں کر غالب آؤں گا ۔ اُن کو خدا نے بتایا و ما تلک بیمینک

یا موسیٰ قال ہی عصای
اتوکؤ علیہا و اہش بہا
علیٰ غنمی ولی فیہا مارب
اخری قال القہا یا موسیٰ
فالقاہا فاذا ہی حیۃ
تسعی - قال خذہا و لاتخف
سنعیدہا سیرتہا الاولی -
واضمم یدک الی جناحک
تخرج بیضاء من غیر سوء
آیۃ اخری (٢٠ - سورہ طٰہٰ
آیت ١٨ - ٢٣) -

کہ تو بھی ویسے ہی کام کر سکتا
ہے - خدا نے پوچھا کہ تیرے
ہاتھ میں کیا ہے موسیٰ نے
کہا میری لاٹھی ہے جس کو
میں ٹیک لیتا ہوں اور اُس سے
بھیڑوں کو ہنکاتا ہوں اور
میرے اور کام میں بھی آتی ہے -
خدا نے کہا اے موسیٰ اس کو
ڈال تو دے - پھر جب موسیٰ
نے اُس لاٹھی کو ڈال دیا تو
وہ یکایک اژدہا تھی چلتی
ہوئی - خدا نے کہا اُس کو اُٹھا لے اور مت ڈر ہم اُس کو پہلی
ہی سیرت پر پھر کر دیں گے اور اپنے ہاتھ کو بغل میں رکھ کر
نکال چٹا بے عیب یہ دوسری نشانی ہے -

یہی مضمون سورۂ نمل میں بھی آیا ہے خدا نے موسیٰ سے

و الق عصاک فلما را
ہا تہتز کانہا جان ولی
مدبرا و لم یعقب یا
موسیٰ لا تخف انی لا یخاف
لدی المرسلون - و ادخل
یدک فی جیبک تخرج
بیضاء من غیر سوء فی تسع
آیات الی فرعون و قومہ
انہم کانوا قوما فسقین
(٢٧ - سورہ نمل - ١٠ و ١٢) -

کہنا کہ اپنی لاٹھی ڈال دے -
جب موسیٰ نے دیکھا کہ وہ
تو ہلتی ہے گویا وہ اژدہا ہے
تو پیٹھ پھیر کر پیچھے ہٹے اور
پھر پلٹ کر رخ نہ کیا - خدا نے
کہا اے موسیٰ مت ڈر میرے
پاس پیغمبر ڈرا نہیں کرتے اور
اپنے ہاتھ کو اپنی جیب میں
ڈال کر نکال چٹا بے عیب -
(جا) نو نشانیاں لے کر فرعون اور
اُس کی قوم کے پاس بے شک وہ قوم ہے نافرمان -

سورہ قصص میں یہ فرمایا ہے کہ اپنی لاٹھی ڈال پھر جب موسیٰ نے دیکھا کہ وہ ہلتی ہے گویا کہ وہ اژدھا ہے پیٹھ پھیر کر پیچھے ہٹے اور پھر پلٹ کر رخ نہ کیا ۔ خدا نے کہا اے موسیٰ آگے آ اور مت ڈر بے شک تو ہے امن والوں میں سے ۔ اپنے ہاتھ کو اپنی جیب میں ڈال کر چٹا بے عیب نکال اور اپنے دونوں بازوؤں کو خوف سے ملا پس یہ دونوں دو برہان ہیں تیرے رب کی طرف فرعون کے اور اُس کے سرداروں کے بے شک وہ لوگ نافرمان تھے ۔

و ان الق عصاک فلما راھا تھتز کانھا جان ولی مدبرا ولم یعقب یا موسیٰ اقبل و لا تخف انک من الامنین اسلک یدک فی جیبک تخرج بیضاء من غیر سوء و اضمم الیک جناحک من الرھب فذانک برھانان من ربک الی فرعون و ملائہ انھم کانوا قوما فاسقین (۲۸ - سورہ قصص - ۳۱ و ۳۲) -

ان آیتوں پر غور کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کیفیت جو حضرت موسیٰ پر طاری ہوئی اُسی قوت نفس انسان کا ظہور تھا جس کا اثر خود اُن پر ہوا تھا ۔ یہ کوئی معجزہ مافوق الفطرت نہ تھا اور نہ اس پہاڑ کی تلی میں جہاں یہ امر واقع ہوا کسی معجزہ کے دکھانے کا موقع تھا اور نہ یہ تصور ہو سکتا ہے کہ وہ پہاڑ کی تلی کوئی مکتب تھا جہاں پیغمبروں کو معجزے سکھائے جاتے ہوں اور معجزوں کی مشق کرائی جاتی ہو ۔ حضرت موسیٰ میں ازروے فطرت و جبلت کے وہ قوت نہایت قوی تھی جس سے اس قسم کے اثر ظاہر ہوتے ہیں ۔ اُنھوں نے اس خیال سے کہ وہ لکڑی سانپ ہے اپنی لاٹھی پھینکی اور وہ اُن کو سانپ یا اژدھا دکھائی دی ۔ یہ خود اُن کا تصرف اپنے خیال میں تھا وہ لکڑی لکڑی

هی تھی اُس میں فی الواقع کچھ تبدیلی نہیں هوئی تھی - خدا تعالیٰ نے کسی جگہ یہ نہیں فرمایا کہ فانقلبت العصا ثعبانا - یعنی وہ لاٹھی بدل کر اژدها هوگئی بلکہ سورہ نمل میں فرمایا - کانها جان - یعنی گویا وہ اژدها هے - اس سے ظاهر هے کہ در حقیقت وہ اژدها نہیں هوئی تھی بلکہ وہ لاٹھی کی لاٹھی هی تھی -

اس کے بعد جب حضرت موسیٰ فرعون کے پاس گئے تو فرعون نے کہا کہ اگر تم سچے هو تو کوئی کرشمہ دکھاؤ - حضرت موسیٰ نے اپنی لاٹھی کو اُس کے آگے ڈال دیا پھر وہ یکایک اژدها ظاهر هوئی -

فالقے عصاہ فاذا هی ثعبان مبین (۷ - سورہ اعراف - ۱۰۴) (۲۶ - سورہ شعرا - ۳۱) -

صاحب تفسیر کبیر نے باوجود کہ نہایت بے سرو پا قصے ان واقعات کی نسبت لکھے هیں مگر اُن کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا هے کہ وہ لاٹھی دیکھنے والوں کو اژدها معلوم هوئی نہ یہ کہ در حقیقت وہ اژدها هو گئی تھی چناں چہ تفسیر کبیر میں لکھا هے کہ خدا کا جو یہ قول هے کہ حضرت موسیٰ نے فرعون سے کہا کہ اگر میں تجھ کو علانیہ کرشمہ دکھاؤں جب بھی تو مجھے قید کرے گا - تو یہ کہنا اس بات پر دلیل هے کہ لاٹھی کے ڈالنے سے پہلے خدا نے حضرت موسیٰ کو بتلا دیا تھا کہ وہ اژدها هو جائے گی - کیوں کہ اگر یہ نہ هوتا تو جو

اعلم ان قوله و لو جئتک بشئی مبین یدل علی ان الله تعالیٰ قبل ان القی العصا عرفه بانه یصیرها ثعبانا و لو لا ذالک لما قال ما قال فلما القی عصاہ ظهر ما وعد الله به فصار ثعبانا مبینا و المراد انه تبین للناظرین انه ثعبان بحرکاته وسائر العلامات (تفسیر کبیر جلد ۵ صفحه ۵۲) -

بات حضرت موسیٰ نے کہی وہ نہ کہتے - پھر جب حضرت موسیٰ نے لاٹھی پھینکی تو وہ چیز ظاہر ہوئی جس کا وعدہ اللہ نے کیا تھا پھر لاٹھی علانیہ اژدھا ہوگئی اور علانیہ اژدہ ہو جانے سے مراد یہ ہے کہ وہ لاٹھی دیکھنے والوں کو ہلنے سے اور اور تمام نشانیوں سے اژدھا معلوم ہوئی -

اس کے بعد وہ واقعہ ہے جو حضرت موسیٰ اور سحرہ فرعون میں واقع ہوا اور جس کا ذکر ذکر مندرجہ حاشیہ آیتوں میں ہے اُن آیتوں کا مضمون یہ ہے کہ جب فرعون کے ساحر جمع ہوگئے تو اُنھوں نے کہا اے موسیٰ یا تو تم ڈالو نہیں تو ہم پہلے ڈالتے ہیں - موسیٰ نے کہا کہ تم ہی ڈالو - پھر جب اُنھوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں ڈالیں لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور اُن کو ڈرا دیا اور ایک بڑا جادو کیا اور فرعون کی جے پکاری کہ ہم بے شک موسیٰ پر غالب ہوئے پس یکایک اُن کی رسیاں اور لاٹھیاں موسیٰ کے خیال میں اُن کے جادو کے سبب سے معلوم ہوئیں کہ وہ چلتی ہیں - پھر موسیٰ کے دل میں

فلما جاء السحرة قال لهم موسیٰ القوا ما انتم ملقون فلما القوا قال موسیٰ ما جئتم بر السحر ان الله سیبطله ان الله لا یصلح عمل المفسدین (سورہ یونس آیت ۸۰ و ۸۱) -

قال لهم موسیٰ القوا ما انتم ملقون فالقوا حبالهم وعصیهم و قالوا بعزة فرعون انا لنحن الغالبون فالقی موسیٰ عصاء فاذا هی تلقف ما یافکون -

(سورہ شعرا آیت ۴۳ و ۴۴) -

قالوا یا موسیٰ اما ان تلقی و اما نکون نحن الملقین قال القوا فلما القوا سحروا اعین الناس و استرهبوهم

و جاؤ ا بسحر عظیم و اوحینا الی موسیٰ ان الق عصاک فاذا ھی تلقف مایا فکون۔

(سورہ اعراف آیت ۱۱۰ - ۱۱۴)۔

ڈر سا بیدا ھوا ۔ ھم نے کہا کہ تو مت ڈر تو ھی آن پر غالب ھے ۔ موسیٰ ۔ فرعون کے ساحروں سے کہا کہ جو کرشمہ تم نے کیا وہ جادو ھے اللہ تعالیٰ ابھی آس کو مٹا دے گا بے شک اللہ مفسدوں کے کام کو نہیں سنوارتا ۔ خدا

قالو ایموسیٰ اما ان تلقی و اما ان نکون اول من القی قال بل القوا فاذ احبالھم و عصیھم یخیل الیہ من سحرھم انھا تسعیٰ فا و حبس فی نفسہ خیفة موسیٰ قلنا لا تخف انک انت الا علیٰ والق ما فی یمینک تلقف ما صنعو انما صنعو اکید ساحر و لا یفلح الساحر حیث اتی ۔

(سورہ طہ آیت ٦٧ - ٧٢)۔

موسیٰ سے کہا کہ ڈال دے جو تیرے دائیں ھاتھ میں ھے نگل جاوے گا جو کچھ آنھوں نے کیا ھے جو کچھ آنھوں ۔ کیا ھے جادو گروں کا مکر ھے اور جادو گر کو جہاں جاوے فلاح نہیں ھے پس موسیٰ نے اپنی لاٹھی ڈال دی پھر یکایک وہ سب کو نگلنے لگی ۔

سورہ اعراف کی آیت میں جس پر باقی آیتیں محمول ھین (لا نھا یفسر بعضھا بعضا) ایک جملہ آیا ھے کہ سحروا اعین الناس یعنی لوگوں کو ڈھٹ بندی کر دی پس یہ جملہ صاف اس بات پر دلالت کرتا ھے کہ در حقیقت وہ لاٹھیاں یا رسیاں سانپ اور اژدھے نہیں ھوگئی تھیں بلکہ بہ سبب تاثیر قوت نفس انسانی کے جو ساحروں نے کسب سے حاصل کی تھیں وہ رسیاں اور لاٹھیاں لوگوں کو سانپ اور اژدھے معلوم ھوتی تھیں ۔

حضرت موسیٰ نے جوکچھ کیا وہ بمقتضائے قوت نفس تھا انسانی
کوئی امر مافوق الفطرت نہ تھا مگر وہ قوت حضرت موسیٰ میں
اور فطری جبلی تھی -

اس امر کو علمائے متقدمین نے بھی تسلیم کیا ھے چناں چه

ثم قال تعالیٰ فلما القوا
سحروا اعین الناس و احتج
به القائلون بان السحر محض
التمویة قال القاضی لوکان
السحر حقا لکانوا قد سحروا
قلوبهم لا اعینهم فثبت
ان المراد انهم تخیلوا احوالا
عجیبة مع ان الامر فی
الحقیقة ما کان علیٰ وفق
ما خیلوه -
(تفسیر کبیر جلد ٣ صفحه ٦٨٢ -
سوره اعراف) -

تفسیر کبیر میں لکھا ھے که
خدا تعالیٰ نے جو یه فرمایا ھے
که جب سحره فرعون نے اپنی
رسیاں اور لاٹھیاں ڈال دیں تو
آنھوں نے لوگوں کی آنکھوں
پر جادو کیا تو جادو کے لفظ
پر لوگوں نے دلیل پکڑی ھے
که سحر صرف دھوکا ھے - قاضی
کا قول ھے که اگر جادو بر حق
ھوتا تو وہ لوگوں کے دلوں پر
جادو کرتے نه که اُن کی آنکھوں
پر - پس ثابت ھوا که اس سے
مراد یه ھے که آنھوں نے لوگوں کے خیال میں عجیب باتیں ڈالی
تھیں با اینهمه حقیقت میں وہ باتیں ایسی نه تھیں جیسی که لوگوں
کے خیال میں پڑی تھیں - یعنی وہ لاٹھیاں اور رسیاں در حقیقت
سانپ اور اژدھے نہیں بنی تھیں بلکه صرف لوگوں کے خیال میں
ایسی معلوم ھوتی تھیں اور یه بات آسی تاثیر قوت نفس انسانی
کے سبب تھی جو ساحروں میں بذریعه کسب اور موسیٰ میں
بحسب فطرت تھی مگر حقیقت میں نه ساحروں کی رسیاں اور لاٹھیاں
سانپ اور اژدھا بنی تھیں اور نه حضرت موسیٰ کی -

ید بیضا

جب کہ یہ بات تسلیم کی گئی کہ انسان میں ایک ایسی قوت ہے کہ انسان اُس کے ذریعہ سے قوائے متخیلہ کی طرف توجہ کرتا ہے اور پھر اُس میں ایک خاص قسم کا تصرف کرتا ہے اور اُن میں طرح طرح کے خیالات اور گفتگو اور صورتیں جو کچھ اُس کو مقصود ہوتی ہیں ڈالتا ہے پھر اُن کو اپنے نفس مؤثرہ کی قوت سے دیکھنے والوں کی حس پر ڈالتا ہے ۔ پھر دیکھنے والے ایسا ہی دیکھتے ہیں کہ گویا وہ خارج میں موجود ہے حالاں کہ وہاں کچھ بھی نہیں ہوتا ۔ اور قرآن مجید کے الفاظ سے جو آیات مذکورہ بالا میں گذرے ہیں اور جن سے پایا جاتا ہے کہ لاٹھیاں اور رسیاں اسی قوت متخلیہ کے سبب سانپ یا اژدھے دکھائی دیتی تھیں تو یدبیضا کا مسئلہ از خود حل ہو جاتا ہے کیوں کہ اس کا بھی لوگوں کو اس طرح پر دکھائی دینا اُسی قوت نفس انسانی اور تصرف قوت متخیلہ کا سبب تھا نہ یہ کہ وہ کوئی معجزہ مافوق الفطرت تھا ۔ اور در حقیقت حضرت موسیٰ کے ہاتھ کی ماہیئت بدل جاتی تھی ۔ جہاں قرآن مجید میں یدبیضا کا ذکر آیا ہے وہاں یہ مضمون بھی موجود ہے کہ جب حضرت موسیٰ نے اپنا ہاتھ

و نزع یدہ فاذا ھی بیضاء للناظرین (سورہ اعراف و سورہ شعراء ۔ ۳۲ ، ۱۰۵)

نکالا تو وہ یکایک چٹا تھا دیکھنے والوں کے لیے ۔ اور یہ مضمون صاف اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ دیکھنے والوں کی نگاہ میں وہ چٹا دکھائی دیتا تھا جو اثر قوت نفس انسانی کا تھا نہ کوئی معجزہ مافوق الفطرت ۔

اس مقام پر یہ سوال ہو سکتا ہے کہ اگر عصائے موسیٰ کا اژدھا بننا اور ہاتھ کا چٹا ہو جانا اُسی قسم کی قوت نفسی سے

لوگوں کو دکھائی دیتا تھا جس طرح کی قوت نفسی سے سحرہ فرعون کی رسیاں و لاٹھیاں سانپ دکھلائی دیتی تھیں اور کوئی معجزہ مافوق الفطرت نہ تھا تو خدا نے عصا و یدبیضا کی نسبت یہ کیوں فرمایا کہ ” فذا نک برہان من ربک“ یعنی اُن کو خدا کی طرف سے برہان کیوں تعبیر کیا ہے ۔ مگر برہان کہنے کی وجہ یہ ہے کہ عصائے موسیٰ کا اژدہا مرئی ہونا یا ہاتھ کا چٹا دکھائی دینا فرعون اور اُس کے سرداروں پر بطور حجت الزامی کے تھا وہ اس قسم کے امور کو دلیل اس بات کی سمجھتے تھے کہ جس شخص سے ایسے امور ظاہر ہوتے ہیں وہ کامل ہوتا ہے اور اسی لیے اُنھوں نے حضرت موسیٰ سے بھی کرشمہ دکھلانے کی خواہش کی تھی ۔ پس اُن دونوں چیزوں پر بمقابلہ فرعون اور اُس کے سرداروں کے برہان سے تعبیر کرنا بالکل صحیح تھا اور اسی سبب سے اُنھوں نے کہا کہ اگر کوئی کرشمہ دکھلایا جاوے گا تو وہ موسیٰ کو سچا جانیں گے ۔ خود اسی آیت میں بمقابل فرعون اوز اُس کے سرداروں کے اُن دونوں امر کو برہان قرار دینے کی وجہ بیان ہوئی ہے کہ ” انھم کانوا قوما فاسقین“ فاسق کا لفظ نہایت وسیع معنی رکھتا ہے ۔ فرعون اور اُس کے سرداروں کا ساحروں پر بہ سبب اُن کے کرشموں کے اعتقاد رکھنا بھی فسق میں داخل تھا پس خدا نے فرمایا کہ یہ دونوں امر ایسی قوم کے لیے جو ساحروں کے کرشموں پر یقین رکھتے ہیں خدا کی طرف سے برہان ہیں ۔ پس برہان کا لفظ اُن بیانات کے منافی نہیں ہے جو ہم نے اُوپر بیان کیے ہیں ۔

سورہ نمل میں خدا تعالیٰ نے عصا کے ذکر کے بعد فرمایا کہ ” و ادخل یدک فی جیبک تخرج بیضاء من غیر سوء فی تسع ایات الی فرعون و قومہ“ لفظ تسع ایات پر مفسرین نے بحث کی ہے کہ نو نشانیوں سے کیا مراد ہے ۔

امام فخر الدین رازی نے اس آیت کی تفسیر میں عصا اور یدبیضا کے علاوہ یہ نو نشانیان بیان کی ھیں۔ دریا کا پھٹ جانا، طوفان کا ھونا، ٹڈیوں کا آنا، پسوؤں کا پیدا کرنا، مینڈکوں کا پیدا ھونا، پانی کا خون ھو جانا، مال و دولت مویشی میں کمی کا ھونا، قحط پڑنا، کھیتوں کی پیداوار کا گھٹ جانا۔

لقائل ان یقول کانت الایات احدی عشر ثنتان منها الید و العصا و التسع الفلق و الطوفان و الجرد و القمل و الضفادع و الدم و الطمسة و الجذب فی بوادیهم و النقعان فی مزارعهم۔

(تفسیر کبیر، جلد پنجم، صفحه ۸۱)۔

اور اسی مقام پر یه بھی لکھا ھے که "فی تسع ایات" جمله مستانفه ھے یعنی علیحده کلام ھے اور اس کی تقریر یوں ھے که "اذهب فی تسع آیات الٰی فرعون" یعنی عصا اور ید بیضا کا ذکر علیحده ھو چکا اس کے سوا نو نشانیاں اور دیں که وه لے کر فرعون کے پاس جا۔

مگر یه بیان صحیح نہیں اس لیے که وه نو چیزیں جن کا ذکر کیا ھے بطور نشانی کے نہیں دی گئی تھیں بلکه فرعون اور اس کی قوم پر به سبب نافرمانی کے بطور عذاب کے نازل ھوئی تھیں جن کو قرآن مجید نے بھی "رجز" سے تعبیر کیا ھے پس ان واقعات کو تسع آیات قرار دینا صحیح نہیں ھو سکتا۔

سوره بنی اسرائیل میں بھی تسع آیات کا ذکر ھے اور اس کی نسبت مفسرین نے یه سمجھا ھے که اس آیت میں تسع آیات سے وه نو احکام مراد ھیں جو حضرت

و لقد آتینا موسٰی تسع آیات بینات فاسئل بنی اسرائیل اذا جاءهم

فقال له فرعون انی لا ظنک
یا موسٰی مسحورا قال لقد
علمت ما انزل هٰولاء الارب
السموات و الارض بصائروانی
لا ظنک یا فرعون مثبورا
(سوره بنی اسرائیل آیت ۱۰۳) -

موسٰی نے بنی اسرائیل سے کہے
تھے - مفسرین کا ایسا خیال کرنا
غالباً اس آیت کے ان الفاظ کی
بنا پر ہے ''فاسئل بنی اسرائیل
اذ جاء هم'' یعنی خدا نے
فرمایا کہ بنی اسرائیل سے
دریافت کر جب موسٰی اُن کے پاس آئے تو وہ نو احکام بتائے تھے -
اس خیال پر ہمارے راویوں نے ایک حدیث بھی بیان کر دی اور
مفسرین نے قبول کر لی اور کہا کہ یہی قول سب سے اچھا ہے -

تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ تسع آیات کے بیان میں متعدد
اقوال ہیں سب سے اچھا قول یہ
ہے کہ جو صفوان ابن عسال نے
کہا ہے کہ ایک یہودی نے
اپنے دوست سے کہا کہ پیغمبر کے
پاس چلو اُن سے پوچھیں کہ وہ
نو احکام کیا تھے - وہ آئے اور
پوچھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا کہ وہ یہ تھے - خدا
کے ساتھ کسی کو شریک مت
کرو - چوری نہ کرو - زنا نہ
کرو - قتل مت کرو - سحر مت
کرو - سود نہ کھاؤ - عورتوں
پر زنا کا اتہام مت کرو - لڑائی
میں بھاگو نہیں اور بالتخصیص
یہودیوں کے لیے یہ حکم ہیں

فی تفسیر قوله تعالٰی
آیات بینات اقوال اجودها
ماروی صفوان ابن عسال
انه قال ان یهود یا قال
لصاحبه اذهب بنا الی
هذا النبی نساله عن تسع
آیات فذهبا الی النبی
صلی الله علیه وسلم و ساله
عنها فقال هن ان لا تشرکوا
با لله شیئا و لا تسرقوا - و
لا تزنوا - ولا تقتلوا و لا
تسحروا - و لا تاکلوا الربا -
و لا تقذفوا المحصنة و لا
تولوا الفرار - یوم الزحف -
علیکم خاصة الیهودان

لا تعتدوا فی السبت فقام الیهودیان فقبلا یدیه و رجلیه و قالوا اشهد انک نبی ولو لا نخاف القتل لا تبعناک ۔ (تفسیر کبیر جلد چهارم ، صفحه ۲۸۵)

که سبت کے دن زیادتی نه کرو۔ یه سن کر وه دونوں یهودی کهڑے هوئے اور آنحضرت صلی الله علیه وسلم کے هاتھ اور پاؤں چومے اور کہا که هم گواهی دیتے هیں که بے شک آپ نبی هیں اگر هم کو مارے جانے کا ڈر نه هوتا تو هم آپ کی پیروی کرتے ۔

مگر مفسرین کا یه خیال که جن تسع آیات کا ذکر سوره نمل کی آیت میں هے وه تو نو نشانیاں تهیں جو حضرت موسیٰ فرعون کے پاس لے گئے تهے اور جن تسع آیات کا ذکر سوره بنی اسرائیل میں هے وه نو احکام بنی اسرائیل کے لیے تهے صحیح نہیں معلوم هوتا ۔ کیوں که اُسی آیت میں ذکر هے که تسع آیات کے جواب میں فرعون نے کہا که اے موسیٰ میں تو تجھ کو سحر زده سمجھتا هوں اور اس سے ثابت هے که وه احکام فرعون اور اُس کی قوم کے لیے تهے نه بنی اسرائیل کے لیے اور " فاسئل بنی اسرائیل اذ جاء هم " بطور جمله معترضه کے آیا هے اُس سے یه استدلال کرنا که وه احکام بنی اسرائیل کے لیے تهے صحیح نہیں هے ۔

غرض که هماری تحقیق میں دونوں آیتوں میں تسع آیات سے وه احکام مراد هیں جو حضرت موسیٰ فرعون اور اُس کی قوم کے پاس لے گئے تهے ۔ یه بات قابل تسلیم کے هے که قرآن مجید میں اُن نو احکام کا ایک جگه شمار نہیں کیا گیا هے بلکه جا بجا متعدد احکام کا ذکر آیا هے اگر اُن سب پر غور کیا جاوے تو وه احکام هماری سمجھ میں مندرجه ذیل معلوم هوتے هیں ۔

۱۔ توحید ۔ کما قال الله تعالیٰ انی انا الله لا اله الا انا ۔

۲- اقرار بالرسالة - کما قال انا رسولا ربک -
۳- منع شرک سے - کما قال فاعبدنی -
۴- اقامت صلٰوة - کما قال اقم الصلٰوة لذکری -
۵- جزا و سزا - کما قال تجزی کل نفس بما تسعٰی -
۶- اعتقاد آخرت - کما قال ان الساعة آتیة -
۷- نزول عذاب منکرین پر - کما ان العذاب علی من کذب و تولی -
۸- منع تعدی سے بنی اسرائیل پر - کما قال لا تعذبهم -
۹- رہا کرنا بنی اسرائیل کا - کما قال - ارسل معنا بنی اسرائیل -

یہ تمام آیتیں جن کا اشارہ ہم نے کیا عام آیتیں نہیں ہیں بلکہ خاص آیتیں ہیں جو حضرت موسٰی اور بنی اسرائیل کے قصہ میں وارد ہوئی ہیں اور اسی سبب سے ہم نے خیال کیا ہے کہ یہ وہ احکام ہیں جو حضرت موسٰی خدا کی طرف سے فرعون کے پاس لے گئے تھے -

ششم قتل اولاد

بنی اسرائیل کے لڑکوں یا مردوں کا قتل کوئی ایسا امر نہیں ہے جس کو کسی کرشمہ کی بنا قرار دیا جاوے اگرچہ مفسرین نے اس کی بنا بھی ایک کرشمہ پر قائم کی ہے یعنی بعضوں نے تو یہ کہا ہے کہ کاهنوں نے فرعون سے کہا تھا کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہوگا جو تیری سلطنت کو

و اذ نجینا کم من آل فرعون یسومونکم سوء العذاب یذبحون ابناءکم و یستحیون نساءکم و فی ذالکم بلاء من ربکم عظیم -
۲- سوره بقر - ۴۶ -

اذ نجینکم من آل فرعون یسومونکم

سوءالعذاب یقتلون ابناءکم و یستحیون نساءکم و فی ذالکم بلاء من ربکم عظیم -

(۷- سوره عراف - ١٣٧)

اذ قال موسیٰ لقومه اذکروا نعمة الله علیکم اذا نجاکم من آل فرعون یسومونکم سوء العذاب و یذبحون ابناءکم و یستحیون نساءکم و فی ذالکم بلاء من ربکم عظیم -

(١۴ - سوره ابراهیم - ٦)

ان فرعون علا فی الارض و جعل اهلها شیعا یستضعف طائفة منهم یذبح ابناءهم و یستحیی نساءهم انه کان من المفسدین - و زیدان نمن علی الذین استضعفوا فی الارض و نجعلهم ائمة و نجعلهم الوارثین - و نمکن لهم فی الارض و نری فرعون و هامان و جنودهما منهم ما کانوا یحذرون -

(٢٨- سوره قصص ٣ - ۵)

برباد کر دے گا - پس اس تاریخ میں جو کاهنوں نے مقرر کی تھی جس قدر لڑکے پیدا هوئے اُن کو فرعون نے مروا ڈالا - اور بعضوں نے یه کہا که یه قتل صرف اُس تاریخ پر منحصر نہیں رہا بلکه یه قتل برسوں تک جاری رہا اور نوے هزار لڑکے قتل هوئے - بعض مفسرین نے لکھا هے که فرعون نے ایک خواب دیکھا که بیت المقدس سے ایک آگ آئی اور اُس آگ نے مصر کو گھیر لیا اور تمام قبطیوں کو جلا دیا اور صرف بنی اسرائیل بچ رہے - لوگوں نے اُس کی تعبیر دی که اُس شہر سے جہاں سے بنی اسرائیل آئے هیں ایک شخص آوے گا اُس کے هاتھ سے مصر کی سلطنت برباد هوگی اس پر فرعون نے بنی اسرائیل کے مردوں کے قتل کرنے کا حکم دیا -

مگر قرآن مجید میں ان دونوں باتوں میں سے کسی کا کچھ اشاره نہیں هے اور نه بنی

فلما جاءهم بالحق من عندنا قالوا اقتلوا ابناء الذين آمنوا معه و استحیوا نساءهم و ما کید الکافرین الا فی ضلال ۔ و قال فرعون ذرونی اقتل موسیٰ و لیدع ربه انی اخاف ان یبدل دینکم اوان یظهر فی الارض الفساد ۔

(۴۰- سوره مومن - ۲۶ و ۲۷)

اسرائیل کے قتل کی بنا کسی اور کرشمه پر بیان ہوئی ہے ۔ قرآن مجید میں جو بات پائی جاتی ہے وہ صرف اس قدر ہے که بنی اسرائیل کی کثرت سے فرعون اور اس کے سرداروں کو اندیشه ہو گیا تھا که یه لوگ فساد کرکے مصر کی سلطنت کو برباد کر دیں گے اور اس کے انسداد کے لیے یه تدبیر کی تھی که جو لڑکے پیدا ہوتے تھے اُن کو قتل کروا ڈالتا تھا تاکه مرد جن سے لڑنے کا اور فساد ہونے کا اندیشه تھا زیادہ نه ہونے پاویں ۔ چناں چه سوره قصص میں صاف لکھا ہے که فرعون کی سلطنت ملک میں بہت زبردست ہوگئی تھی اور اُس کے لوگوں کو گروہ گروہ کر دیا تھا اور ایک گروہ کو یعنی بنی اسرائیل کو اُن میں سے ضعیف کر دیا تھا اُن کے لڑکوں کو مار ڈالتا تھا اور عورتوں کو زندہ رکھتا تھا خدا نے چاہا که اُس ضعیف گروہ پر مہربانی کرے اور اُنھیں کو سردار بنا دے اور اُنھیں کو وارث کرے اور ملک مین اُنھیں کو قدرت دے اور دکھلا دے فرعون اور اُس کے لشکر کو اس ضعیف گروہ سے وہ چیز جس سے وہ ڈرتے تھے ۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے که پہلی دفعه یعنی قبل از ولادت حضرت موسیٰ جو فرعون نے قتل اولاد بنی اسرائیل کا حکم دیا تھا وہ صرف اس خوف سے تھا که وہ به سبب کثیر ہونے کے فساد کر کے ملک کو نه چھین لیں ۔ کچھ عجب نہیں که یه قتل کسی مدت تک رہا ہو اور پھر موقوف ہوگیا ہو ۔

یہ پہلا حکم قتل اولاد بنی اسرائیل کا تھا مگر جب حضرت موسیٰ فرعون کے پاس آئے اور خدا کے حکم پہنچائے اور کہا کہ بنی اسرائیل کو چھوڑ دو اُس وقت پر فرعون کو بنی اسرائیل کے فساد کرنے کا اور اپنی سلطنت کے زوال کا خوف ہوا اور دوبارہ اُس نے تدبیر کی کہ بنی اسرائیل کے لڑکوں کو مار ڈالنا چاہیے ۔ چناں چہ سورہ مومن میں خدا نے صاف بیان کیا ہے کہ جب ہمارے پاس سے سچی بات فرعون اور اُس کے سرداروں کے پاس پہنچی تو اُنھوں نے کہا کہ مار ڈالو اُن کے لڑکوں کو جو موسیٰ پر ایمان لائے ہیں اور اُن کی عورتوں کو زندہ رکھو اور فرعون نے کہا کہ ٹھیرو میں موسیٰ کو مار ڈالوں گا مجھ کو خوف ہے کہ وہ تمھارے دین کو بدل دے گا اور ملک میں فساد پھیلا دے گا ۔ پس صاف ظاہر ہے کہ اسی خوف سے دونوں دفعہ فرعون نے بنی اسرائیل کے لڑکوں یا مردوں کے قتل کا حکم دیا تھا کوئی اور غیبی کرشمہ اُس کی بنیاد نہ تھا ۔

ہفتم قحط ، ہشتم طوفان ، وجراد ، وقمل وصفادع ، ودم

یہ تمام اُمور ایسے ہیں جو ہمیشہ دنیا میں موافق قانون قدرت واقع ہوتے رہتے ہیں حضرت موسیٰ کے زمانہ میں بھی واقع ہوئے تھے ۔ ایسے واقعات کو انسانوں کے گناہوں سے منسوب کرنا بھی قانون فطرت کے تابع ہے جس پر انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوتے ہیں اس کی بحث قوم عاد کے قصہ میں بالتفصیل لکھ چکے ہیں اس طرح ان واقعات ارضی و سماوی کو بھی خدا تعالیٰ نے فرعون اور اُس کی قوم کے گناہوں سے منسوب کیا ہے ۔

قحط کوئی نئی بات نہیں تھی حضرت یوسف کے زمانے میں بھی سخت قحط پڑا تھا حضرت موسیٰ کے زمانہ میں بھی قحط ہوا

جو حضرت موسیٰ کے قصہ میں مذکور ہے -

طوفان - دریائے نیل کی زیادہ طغیانی سے ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی مینہ اور اولونکا طوفان بھی آجاتا ہے شام کے پہاڑوں سے اولے برستے ہوئے کبھی کبھی مصر تک پہنچ جاتے ہیں بجلی کی چمک اور گرج بھی ہوتی ہے (دیکھو کیٹوکی بیبکل سیکلوپیڈیا ، صفحہ ٦۰۰) جن ملکوں میں بارش قلیل ہوتی ہے اور اولے اتفاقیہ پڑتے ہیں اُن ملکوں میں اس قدر بارش بھی جو اور ملکوں میں معمولی خیال کی جاتی ہے نہایت سخت طوفان کا اثر دکھاتی ہے خصوصاً اُس حالت میں جب کہ دریا کی طغیانی بھی اور خصوصاً نیل جیسے دریا کی طغیانی اُس کے ساتھ ہو تو پھر قیامت ہی ہوتی ہے - پس موسیٰ کے عہد میں طوفان کا واقعہ ایک معمولی واقعہ سے زیادہ کچھ نہیں تھا - جو بزرگی اُس میں تھی وہ صرف یہی تھی کہ اُس زمانہ میں واقع ہوا جب کہ حضرت موسیٰ وہاں تشریف لے گئے تھے -

جراد و قمل و ضفادع - یعنی ٹڈیوں پسوؤں یا اسی قسم کے کسی جانوروں اور مینڈکوں کا کثرت سے پیدا ہو جانا خصوصاً طوفان اور دریائے نیل کے چڑھاؤ کے اُترنے کے بعد ایک ایسی بات ہے جو قدرتی طور پر واقع ہوتی ہے حشرات الارض دفعةً اس کثرت سے پیدا ہو جاتے ہیں جن کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے - پس حضرت موسیٰ کے عہد میں اُن حشرات الارض کا پیدا ہو جانا جس قدر کثرت سے وہ پیدا ہوگئے ہوں اور کیسی ہی سخت مصیبت اُن کے سبب سے مصریوں پر پڑی ہو کوئی ایسی تعجب خیز بات نہیں ہے جس کو ایک لمحہ کے لیے بھی واقعہ ما فوق الفطرت تصور کیا جاوے -

دم کا لفظ البتہ لوگوں کو حیرت میں ڈالتا ہوگا - بعض مفسرین نے اس بات کو کہ تمام دریا اور حوض اور تمام پانی جو

برتنوں میں تھا خون ہو گیا غیر قابل یقین خیال کر کے یہ لکھا کہ فرعون اور اس کی تمام قوم کو نکسیر بہنے یعنی ناک سے خون جاری ہونے کی بیماری ہو گئی تھی ۔ گو کہ کسی وباء کا پھیل جانا خصوصاً قحط و طوفان کے بعد کوئی امر بعید از عقل نہیں ہے ۔ لیکن اصل بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ دریائے نیل کا پانی اگرچہ عموماً نیلے رنگ کا رہتا ہے مگر کبھی طغیانی کے زمانہ میں اس کا رنگ سرخ لال اینٹ کے گہرے رنگ کی مانند ہو جاتا ہے (دیکھو کیٹو ببکل سیکلوپیڈیا صفحہ ۵۹۹) اور (چیمبرز انسیکلوپیڈیا جلد سوم ، صفحہ ۷۸۶) اور جب کبھی نباتی مادہ کثرت سے آ جاتا ہے تو سبز ہو جاتا ہے (دیکھو انسیکلوپیڈیا برطینیکا ، صفحہ ۴۲۲) پس اسی قسم کے واقعات کے سبب سے اس کا پانی سرخ ہوگیا جس کو دم سے تعبیر کیا ہے ۔

بعض اوقات پانی میں نہایت باریک کیڑے سرخ رنگ کے اس قدر کثرت سے پیدا ہو جاتے ہیں کہ تمام پانی کا رنگ سرخ ہو جاتا ہے بحر احمر میں بھی اس قسم کی حالت پائی جاتی ہے ۔ بحر احمر کے حال میں سالٹ نے لکھا ہے کہ فروری کے مہینہ میں ایک دفعہ جہاز کے گرد کچھ دور تک سمندر نہایت سرخ ہوگیا چوں کہ اس عجیب تبدیلی کا باعث ہم دریافت کرنا چاہتے تھے ہم نے ایک برتن کو پانی میں ڈالا اور اس میں بہت سی وہ چیزیں نکالیں جو پانی پر تیر رہی تھیں وہ جیلی کے مشابہ ایک چیز تھی جس میں بے انتہا چھوٹے چھوٹے کیڑے تھے اور ہر ایک کے اوپر ایک سرخ دھبہ تھا یہ جانور ایک جگہ جمع ہونے سے ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے پانی میں کوئی سرخ چیز گھول دی ہو ۔ ارن برگ کو بھی جو ایک بہت بڑا نیچرل فلاسفی کا عالم تھا ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا اور اس نے بھی بحر احمر کی ایسی حالت ہو جانے کی

تصدیق کی ھے -

پس یہی حالت دریائے نیل کی بھی ھوگی اور جب که ثابت ھوا ھے که اُس کا پانی بھی کبھی سرخ ھو جاتا ھے تو اُس کی ایسی حالت ھو جانے پر زیادہ یقین ھوتا ھے - ان کیڑوں کا بہت کثرت سے پانی میں جمع ھو جانا بلا شبه لوگوں کو استعمال سے باز رکھتا ھوگا اور وہ پانی نا قابل استعمال ھو جاتا ھوگا - فرعون کے زمانه میں بھی دریاے نیل سے گھروں میں اور کنوؤں اور حوضوں میں نلوں کے ذریعه سے پانی لے گئے تھے پس جہاں جہاں اُس کا پانی جاتا ھوگا سب جگه یہی حال ھوگیا ھوگا - اُس پانی کو لوگوں نے بلا خیال برتنوں میں بھر لیا ھوگا اور تھوڑی دیر بعد دیکھا ھوگا که وہ سرخ مثل خون کے ھے - اونچے مقاموں میں جہاں دریائے نیل کا پانی نه جاتا ھوگا وھاں یه کیفیت نه ھوئی ھوگی اور ممکن ھے که بنی اسرائیل اونچی زمین پر رھتے ھوں جہاں نیل کا پانی نه جاتا ھو یا اُن کے گھروں میں پانی جانے کے نل نه ھوں اور اُن کے گھروں میں یه کیفیت نه ھوئی ھو -

نہم - غرق فی البحر

فرعون کا بنی اسرائیل کے تعاقب میں جانا اور بنی اسرائیل کا دریا کے پار اُتر جانا اور فرعون کا دریا میں ڈوب جانا ایک تاریخی واقعه ھے اور ھم اُس کو نہایت تفصیل سے ایک دوسرے مضمون میں بیان کریں گے -

دہم - اعتکاف حضرت موسیٰ کا پہاڑ میں

و واعدنا موسیٰ ثلثین لیلة و اتممنٰها بعشر فتم

اعتکاف کا واقعه اُس زمانه کا ھے جب که حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو فرعون کی قید سے چھوڑا کر اور فرعون کو

میقات ربه اربعین لیلة ۔
(۷- سوره اعراف - ۱۳۸)

اور اُس کے لشکر کو دریا میں ڈبو کر اُس جنگل میں نکال لائے جو بحر احمر کی دونوں شاخوں کے درمیان میں ہے اور جس کا نقشه هم پہلے ایک مضمون میں دے چکے هیں ۔

و اذ وعدنا موسیٰ اربعین لیلة ثم اتخذ تـم العجل من بعده و انتم ظالمون ۔
(۲- سوره بقر - ۴۸)

یه کوئی امر زیاده بحث کے قابل نہیں حضرت موسیٰ تیس دن کا اعتکاف کرنے کے لیے پہاڑ گئے تاکه خدا کی عبادت میں مصروف هوں مگر وهاں چالیس دن لگ گئے ۔ توریت میں لکھا ہے که چالیس دن اور چالیس رات موسیٰ پہاڑ پر رہے اور نه روٹی کھائی نه پانی پیا (سفر توریه مثنی باب ۹ ورس ۹) زیاده تر مقصود اس اعتکاف سے یه تھا که خدا کی هدایت اس بات میں چاهیں که اُس جم غفیر کی هدایت و انتظام اور خدا کی عبادت کے لیے کیا قواعد یا احکام قرار دیے جاویں ۔

بنی اسرائیل کو چار سو برس سے زیاده هو گئے تھے که مصر میں رهتے تھے اورگو وه خدا کو مانتے تھے مگر وهاں کی بت پرستی اور اُس کی شان و شوکت کے عادی هو گئے تھے اور ظاهر میں بھی معبود کے وجود کے موجود هونے کی خواهش مثل بت پرستوں کے اُن کے دل میں سما گئی تھی اس لیے نہایت مشکل بات تھی که اُن کو ایک ایسے خدائے واحد کی پرستش پر متوجه کیا جاوے جس کا نه ظاهر میں کوئی وجود ہے ، نه ظاهری وجود میں اور نه کسی ظاهری شکل میں آ سکتا ہے بلکه محض بیچون و بیچگون و بے رنگ و نمون ہے ۔ غالباً یہی بات سب سے زیاده حضرت موسیٰ کو بھی مشکل تھی اور وه ضرور اس خیال میں تھے که حصید کو ظاهری صورتوں سے اس طرح بنایا جاوے جن کی عبادت تو نه کی جاوے

مگر بنی اسرائیل کی دل بستگی کا ذریعه هوں ۔ اور اسی وجه سے
آنهوں نے بعد میں کروبین کی مجسم شکلیں چاندی و سونے کی
بنائیں ۔ هم قبول کرتے هیں که آنهوں نے خدا کے حکم سے
بنائی هوں گی ، مگر بنائیں ۔ جس کا سبب بجز مذکورہ بالا امر کے
اور کچھ نه تها ۔ اور اسی لیے هم کهه سکتے هیں که جو سچی
اور ٹهیٹ خدا پرستی آسی طرح بیچون و بیچگون و بے رنگ و نمون
طریقه پر جیسا که وہ معبود حقیقی هے محمد رسول الله صلی الله
علیه وسلم نے قائم کی موسیٰ سے باوجود اس شان و شوکت کے
قائم نہیں هو سکی ، نه هم کو کروبین کی حاجت هے ، نه هائی
پریسٹ کی ، نه کسی معبد کی ، نه قربانی سوختنی کی ، نه بخور کی ،
اور نه آتش دان کی ، نه خاص پوشاک اور سینه بند کی ، هم سچے
خدا کی پرستش ، جنگل میں ، دریا میں ، پہاڑ میں ، گهر میں ، بازار
میں ، اندهیرے میں ، آجالے میں ، کپڑا پہنے ، بن کپڑا پہنے
کرسکتے هیں همارا دل هی خدا کا معبد هے همارا خدا هر جگه همارے
ساتھ هے اور هم خدا کے ساتھ اور یه ایسا ساتھ هے که نه کبھی
هم آس سے چهوٹ سکتے هیں اور نه وہ هم کو چهوڑ سکتا هے ۔
سبحانه و تعالیٰ شانه و الحمد لله رب العالمین ۔

یازدهم ۔ حقیقت کلام خدا با موسیٰ

کلام خدا کا جب تک نه سنیں یه تو معلوم نہیں هو سکتا
که کیسا هوتا هے ۔ مگر انسانوں کا کلام جو سننے میں آتا هے وہ
تو یه هے که زبان اور هونٹ هلتے هیں آس سے بمدد هوائے محیط
کے ایک آواز کان تک پہنچتی هے هر ایک لفظ کے بعد دوسرا لفظ
بلکه هر لفظ کے پہلے حرف کے بعد دوسرا حرف نکلتا هے اور حرفوں
سے مل کر لفظ اور لفظوں سے مل کر جمله هو جاتا هے ۔ پهر کیا
[illegible]کا کلام بھی ایسا هی هوتا هے ؟

علمائے اسلام نے کہا ہے کہ تمام انبیائے علیہم السلام نے خدا کو متکلم کہا ہے اور اُس کے کلام کو ثابت کیا ہے پس اُس کا متکلم ہونا اور خدا کے لیے کلام کا ہونا تو ثابت ہو گیا ۔ مگر اُنھوں نے یہ نہ بتایا کہ ایسا ہی کلام جیسا ہمارا تمہارا ہے یا کسی اور طرح کا لیکن اُنھوں نے اُس پر دوسری بحث قدیم اور حادث ہونے کی چھیڑ دی یعنی اس بات کی کہ خدا کا کلام قدیم ہے یا حادث ۔ ہم اُس بحث کو اس مقام پر لکھتے ہیں اور امید ہے کہ اُسی سے پتہ لگ جاوے گا کہ اُس کا کلام کیسا ہوتا ہے ۔

قاضی عضد اور علامہ سید شریف شرح مواقف میں تحریر فرماتے ہیں کہ خدا کے کلام کے قدیم و حادث ہونے پر دو متناقض قیاس ہیں ۔ ایک قیاس یہ ہے کہ ۔ خدا تعالیٰ کا کلام خدا تعالیٰ کی ایک صفت ہے اور جو صفت خدا کی ہے وہ قدیم ہے ۔ پس خدا کا کلام قدیم ہے ۔

دوسرا قیاس جو اس کے برخلاف ہے وہ یہ ہے کہ ۔ خدا کا کلام حرفوں و لفظوں کی ترتیب سے مل کر بنا ہے جو ایک بعد دوسرے کے وجود میں آئے ہیں اور جو چیز اس طرح پر بنتی ہے وہ حادث ہوتی ہے ۔ پس خدا کا کلام بھی حادث ہے ۔

حنبلی پہلے قیاس کو ٹھیک بتاتے ہیں اور اس بات کے قایل ہیں کہ خدا کے کلام میں حرف بھی ہیں اور آواز بھی ہے اور وہ دونوں اپنے آپ قائم ہیں اور قدیم ہیں پس کلام خدا کا بھی قدیم ہے ۔ پس گویا حنبلی دوسرے قیاس کے دوسرے جملہ کو کہ ”جو چیز اس طرح پر بنتی ہے وہ حادث ہوتی ہے“ نہیں مانتے ۔

قاضی عضد اور علامہ سید شریف دونوں بالاتفاق کہتے ہیں کہ حنبلیوں کا دوسرے قیاس کے دوسرے جملے کو نہ ماننا قطعاً

رے

غلط ہے کیوں کہ ہر ایک حرف اُن حرفوں میں سے جن سے اُن کے نزدیک کلام خدا کا مرکب ہے ایک حرف کے ختم ہونے پر دوسرے حرف کا شروع ہونا موقوف ہے تو وہ دوسرا حرف قدیم نہ ہوا اور جو کہ پہلے حرف کے لیے بھی ختم ہونا ہے تو وہ بھی قدیم نہ رہا اور جو کلام کہ ان سے مرکب ہو کر بنا ہے وہ بھی قدیم نہ رہا ۔

کرامیہ فرقہ اس بات میں کہ خدا کے کلام میں حرف اور آواز ہے حنبلیوں کے ساتھ متفق ہیں مگر وہ اس کو حاوث مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ خدا کی ذات میں قائم ہے کیوں کہ اس بات پر یقین کرتے ہیں کہ خدا کی ذات میں حوادث کا قائم ہونا جائز ہے ۔ پس گویا کرامیہ دوسرے قیاس کو تو صحیح مانتے ہیں اور پہلے قیاس کے دوسرے جملہ کو کہ ”جو صفت خدا کی ہے وہ قدیم ہے“ نہیں مانتے ۔

معتزلے خدا کے کلام میں آواز اور حرف کو اسی طرح پر مانتے ہیں جس طرح کہ حنبلی اور کرامیہ مانتے ہیں مگر وہ کہتے ہیں کہ آواز اور حرف خدا کی ذات میں قائم نہیں ہے بلکہ خدا اُس کو دوسری چیز میں پیدا کر دیتا ہے مثلاً لوح محفوظ میں یا جبرئیل میں یا نبی میں اس لیے خدا کا کلام حادث ہے ۔ پس معتزلے دوسرے قیاس کو صحیح سمجھتے ہیں اور پہلے قیاس کے پہلے جلمہ کو کہ ” خدا تعالیٰ کا کلام خدا تعالیٰ کی ایک صفت ہے“ نہیں مانتے ۔

اس پر قاضی عضد اور علامہ سید شریف فرماتے ہیں کہ جو کچھ معتزلے کہتے ہیں ہم اُس سے انکار نہیں کرتے بلکہ ہم بھی وہی کہتے ہیں مگر اُس کا نام کلام لفظی رکھتے ہیں اور اُس کو حادث مانتے ہیں اور ذات خدا تعالیٰ میں قائم نہیں کہتے ۔ اُس کے سوا ہم

ایک اور امر ثابت کرتے ہیں اور وہ معنی ہیں قائم بالنفس جس کو کہ لفظوں سے تعبیر کیا جاتا ہے اور وہی حقیقت میں کلام ہے اور وہی قدیم ہے اور وہی خدا تعالیٰ کی ذات میں قائم ہے - پس دوسرے قیاس کا جو دوسرا جملہ ہے کہ ''خدا کا کلام حرفوں و لفظوں کی ترتیب سے مل کر بنا ہے'' اس کو نہیں مانتے اور ہم یقین کرتے ہیں کہ معنی اور عبارت ایک نہیں ہیں کیوں کہ عبارت تو زمانہ میں اور ملک میں اور قوموں میں مختلف ہو جاتی ہے اور معنی جو قائم بالنفس ہیں وہ مختلف نہیں ہوتے بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ اُن معنوں پر دلالت کرنا بھی لفظوں ہی میں منحصر نہیں ہے کیوں کہ اُن معنوں پر کبھی اشارہ سے اور کبھی کنایہ سے اسی طرح پر دلالت کی جاتی ہے جیسے کہ عبارت سے اور مطلب جو کہ ایک معنی ہے قائم بالنفس وہ ایک ہی ہوتا ہے اور کچھ متغیر نہیں ہوتا باوجودیکہ عبارتیں بدل جاتی ہیں اور دلالتیں مختلف ہو جاتی ہیں اور جو چیز متغیر نہیں ہوتی وہ اُس چیز کے سوا ہے جو متغیر ہو جاتی ہے - یعنی جو چیز کہ متغیر نہیں ہوتی وہ تو معنی قائم بالنفس ہیں اور وہ اُس چیز سے جو متغیر ہو جاتی ہے یعنی عبارت سے علیحدہ ہیں - (انتہیٰ ملخصاً) -

جو کچھ کہ قاضی عضد اور علامہ سید شریف نے فرمایا ہے مذہب اہل سنت و جماعت کا ہے - اس سے پہلے کہ ہم اپنی تحقیق بیان کریں مناسب ہے کہ جو باتیں ان بزرگوں نے چھپا رکھی ہیں اُن کو کھول دیں تاکہ لوگوں کو صاف معلوم ہو جاوے کہ ان اصول کے ماننے سے جو اُن بزرگوں نے قرار دیے ہیں کیا نتیجہ پیدا ہوتا ہے -

معتزلیوں نے کہا تھا کہ آواز اور حرف دونوں خدا کی ذات میں قائم ہیں بلکہ وہ اُن کو دوسری چیز میں پیدا کر دیتا ہے ،

قاضی صاحب اور علامہ صاحب فرماتے ہیں کہ ہاں یہ صحیح ہے مگر ہم اُس کا نام کلام لفظی رکھتے ہیں۔ مگر یہ نہیں فرماتے کہ کس کا کلام لفظی۔ خدا کا یا اُس کا جس میں خدا نے اُس کو پیدا کر دیا تھا۔

پھر اُس پر زیادہ تحقیق یہ کرتے ہیں کہ صرف معانی قائم بالنفس اور غیر متغیر ہیں اور در حقیقت وہی کلام ہے اور وہی قدیم ہے اور اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ خدا کا کلام حرفوں و لفظوں کی ترکیب سے بنا ہے۔

اس بیان میں صریح نقص یہ ہے کہ اگر اُس کو تسلیم کر لیا جاوے تو جو الفاظ قرآن مجید کے ہیں وہ خدا کے لفظ نہیں رہتے بلکہ اُس کے لفظ ہوتے ہیں جس میں وہ پیدا کیے ہیں خواہ وہ جبرئیل ہوں یا نبی اور جو کہ وہ کلام اُنھی لفظوں سے مرکب ہوا ہے تو وہ کلام بھی اُسی شخص کا ہوا نہ خدا کا۔

میری تحقیق میں پہلا قیاس صحیح ہے اور میں خدا کے کلام کو اُس کی صفت سمجھتا ہوں اور تمام صفات خدا کو قدیم مانتا ہوں اور اسی لیے خدا کے کلام کو بھی قدیم یقین کرتا ہوں۔ مگر حنبلیوں اور کرامیوں سے اس بات میں مختلف ہوں کہ خدا کے کلام میں آواز ہے اور اہل سنت و جماعت کے اس مسئلہ سے مختلف ہوں کہ صرف معانی قائم بالنفس ہیں اور وہی در حقیقت کلام ہے اور وہی غیر متغیر ہے بلکہ میرے نزدیک معانی اور لفظ دونوں قائم بالنفس ہیں اور دونوں قدیم و غیر متغیر ہیں۔

لفظ بھی حقیقت میں ایک مفید یا مختص معانی ہیں جن پر بولے جانے کے بعد ہم لفظ کا اطلاق کرتے ہیں۔ انسان جو گفتگو کرتا ہے اُس وقت بھی الفاظ اُس کے نفس میں اُن کے بولے جانے کے قبل موجود ہوتے ہیں۔ مگر صرف معانی کو قائم فی الذات ماننے

اور معانی اور الفاظ دونوں کو قائم فی الذات ماننے میں یہ فرق ہے کہ پہلی صورت میں اُن معانی کو الفاظ مختصہ میں تعبیر کرنا لازم نہیں آتا اور دوسری صورت میں بجز الفاظ معینہ مختصہ کے اور کسی الفاظ سے تعبیر نہیں ہو سکتے ۔ مثلاً الحمد للہ کلام خدا ہے یہ ذات باری میں مع معانی و الفاظ کے اس طرح پر قائم ہے کہ جب تلفظ میں آوے گا تو الحمد للہ ہی اُس کا تلفظ ہوگا للہ الحمد اُس کا تلفظ نہیں ہونے کا ۔ نہ ثناء اللہ اُس کا تلفظ ہوگا اور ہم قرآن مجید کو اسی معنی کر مع معانی اور الفاظ کلام خدا کہتے ہیں اور قدیم تسلیم کرتے ہیں ۔

لفظوں کے قایم بالنفس ہونے میں تقدم و تاخر نہیں ہوتا ۔ اس کو مثال دے کر سمجھانا بلا شبہ مشکل ہے مگر اس طرح پر سمجھ میں یا خیال میں آ سکتا ہے کہ اگر جس طرح اُن الفاظ کے نقوش کو آئینہ کے سامنے رکھنے سے وہ سب معاً بلا تقدم و تاخر آئینہ میں منقش معلوم ہوتے ہیں اسی طرح الفاظ کے بھی بمعنی مذکورہ قائم فی الذات ہونے میں تقدم و تاخر لازم نہیں آتا ۔ ذات باری کی نسبت ہم ثابت کر چکے ہیں کہ وہ علة العلل تمام چیزوں کی ہے جو ہو چکیں اور ہوتی ہیں اور ہونے والی ہیں ۔ اس لیے ضرور ہے کہ وہ تمام چیزیں ذات باری میں قائم ہوں اُن کے ظہور کے زمانہ کے مختلف ہونے اور تبدیل کیفیت و کمیت سے اُس چیز میں جو قائم فی الذات ہے حدوث لازم نہیں آتا ۔

اس صورت میں قاضی عضد اور علامہ سید شریف کا یہ کہنا کہ ہر ایک حرف اُن حرفوں میں سے جن سے کلام خدا مرکب ہو ایک حرف کے ختم ہونے پر دوسرے حرف کا شروع ہونا موقوف ہے تو وہ دوسرا حرف قدیم نہ ہوا (الیٰ آخرہ) صحیح نہیں رہتا اس لیے کہ اس امر کا وقوع اُس وقت ہوتا جب کہ ہم کلام خدا

میں حرف اور آواز دونوں مانتے مگر جب ہم کلام خدا میں آواز کو تسلیم نہیں کرے تو نقص مذکورہ لازم نہیں آتا ۔

آواز کی کوئی دوسری حقیقت بجز اس کے کہ ہوا کی مدد اور زبان اور ہونٹوں کی حرکت سے پیدا ہوتی ہے ہم نہیں جانتے۔ پس اس کو بجنسہٖ خدا کی صفت قرار دینا اور یہ خیال کرنا کہ خدا کے منہ سے بھی مثل ہمارے منہ کے ایک حرف دوسرے حرف کے بعد نکلتا ہے بناء فاسد علی الفاسد ہے ۔ پہلے ایک غلط امر کو تسلیم کیا ہے پھر اس کی بنا پر دوسری غلطی قائم کی ہے ۔

جب کہ ہم کسی پر خواہ وہ جبرئیل ہو جو حسب اعتقاد جمہور مسلمین خدا اور انبیا میں مثل ایلچی کے واسطہ ہے۔ اور خواہ وہ خود نبی مبعوث ہو جیسا کہ میرا خاص اعتقاد ہے خدا کے کلام کا نازل ہونا کہتے ہیں تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ خدا نے اس کے دل میں بجنسہٖ وہ الفاظ جن کو بعد اس کے وہ تلفظ کرے گا مع ان کے معنی کے جو مقصود ہیں پیدا کیا ہے یا القا کیا ہے اور وہی لفظ بجنسہٖ نبی نے تلفظ کیے ہیں پس گو اس نبی کا ان لفظ ں کو تلفظ کرنا حادث ہو مگر وہ الفاظ مع ان کے معنی کے یا وہ معنی مقید جن کا تلفظ بجز انھی الفاظ کے نہیں ہو سکتا تھا قدیم اور کلام خدا ہیں اور یہی میرا اعتقاد قرآن مجید کی نسبت ہے کہ وہ بلفظہ مع معانیہا قدیم و کلام خدا ہے اور خود خدا نے اپنا کلام پیغمبر خدا میں بلا واسطہ پیدا کیا ہے جیسا کہ میں نے کسی مقام پر کہا ہے :

ز جبرئیل آمین قرآن بہ پیغامے نمے خواہم
ہمہ گفتار معشوق است قرآنے کہ من دارم

مگر پیغمبر خدا کا یا ہمارا ان لفظوں کو تلفظ کرنا حادث ہے ۔

اس مضمون کو بذریعہ کسی مثال کے سمجھانا بلا شبہ نہایت

مشکل ہے مگر ہم ایک قریب ترین مثال سے اُس کو سمجھاتے ہیں ۔ فرض کرو کہ ایک شخص کسی سبب سے بول نہیں سکتا مگر ایک اپنی تحریر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے جس کو ہم پڑھتے ہیں پس گو اُس تحریر میں آواز نہیں ہے مگر جو لفظ مطابق اُس تحریر کے ہماری زبان سے نکلتے ہیں وہ لفظ بلا شبہ اُسی کے ہیں جس نے اُس کو لکھا ہے اور ہم صرف اُن لفظوں کا تلفظ کرتے ہیں مگر در حقیقت وہ ہمارے لفظ نہیں ہیں اور یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ لفظ بر وقت ہمارے تلفظ کے پیدا ہوئے ہیں ۔

ہم اس بات سے انکار نہیں کرتے کہ انبیاء اور اولیاء کوئی غیبی آواز نہیں سنتے ۔ سنتے ہوں گے مگر وہ خدا کی آواز نہیں ہے بلکہ وہ اُس القا کا اثر ہے جو اُن پر ہوا ہے اور وہ اُنہی کے نفس کی آواز ہے جو اُن کے کان میں آئی ہے ۔ وہ بیداری میں اُسی طرح آواز کو سنتے ہیں جیسے کہ سوتے میں خواب دیکھنے والا سنتا ہے ۔ یا جیسے کہ بعضی دفعہ لوگوں کو جو کسی خیال میں مستغرق ہیں بغیر کسی بولنے والے کے کان میں آواز آتی ہے ۔

کلام الٰہی کی نسبت جو کچھ خدا نے ہمارے دل میں ڈالا ہے بعینہٖ وہ وہی ہے جو حضرت مولانا و مرشدنا حضرت شیخ احمد سرہندی نقشبندی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کو القا ہوا تھا چناں چہ اس باب میں جو حضرت ممدوح نے لکھا ہے ۔ ذیل میں مندرج ہے ۔

حضرت ممدوح نے مکتوب نود و دوم جلد سوم میں جو بنام فقیر ہاشم کشمی تحریر فرمایا ہے اس طرح پر لکھا ہے ۔ ” پرسیدہ بودند آں کہ بعض عرفا فرمودہ اند کہ ما کلام حق را مے شنویم دیا ما را با او تعالٰی مکالمہ مے شود چناں چہ از امام ہمام جعفر صادق رضی اللہ تعالٰی عنہ منقول است کہ گفت ما زلت اردد الایۃ حتی

سمعتها من المتکلم بها - و نیز از رساله غوثیه که منسوب بحضرت شیخ عبدالقادر جیلی است قدس سره، مفهوم مے گردد چه معنی است و تحقیق آن نزد تو چیست ؟ بدان ارشدک الله تعالیٰ که کلام حق جل و علا در رنگ ذات و سائر صفات حق جل شانه، بیچون بیچگون است و سماع آن کلام بیچون نیز بیچون است زیرا که چون را به بیچون راه نیست پس این سماع مربوط بحاسه سمع نه باشد که سراسر چون است آنجا اگر از بنده استماع است بتلقی روحانیست که نصیبے از بیچونی دارد و بے واسطه حروف و کلمات است و نیز اگر از بنده کلام است هم بالقاے روحانی است بے حروف و کلمه و این کلام نصیبے از بیچونی دارد که مسموع بیچون مے گردد یا آن که گوئم که کلام لفظی که از بنده صادر مے شود حضرت حق سبحان تعالیٰ آن را نیز به سماع بیچونی استماع مے فرماید و بے توسط حروف و کلمات و بے تقدیم و تاخیر آن را میشنود اذ لا یجری علیه تعالیٰ زمان یسع فیه التقدیم و التاخیروا دران موطن که از بنده سماع است بکلیت سامع و اگر کلام است هم بکلیة، متکلم تمام گوش و تمام زبان است روز میثاق ذرات مخرجه قول الست بربکم را بے واسطه بکلیت خود شنیدند و بکلیت خود جواب بلے گفتند تمام گوش بودند و تمام زبان زیرا که اگر گوش از زبان ستمیز بودے سماع کلام بیچون حاصل نیامدے و شایان ارتباط مرتبه بیچون نه گشتے لا یحمل عطا یا الملک الا مطایاه غایة ما فی الباب آن معنی متلقی از راه روحانیت اخذ نموده بود ثانیاً در عالم خیال که آن در انسان تمثال عالم مثال است بصورت حروف و کلمات مرتبه متمثل مے گردد و آن تلقی و القا بصورت سماع و کلام لفظی مرتسم مے شود چه هر معنی را دران عالم صورتے است اگرچه آن معنی بیچون بود اما ارتسام بیچون هم آنجا بصورت

چون است که فہم و افہام باں مربوط است که مقصود ازاں ارتسام است و چون سالک متوسط در خود حروف و کلمات مرتبه مے یابد و سماع و کلام لفظی احساس مے نماید خیال میکنند که ایں حروف و کلمات را از اصل شنیده است و بے تفاوت از انجا اخذ کرده نمے داند که ایں حروف و کلمات صور خیالیه آں معنی متلقی است و ایں سماع و کلام لفظی تمثال سماع و کلام بیچونی ، عارف تام المعرفت را باید که حکم هر مرتبه را جدا سازد و یکے را بدیگرے ملتبس نه گرداند پس سماع و کلام ایں اکابر که به مرتبه بیچونی مربوط است از قبیل تلقی و القاے روحانی است و ایں کلمات و حروف که تعبیر ازاں معنی متلقی باں مے نماید از عالم صور مثالیه ، و گروهے که گمان برده اند که ما حروف و کلمات را ازاں حضرت جل سلطانه استماع مے نمایم دو فریق اند یکے ازاں دو فریق که احسن حال اند مے گویند که ایں حروف و کلمات حادثه مسموعه دال اند براں کلام نفسے قدیم و فریق دیگر اطلاق قول بسماع کلام حق جل شانه مے نماید و همیں حروف و کلمات مرتبه را کلام حق میدانند جل و علا و فرق نمے کنند درمیان آں که لایق بشان او تعالیٰ کدام است ، و کدام است که شایان جناب قدس او نیست سبحانه و هم الجهال البطال لم یعرفوا ما یجوز علی الله سبحانه عما لا یجوز علیه تعالیٰ سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت السمیع العلیم الحکیم و الصلوة و السلام علیٰ خیر البشر و الٰه و اصحابه الاطهر''۔

حضرت موسیٰ اپنے مقام سے مع اپنے گھر والوں کے مصر کو روانہ ہوئے ۔ جو جو خیالات حضرت موسیٰ کو نسبت آن مشکلات کے ہوں گے جو مصر میں پیش آنے والی تھیں اور اپنی قوم کو فرعون کے ظلم سے نجات دینے کی مشکلات نے آن کے دل کو

کس قدر غمگین اور متفکر کیا ہوگا اور ان تمام حالتوں کے سبب اُن کو ذات باری میں کس قدر استغراق رہا ہوگا ۔ کیوں کہ ایسی مشکلات لا ینحل کے حل کرنے میں بجز ذات باری پر بھروسہ کے دوسرا کوئی بھروسہ نہ تھا ۔ یہ تمام اسباب تھے حضرت موسیٰ کو ذات باری میں کامل طور پر مستغرق ہو جانے کے اور فطرت نبوت جو خدا نے اُن میں پیدا کی تھی سب سے زیادہ اس استغراق کا باعث تھی ۔

اتفاق سے وہ رستہ بھولے ہوئے تھے جب اُنھوں نے ایک طرف آگ دیکھی تو اُس طرف گئے ۔ جب اُس کے قریب پہنچے تو اُنھوں نے اُس جنگل کو پہچانا کہ وہ وادی ایمن یا طویٰ ہے جو پہلے سے نہایت مقدس اور متبرک اور خدا کی جگہ سمجھا جاتا تھا ۔ دفعۃً اس بات کے معلوم ہونے سے خدا کی طرف طبیعت کا ذوق اور خدا کا شوق بھڑک اُٹھا اور اُن کے کان میں آواز آئی ۔ یا موسیٰ انی انا ربک ۔ انہ انا اللہ العزیز الحکیم ۔ انی انا اللہ رب العالمین ۔ فا خلع نعلیک انک بالوادی المقدس طویٰ ۔ یہ آواز کسی بولنے والے کی نہ تھی نہ خدا کی آواز تھی کیوں کہ جیسا ہم نے ابھی بیان کیا خدا کے کلام میں آواز نہیں ہوتی ۔ بے شک خدا نے یہ الفاظ جو کلام خدا تھے موسیٰ کے دل میں ڈالے اور خود موسیٰ کے دل کی آواز اُس کے کان میں آئی جو خدا کے پکارنے سے تعبیر کی گئی ۔

اُسی جوش دلی اور استغراق قلبی کا سبب تھا جس سے حضرت موسیٰ کو اپنی حیثیت کا ذھول ہوا اور اپنی حیثیت سے بڑھ کر کہنے لگے ۔ رب ارنی انظر الیک ۔ خدا نے جواب دیا نہ اپنی آواز سے اور نہ کسی فانی جسم میں آواز ڈالنے سے بلکہ خود موسیٰ کے دل میں اپنا کلام ڈالنے سے کہ ۔ لن ترانی ۔ جہاں جہاں

خدا اور موسیٰ میں کلام ہونے کا ذکر ہے اُس کی یہی ماہیت ہے اور و کلم اللہ موسیٰ تکلیما ۔ کی یہی حقیقت ہے ھذا ما افھمنی اللہ حقیقۃ کلامہ العظیم و ھو الھادی الی الصراط المستقیم ۔

دوازدہم ۔ حقیقت تجلی للجبل

پہاڑ پر خدا کی تجلی ہونے اور آگ کی صورت میں نزول فرمانے کی نسبت تفسیروں میں بہت کچھ بھرا ہوا ہے مگر قرآن مجید میں یہ واقعہ نہایت صاف صاف اور سیدھے لفظوں میں بیان ہوا ہے جس میں کچھ بھی پیچیدہ بات نہیں ہے چناں چہ سورہ 'طہٰ' میں خدا نے فرمایا کہ کیا تجھ تک موسیٰ کا قصہ پہنچا ہے ۔ جب کہ اُس نے آگ کو دیکھا پھر اپنے گھر والوں سے کہا کہ ٹھہر جاؤ مجھ کو آگ دکھائی دی ہے شاید میں تمھارے لیے اُس میں سے جلتی ہوئی لکڑی لے آؤں یا اُس آگ پر کسی راہ بتانے والے کو پاؤں ۔ پھر جب موسیٰ آگ کے پاس پہنچے اُس کو پکارا گیا یعنی آواز آئی کہ اے موسیٰ بے شک میں تیرا خدا ہوں اپنی جوتی پاؤں سے اُتار بے شک تو پاک میدان میں ہے ۔

و ھل اتک حدیث موسیٰ ۔ اذرای نارا فقال لاھلہ امکثوا انی انست نارا لعلی آتیکم منھا بقبس اواجد علی النار ھدیٰ ۔ فلما اتاھا نودی یا موسیٰ ۔ انی انا ربک فاخلع نعلیک انک بالوادی المقدس طویٰ ۔
(۳۰ ۔ طہ ۔ ۸ ۔ ۱۲)

یہی مضمون کسی قدر الفاظ کی تبدیل سے سورہ نمل میں آیا ہے کہ جب موسیٰ نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ مجھ کو آگ دکھائی دی ہے میں اب

اذ قال موسیٰ لاھلہ انی آنست نار ساتیکم منھا بخبرا واتیکم بشھاب قبس

لعلکم تصطلون - فلما جاءھا نودی ان بورک من فی النار و من حولھا و سبحان اللہ رب العالمین - یا موسیٰ انہ انا اللہ العزیز الحکیم -
(۲۷ - نمل - ۷ - ۹)

وھاں سے تمھارے لیے کوئی خبر لاتا ھوں یا تمھارے لیے جلتی لکڑی لاتا ھوں تاکہ تم تاپو - پھر جب موسیٰ آگ کے پاس آیا تو آواز دی گئی کہ برکت دی گئی اُس کو جو آگ کے قریب ھے (یعنی موسیٰ کو) اور اُس کو جو اُس کے گرد ھے (یعنی ھارون کو جو موسیٰ کے گھر کے لوگوں کے ساتھ تھے) اور پاک ھے اللہ پروردگار عالموں کا اے موسیٰ ٹھیک بات یہ ھے کہ میں ھوں خدا زبردست حکمت والا -

اور سورہ قصص میں اس طرح فرمایا ھے کہ جب موسیٰ مدین

فلما قضی موسیٰ الا جل و سار باھلہ انس من جانب الطور نارا قال لا ھلہ امکثوا انی انست نارا لعلی آتیکم منھا یخبروا جزوۃ من النار لعلکم تصطلون - فلما اتا ھانودی من شاطئی الواد الا یمن فی البقعۃ المبارکۃ من الشجرۃ ان یا موسیٰ انی انا اللہ رب العالمین -
(۲۷ - قصص - ۲۹ و ۳۰)

سے اپنے گھر والوں کو لے کر غالباً مصر کے جانے کے قصد سے روانہ ھوا تو اُس نے طور کی جانب آگ دیکھی اُس نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ ٹھہرو میں نے آگ کو دیکھا ھے شاید میں وھاں سے تمھاری کوئی خبر یا کچھ تھوڑی سی آگ لاؤں تاکہ تم تاپو - پھر جب موسیٰ آگ کے پاس آئے تو مبارک میدان کے کنارہ سے مبارک جگہ میں درخت کی طرف سے آواز دی گئی کہ اے موسیٰ بے شک میں اللہ ھوں پروردگار عالموں کا -

و لما جاء موسیٰ لمیقاتنا و کلمه ربه قال رب ارنی انظر الیک قال لن ترانی و لا کن انظر الی الجبل فان استقر مکانه فسوف ترانی فلما تجلی ربه للجبل جعله دکا و خر موسیٰ صعقا ۔ فلما افاق قال سبحانک تبت الیک و انا اول المؤمنون ۔
(۷۔ سورہ اعراف ۔ ۱۳۹ و ۱۴۰)

اور سوره اعراف میں یوں آیا ہے که ۔ جب موسیٰ ہماری مقرر کی ہوئی جگه میں آیا اور آس کے پروردگار نے آس سے کلام کیا تو موسیٰ نے کہا اے پروردگار اپنے تئیں مجھے دکھلا دے ۔ خدا نے کہا که تو مجھے نه دیکھے گا مگر آس پہاڑ کی طرف دیکھ پھر اگر وہ اپنی جگه پر قائم رہے تو تو مجھ کو بھی دیکھ لے گا ۔ پھر جب آس کے پروردگار نے پہاڑ کے لیے تجلی کی تو آس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گر پڑے موسیٰ بے ہوش ہو کر ۔ پھر جب ہوش آیا تو کہا که پاک ہے تو معافی مانگتا ہوں تجھ سے اور میں پہلا ایمان والوں میں ہوں ۔

اگر آن قصوں اور کہانیوں سے قطع نظر کی جاوے جو یہودیوں نے آس کی نسبت بنا لی ہیں اور آن کی کتابوں میں مندرج ہیں اور جن کی پیروی کرکے ہمارے ہاں کے مفسروں نے آنھی قصوں کو مختلف طرح پر اپنی تفسیروں میں بھر دیا ہے اور صرف قرآن مجید کی آیتوں پر غور کیا جاوے تو آن آیتوں سے مندرجه ذیل امور پائے جاتے ہیں ۔

۱۔ موسیٰ نے جو آگ دیکھی تھی حقیقت میں وہ آگ ہی تھی نه خدا تھا اور نه خدا کا نور اور نه ہرے سبز درخت میں سے وہ آگ روشن ہوئی تھی اور درخت نہیں جلتا تھا جیسا که لوگ خیال کرتے ہیں بلکه صرف بات اس قدر تھی که درحقیقت حضرت موسیٰ

نے پہاڑ کی جانب آگ جلتی ہوئی دیکھی رستہ پر آگ جلانا پرانی قوموں کا دستور تھا ۔ رات کا وقت اور موسم سردی کا تھا اور جنگل میں حضرت موسیٰ رستہ بھی بھول گئے تھے انھوں نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ تم ٹھیرو میں وہاں جاتا ہوں یا وہاں کوئی شخص رستہ بتانے والا مل جاوے گا ۔ یا میں تمھارے لیے وہاں سے کوئی جلتی ہوئی لکڑی لے آؤں گا جس سے تم تاپنا تاکہ سردی سے بچو ۔

یہ واقعہ کود سینا یا کوہ طور کے قریب موسیٰ پر گزرا تھا جب کہ وہ مدین سے اپنے گھر کے لوگوں کو لے کر مصر کو جاتے تھے ۔ ہم نے سورہ بقر کی تفسیر میں اس بات کو کامل تحقیقات سے ثابت کر دیا ہے کہ طور سینا آتشیں پہاڑ تھا اس میں سے جو لو نکلی ہوگی اس کو حضرت موسیٰ نے دیکھ کر یہ بات کہی کہ میں نے آگ دیکھی ہے وہاں سے کوئی خبر یا تھوڑی سی آگ لے کر آتا ہوں ۔

۲۔ ان آیتوں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جو آواز موسیٰ کو وہاں آئی یا جو کلام خدا نے موسیٰ سے کیا اس کو اس آگ سے کچھ تعلق نہ تھا ۔ سورہ 'طہ' اور سورہ نمل میں بیان ہوا ہے کہ جب حضرت موسیٰ آگ کے پاس آئے تو ان کو آواز دی گئی ۔ نہ وہاں یہ بیان ہوا ہے کہ آگ نے آواز دی نہ یہ بیان ہوا ہے کہ آگ میں سے آواز آئی بلکہ باوجودیکہ آگ کا ذکر وہاں موجود ہے اور پھر نودی صیغہ مجہول کا آیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس آواز یا کلام کو آگ سے کچھ تعلق نہیں تھا ۔ مثلاً ایک شخص دریا میں سے پانی بھرنے جاوے اور وہ کہے کہ جب میں دریا کے قریب پہنچا تو میں نے پکارنے کی آواز سنی ۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ خواہ نخواہ دریا میں سے وہ آواز آئی ۔ اسی طرح جب حضرت موسیٰ آگ کے

قریب پہنچے تو آن کے کان میں آواز آئی ۔ پس اس بات کا قرار دینا کہ وہ آواز آ گ میں سے آئی تھی کسی طرح قرآن مجید سے نہیں پایا جاتا ۔

علاوہ اس کے سورہ قصص میں بیان ہوا ہے کہ مبارک جنگل کے کنارے سے ایک درخت کی طرف سے وہ آواز آئی تھی اور یہ آیت نص صریح اس بات کی ہے کہ آ گ میں سے آواز نہیں آئی تھی ۔

سورہ قصص کی آیت میں آواز کا آنا من الشجرۃ بیان ہوا ہے لفظ من سے خاص درخت میں سے آواز کا آنا نہیں ثابت ہوتا کیوں کہ اس آیت میں خود خدا نے جانب کے معنی کی تصریح کر دی ہے جہاں فرمایا ہے من جانب الطور اور اسی تصریح پر من شاطئی الوادی لا یمن ۔ ای من جانب الشاطیٔ الوادی لا یمن ۔ من الشجرۃ ای من جانب الشجرۃ محمول کیا جاتا ہے اور یہ خیال کرنا کہ یہ شجر وہ شجر تھا جس میں آ گ روشن ہوئی تھی اور درخت سبز کا سبز تھا اور نہیں جلتا تھا اور حضرت موسیٰ نے اس سبز درخت میں آ گ دیکھی تھی یہودیوں کی کتابوں کی کہانیاں اور بے ثبوت قصے ہیں ۔ قرآن مجید سے مطلق ثابت نہیں ہے ۔ سورہ یاسین میں جو آیا ہے کہ من الشجر الاخضر نارا ۔ اس کو حضرت موسیٰ کے قصہ سے کچھ بھی تعلق نہیں ہے ۔

۳۔ تجلی للجبل کی نسبت بہت تھوڑی گفتگو کرنی ہے ۔ حضرت موسیٰ نے یہ کہا ۔ رب ارنی انظر الیک ۔ اس کی تفصیل سورہ بقر میں بیان ہو چکی ہے کہ کس حالت ذھول میں حضرت موسیٰ نے یہ نا ممکن خواھش خدا سے کی تھی اس کا جواب خدا کی طرف سے بجز ۔ لن ترانی ۔ کے اور کچھ نہیں ہو سکتا

تھا ۔ مگر جو کہ خدا کا وجود اُس کی تمام مخلوقات سے اور خصوصاً ایسی مخلوق سے جو لوگوں کی آنکھ میں زیادہ تر عجیب ہیں ثابت ہوتا ہے اس لیے خدا نے حضرت موسیٰ کو اُس عجیب مخلوق کی طرف متوجہ کیا جو اُن کے قریب موجود تھی اور جس سے خدا کی شان و قدرت ظاہر ہوتی تھی ۔ یعنی اُس آتشیں پہاڑ کی طرف جو روشن ہونا شروع ہوا تھا اور جس کی لُو کو حضرت موسیٰ دیکھ کر آگ لینے دوڑے تھے مگر جب وہ پہاڑ بھڑکا اور گرجا اور اُس کے پتھر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اُڑے تو حضرت موسیٰ غش کھا کر گرے ۔ پھر جب ہوش آیا تو اُس سوال سے توبہ کی اور کہا انا اول المؤمنون ۔

تجلی خدا کی اُس کی تمام مخلوق میں موجود ہے جیسا کہ ہم نے سورہ بقر میں بیان کیا ہے پس فلما تجلی ربہ للجبل کے معنی یہ ہیں کہ ۔ فلما ظہر شان ربہ و کمال قدرتہ علی الجبل استرھب موسیٰ و خرصعقا ۔

سیزدھم ۔ بیان کتابت فی الالواح

یہ لوحیں پتھر کی تختیاں تھیں جن پر وہ احکام کھدے ہوئے تھے جو بنی اسرائیل کے لیے خدا نے دئے تھے ۔ توریت میں ایک جگہ لکھا ہے کہ جب خدا نے موسیٰ کو سب احکام بتا دئے تو موسیٰ نے اُن تمام حکموں کو جو خدا نے دئے تھے لکھ لیا ۔ (سفر خروج باب ۲۴ ورس ۴) اس سے اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کو

قال یا موسیٰ انی اصطفیتک علی الناس برسالاتی و بکلامی فخذ ما اتیتک و کن من الشاکرین و کتبنا لہ فی الالواح من کل شی موعظۃ و تفصیلا لکل شئی فخذھا بقوۃ و أمر قومک یاخذوا باحسنہا سأوریکم

دارالفاسقین ۔

سورہ اعراف ۔ ۱۴۴ و ۱۴۲ ۔

و لما رجع موسیٰ الی قومہ غضبان اسفا قال بئسما خلفتمونی من بعدے اعجلتم امر ربکم و القی الالواح و اخذ براس اخیہ یجرہ الیہ ۔ و لما سکت عن موسیٰ الغضب اخذ الالواح و فی نسختہا ھدی و رحمۃ للذین ھم لربھم یرھبون ۔

۷۔ سورہ اعراف ۔ ۱۴۹ ۔ ۱۵۳ ۔

لکھنا آتا تھا ۔ دوسری جگہ لکھا ھے کہ ۔ خدا نے موسیٰ سے کہا کہ میرے پاس پہاڑ پر آ تاکہ پتھر کی لوحیں اور توریت اور اور احکام جو میں نے لکھے ھیں تجھ کو دوں تاکہ بنی اسرائیل کو تعلیم کرے (سفر خروج باب ۲۴ ورس ۱۲) اور ایک اور مقام پر لکھا ھے کہ ۔ جب خدا موسیٰ سے بات چیت کر چکا تو لوحیں شہادت کی یعنی پتھر کی لوحیں جو خدا کی آنگلی سے لکھی ھوئی تھیں موسیٰ کو سپرد کیں ۔ (سفر خروج باب ۳۱ ورس ۱۸) اور ایک جگہ پھر لکھا ھے کہ چالیس دن رات پہاڑ پر رھنے کے بعد خدا نے دو پتھر کی لوحیں جو خدا کی آنگلی سے لکھی گئی تھیں موسیٰ کو دیں اور جو کچھ خدا نے پہاڑ میں بنی اسرائیل کے سرداروں سے آگ کے بیچ میں سے کہا تھا لکھا گیا تھا (سفر توریہ مثنے باب ۹ ورس ۱۰ و ۱۱) بعد اس کے جب حضرت موسیٰ آن لوحوں کو لے کر آئے اور ھارون پر خفگی ھونے کی حالت میں آن کو پھینک دیا اور وہ ٹوٹ گئیں تو خدا نے موسیٰ کو حکم دیا کہ ۔ اپنے لیے پتھر کی دو لوحیں پہلی لوحوں کے برابر بنا دے اور میرے پاس پہاڑ میں لے آ اور آن کے لیے لکڑی کا ایک صندوق بنا ۔ جو کلمات کہ پہلی لوحوں پر لکھے ھوئے تھے ۔ وہ میں پھر آن لوحوں پر لکھ دوں گا ۔ موسیٰ نے ایسا ھی کیا اور خدا نے پہلی تحریر

کے موافق اُن دس کلموں کو جو خدا نے بنی اسرائیل پر پہاڑ پر
آگ کے بیچ میں سے کہے تھے لکھ دئے اور لوحیں موسٰی کو
دے دیں موسٰی نے احتیاط سے اُن کو صندوق میں رکھ چھوڑا
(سفر توریہ مثنے باب ۲۰ ورس ۱ لغایت ۵) یہ بات ہر کوئی تسلیم
کر سکتا ہے کہ خدا کی شان اور اُس کے تنزہ سے بعید ہے کہ وہ
خود اپنے ہاتھ یا اپنی اُنگلی سے مثل ایک سنگ تراش کے پتھر پر
عبارت کندہ کرے - یہودی اور عیسائی اور وہ تمام لوگ بھی جو
ایسے واقعات کو ہمیشہ ایک عجیب پیرایہ میں ظاہر کرنا چاہتے
ہیں ان لفظوں کے جو توریت میں ہیں ظاہری معنی نہیں لیتے بلکہ
یہ سمجھتے ہیں کہ ان لفظوں سے یہ مراد ہے کہ خدا کی قدرت سے
وہ کلمات اُس پر کھد گئے تھے - تمام حالات سے اور اُس طرز بیان سے
جو توریت میں آیا ہے بخوبی پایا جاتا ہے کہ وہ لوحیں خود
حضرت موسٰی نے بنائی تھیں اور جو احکام خدا نے اُن کو دئے تھے
وہ خود حضرت موسٰی نے اُن پر کندہ کیے تھے -

ہمارے علمائے مفسرین نے اس بات پر بحث کی ہے کہ وہ
و قال وھب کانت من لوحیں کس چیز کی تھیں اور کے
صخرة صمالینہا اللہ لموسٰی تھیں بعضوں نے کہا دس تھیں
علیہ السلام (تفسیر کبیر) - بعضوں نے کہا سات تھیں کسی
نے کہا زمرد کی تھیں کسی نے کہا سبز زبرجد کی تھیں اور
سرخ یاقوت کی تھیں - حسن نے کہا کہ لکڑی کی تھیں جو آسمان
سے اُتری تھیں اور وھب کا قول ہے کہ وہ سخت پتھر کی تھیں اُن
کو خدا نے موسٰی کے لیے نرم کر دیا تھا -

بہر حال وہ لوحیں کسی چیز کی ہوں وہ چنداں بحث کے قابل
و اما کیفیة الکتابة نہیں ہیں جو امر بحث طلب ہے
فقال ابن جریج کتبہا وہ یہ ہے کہ اُن پر لکھا کس

جبرئیل بالقلم الذی کتب به الذکر و استمد من نهر النور و اعلم انه لیس فی لفظ الایه ما یدل علیٰ کیفیة تلک الالواح و علیٰ کیفیة تلک الکتابة فان ثبت ذلک التفصیل بدلیل منفصل قوی وجب القول به و الا وجب السکوت عنه (تفسیر کبیر) ۔

نے تھا ہمارے علما نے درحقیقت اس میں سکوت اختیار کیا ہے اگرچہ بعضوں کا قول ہے کہ جبرائیل نے لکھا تھا مگر تفسیر کبیر میں قول فیصل یہ لکھا ہے کہ آیت کے لفظوں سے کتابت فی الالواح کی کیفیت معلوم نہیں ہوتی پس اگر اور کسی قوی دلیل سے اس کی کیفیت معلوم نہ ہو تو سکوت کرنا چاہیے ۔

میں یہ بات کہنی چاہتا ہوں کہ آیت کے لفظوں سے یہ بات یقینی معلوم ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ ان لوحوں کا کاتب نہ تھا کیوں کہ تمام قرآن مجید میں لفظ ”کتبنا“ کا جہاں آیا ہے اس سے خدا کی نسبت فعل کتابت کی مراد نہیں لی گئی بلکہ مقرر کرنے فرض کرنے کے معنی لیے گئے ہیں چناں چہ ”کتبنا“ کے ہر جگہ سب علماء نے یہی معنی قرار دئے ہیں ”علی“ اور ”لہ“ جو کتابت کے صلہ میں آتا ہے اس سے کچھ تغیر معنی میں نہیں ہوتا ۔ بلکہ ”فی“ کے صلہ میں آنے سے بھی کچھ تغیر واقع نہیں ہوتا چناں چہ سورۂ انبیاء کی ایک سو پانچویں آیت میں یہ الفاظ آئے ہیں ”و لقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثھا عبادی الصالحون“ یہ بات ظاہر ہے کہ زبور کا لکھنا یعنی فعل کتابت کسی نے بھی خدا کی طرف منسوب نہیں کیا پس اس کے معنی یہی ہیں کہ ”فرضنا فی الزبور“ پس قرآن مجید کی کوئی آیت اس بات پر اشارہ بھی نہیں

کرتی که اُن لوحوں کا کاتب خدا تھا ـ بلکه جس طرح خدا تعالیٰ کبھی بندوں کے اور اشیاء کے بعض افعال کو اپنی طرف نسبت کرتا ھے اس طرح بھی فعل کتابت الواح کا خدا نے اپنی طرف منسوب نہیں کیا ـ

اب رھی یه بات که پھر اُن پر کس نے لکھا تھا حضرت موسیٰ کے سوا وھاں اور کوئی لکھنے والا نه تھا ـ وھب نے جو یه کہا ھے که وہ سخت پتھر کی لوحیں تھیں خدا نے موسیٰ کے لیے اُن کو نرم کر دیا تھا ـ اس سے صاف پایا جاتا ھے که وھب کے نزدیک بھی حضرت موسیٰ ھی اُن کے لکھنے والے تھے ـ

حضرت موسیٰ ایک مہینه میں واپس آنے کا اقرار کر کے پہاڑ پر گئے تھے اُن کو جو مہینه بھر عبادت میں مشغول رھنے کا حکم ھوا وہ اُسی کو میعاد عطائے احکام سمجھے حالاں که احکام اُس کے بعد ملنے کو تھے چناں چه دس روز میں وہ احکام ملے یا اُن کے کھودنے میں دس دن لگ گئے ـ غرض که چالیس دن رات ھوگئے خدا نے جو احکام اُن کو وحی سے بتائے تھے اُنھوں نے چاھا که اُن کو پتھر کی لوحوں میں کنده کر لیں اور بنی اسرائیل کو جا کر دکھائیں ـ وعده سے دس دن زیاده لگ جانے سے بنی اسرائیل کو اُن کے واپس آنے کی توقع جاتی رھی اور انھوں نے اپنے لیے بطور دیوتا کے بچھڑا بنا لیا اور اُس کی پوجا کرنے لگے ـ

چهاردهم ـ اتخاز عجل

و اتخذ قوم موسیٰ من بعده من حلیهم عجلا جسدا له خوار الم یروا انه

بچھڑا بنانے کا کچھ مختصر سا ذکر ھم نے سوره بقر کی تفسیر میں لکھا ھے مگر اس مقام پر اُس کے متعلق خاص باتوں سے بحث کرنی چاھتے ھیں اور اول

لا یکلمهم و لا یهدیهم سبیلا -

آن آیتوں کو لکھتے ھیں جن سے وہ بحث متعلق ھے -

۷- سوره اعراف - ۱۴٦ -

و ما اعجلک عن قومک یا موسٰی قال هم اولاء علی اثری و عجلت الیک رب لترضی قال فانا قد فتنا قومک من بعدک و اضلهم السامری فرجع موسٰی الی قومه غضبان اسفا قال یقوم الم یعدکم ربکم وعدا حسنا افطال علیکم العهد ام اردتم ان یحل علیکم غضب من ربکم فاخلفتم موعدی قالوا ما اخلفنا موعدک بملکنا و لکنا حملنا اوزارا من زینة القوم فقذفناها فذلک القی السامری فاخرج لهم عجلا جسدا له خوار فقالوا هذا الهکم و اله موسٰی فنسی افلا یرون الا یرجع الیهم قولا ولا یملک لهم ضرا ولا نفعا و لقد

خدا نے سورہ اعراف میں فرمایا ھے، اور بنایا موسٰی کی قوم نے موسٰی کے پہاڑ پر جانے کے بعد آن کے گہنوں سے بچھڑا مجسم کہ آس کے لیے آواز تھی یعنی آس میں سے آواز بھی نکلتی تھی -

اور سورہ 'طه' میں فرمایا ھے کہ اے موسٰی کیا چیز مجھ کو تیری قوم سے چھوڑا کر ایسی جلدی لے آئی - موسٰی نے کہا کہ وہ لوگ میری پیروی پر ھیں اور میں جلد چلا آیا تیرے پاس تا کہ تو راضی ھو - خدا نے کہا کہ بے شک میں نے تیری قوم کو تیرے پیچھے آفت میں ڈالا ھے اور سامری نے آس کو گمراہ کیا ھے - پھر لوٹ آیا موسٰی اپنی قوم کے پاس غصہ میں بھرا ھوا غمگین - کہا اے میری قوم کے لوگو کیا تمھارے پروردگار نے تم

قال لهم هارون من قبل یا قوم انما فتنتم به و ان ربکم الرحمٰن فاتبعونی و اطیعوا امری قالوا لن نبرح علیه عاکفین حتی یرجع الینا موسٰی قال یا هرون ما منعک اذ رایتم ضلوا الا تتبعن افعصیت امری قال یا بنؤم لا تاخذ بلحیتی و لا براسی انی خشیت ان تقول فرقت بین بنی اسرائیل و لم ترقب قولی قال فما خطبک یا سامری قال بصرت بما لم یبصروا به فقبضت قبضة من اثر الرسول فنبذتها وکذلک سولت لی نفسی -

۲۰ - سوره طه ۸۵ لغایت ۹۶ -

سے اچھا وعدہ نہیں کیا تھا - کیا تم پر لمبی مدت گزر گئی یا تم نے یہ چاہا کہ تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے غضب نازل ہو پھر تم نے میرے وعدہ کے برخلاف کیا - اُنھوں نے کہا کہ ہم نے اپنے اختیار سے تیرے وعدہ سے برخلاف نہیں کیا ولیکن ہم سے فرعون کی قوم کے گہنوں کا بوجھ اُٹھوایا گیا پھر ہم نے اُس کو پھینک دیا اور اسی طرح سامری نے ڈال دیا (آگ میں) پھر اُس نے اُن کے لیے ایک بچھڑا نکالا مجسم کہ اُس کے لیے آواز تھی یعنی اُس میں سے آواز بھی نکلتی تھی - پھر اُن لوگوں نے کہا کہ یہ تمہارا پروردگار اور موسٰی کا پروردگار ھے پھر موسٰی بھول گیا ھے - کیا اُنھوں نے نہیں دیکھا کہ وہ پھر کر اُن کی بات کا جواب نہیں دیتا اور نہ اُس کے اختیار میں اُن کے لیے ضرر پہنچانا ھے نہ فائدہ - بے شک اس سے پہلے ھارون نے اُن سے کہا تھا کہ اے میری قوم تم اُس کے سبب سے آفت میں پڑے ھو اور بے شک تمہارا پروردگار خدائے مہربان ھے پھر تم میری پیروی کرو اور میرے حکم کو بجا لاؤ۔ نھوں نے کہا کہ ہم تو اسی کے گرد بیٹھے رھیں گے جب تک

پھر ھارے پاس موسیٰ آوے ۔ جب موسیٰ آئے تو اُنھوں نے کہا اے ھارون کس چیز نے تجھ کو اس بات سے روکا کہ جب تو نے اُن کو گمراھی میں دیکھا تو تو میری پیروی کرے کیا تو نے میرے حکم کی نا فرمانی کی ۔ ھارون نے کہا کہ اے میرے ماں جائے (بھائی) تم میری ڈاڑھی اور میرے سر کے بال مت پکڑو بے شک میں اس بات سے ڈرا کہ تم یہ نہ کہو تو نے تفرقہ ڈال دیا بنی اسرائیل مین اور میری بات کو نگاہ نہ رکھا ۔ موسیٰ نے کہا اے سامری تیرا کیا حال ھے اُس نے کہا مجھے ایسی بات سوجھی جو کسی کو وہ نہ سوجھی تھی پھر میں ۔ رسول کے نقش قدم سے (یعنی حضرت موسیٰ کے نقش قدم سے جب کہ وہ پہاڑ کو جاتے تھے) مٹی کی مٹھی بھر لی پھر اُس کو بچھڑے میں میں نے ڈال دیا اور اس طرح میرے نفس نے مجھ کو دھوکا دیا ۔

قرآن کے لفظ ھم نے اس مقام پر لکھے ھیں اور اُن کا مطلب بھی جو صاف صاف قرآن کے لفظوں سے نکلتا ھے لکھ دیا یا اب ھارے عجائب پرست مفسروں نے اس پر لغو و بے ھودہ قصوں پر قصے باندھ دئے ھیں ۔ پہلے تو یہ قرار دیا کہ اُس بچھڑے مین اسی طرح کی آواز تھی جس طرح کہ سچ مچ کی اور خدا کی پیدا کی ھوئی بچھڑے میں آواز ھوتی ھے پھر ضرور ھوا کہ اُس کا کوئی سبب بھی قرار دیں اس لیے ”الرسل“ کے لفظ سے تو جبرئیل مراد لیے ۔ ”بصرت“ سے یہ معنی لیے کہ سامری نے جبرئیل کو دیکھا تھا اور اور کسی نے نہیں دیکھا تھا اور وہ کہاں عین اُس وقت جب کہ بحر احمر سے بنی اسرائیل گذر رہے تھے اور فرعون تعاقب میں تھا اور فرعون کے لشکر اور بنی اسرائیل کے لشکر کے درمیان میں جبرئیل آ گئے تھے اُس وقت سامری نے اُن کو دیکھا اور

پہچان لیا اور نہایت دور اندیشی سے اُن کی یا اُن کے گھوڑے کے (کیوں کہ بعض مفسرین کے نزدیک اُس وقت گھوڑے پر چڑھے ہوئے تھے) پاؤں تلے کی مٹی اُٹھا لی کہ کسی وقت کام آوے گی اور یہاں اُس کو کام میں لایا اور بچھڑے کے منہ میں ڈال دی وہ سچ مچ کے خدا کے پیدا کئے ہوئے بچھڑے کی مانند بولنے لگا۔

ان خرافات و لغویات کا کچھ ٹھکانا ہے؟ کیسے جبرئیل؟ وہ کہاں تھے؟ کجا سمندر؟ کہاں کی بات کہاں لے دوڑے سمندر میں جبرئیل کا آنا کیسا اُن کا گھوڑے پر سوار ہونا کیسا اللہ کے رسول یعنی موسیٰ وہاں موجود تھے جن کی طرف صاف اشارہ ہے ہمارے مفسرین خدا اُن کو بخشے اُن کو چھوڑ کر سمندر میں جا ڈوبے۔

ایک لفظ بھی قرآن مجید کا اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ اُس بچھڑے میں سچ مچ کی اور خدا کے پیدا کیے ہوئے بچھڑے کی مانند آواز تھی بلکہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سامری نے اُس بچھڑے کو اس طرح بنایا تھا کہ اُس میں سے آواز بھی نکلتی تھی ہزاروں جانور اب بھی کاریگر اس طرح سے بناتے ہیں کہ وہ اُڑتے ہیں ہلتے ہیں حرکت کرتے ہیں بولتے ہیں۔ سامری نے بھی اُس بچھڑے کو ایسی کاریگری سے بنایا تھا کہ اُس میں سے آواز بھی نکلتی تھی سیدھے مطلب کو ٹیڑھا کرنا ہمارے مفسروں کی عجائب پرستی اور یہودیوں کی تقلید کے سوا کچھ نہیں ہے مذہب اسلام اور خدا کا کلام یعنی قرآن مجید ان سب لغویات سے پاک ہے۔

یہی قول معتزلی عالموں کا بھی ہے چناں چہ تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ۔ اکثر معتزلی مفسروں کا یہ قول ہے کہ سامری نے وہ بچھڑا اندر سے

و قال اکثر المفسرین من المعتزلة انه کان قد جعل ذلک العجل مجوفا

و وضع فی جوفہ الا نابیب و یظہر منہ صوت مخصوص یشبہ خوار العجل و قال آخرون انہ جعل ذلک التمثال اجوف وجعل تحتہ فی الموضع الذی نصب فیہ العجل من ینفخ فیہ من حیث لا یشعریہ الناس فسمعوا الصوت من جوفہ کالخوار۔ قال صاحب ھذا القول والناس قد یفعلون الان فی ھذہ التصاویر التی یجرون فیہ الماء علی سبیل الفوارات و ما یشبہ ذلک فبہذا الطریق وغیرہ اظہر الصوت من ذلک التمثال ثم القی لی الناس ان ھذہ العجل الھھم و الہ موسیٰ۔

(تفسیر کبیر جلد ۳ صفحہ ۳۰۱)۔

تاول الخوار علی ان السامری صاغ عجلا وجعل فیہ خروقا یدخلہ الریح فیخرج منہا صوت کالخوار

کھوکھلا بنایا تھا اور اُس کے اندر نلیاں لگائی تھیں اُن سے آواز بچھڑے کی آواز کے مشابہ نکلتی تھی اور اور مفسروں نے یہ کہا کہ وہ مورت کھوکھلی تھی اور جہاں وہ بچھڑا کھڑا کیا گیا تھا اُس کے نیچے ایک ایسا مقام تھا جہاں ایک شخص کھڑا ہو کر اُس میں پھونکتا تھا اور لوگ اُس کو نہیں جانتے تھے اُس کے پیٹ میں سے بچھڑے کی مانند آواز سنتے تھے ۔ اس قول کے قائل نے کہا کہ اب بھی لوگ اُن مورتوں میں جن میں پانی کے فوارے چھوٹتے معلوم ہوتے ہیں اور اسی قسم کی چیزیں معلوم ہوتی ہیں ایسا ھی کرتے ھیں ۔ پس اسی طرح اُس بچھڑے کی مورت سے آواز نکالی تھی پھر لوگوں کو بتایا کہ یہ بچھڑا اُن کا خدا اور موسیٰ کا خدا ھے ۔

تفسیر مجمع البیان میں لکھا ھے کہ جبائی نے بچھڑے کی آواز کی نسبت بیان کیا ھے

و دعا هم الی عبادته فاجابوه و عبدوه ۔ عن الجبائی ۔	کہ سامری نے بچھڑا بنایا اُس کو اندر سے خالی رکھا اس میں ہوا جاتی تھی پھر اُس سے
و قیل انه اخنال بادخال الریح کما یعمل ھذہ الالات التی تصوف بالجبل عن الزجاج و الجبائی و البلخی (تفسیر مجمع البیان) ۔	بچھڑے کی آواز کی مانند آواز نکلتی تھی اور اُس نے لوگوں سے اُس کی پوجا کرنے کو کہا اُن لوگوں نے مان لیا اور اُس کی پوجا کی ۔

اور اُسی تفسیر میں زجاج اور جبائی اور بلخی کا قول ہے کہ سامری نے بچھڑے میں ہوا کے بھر دینے سے فریب کیا تھا جس طرح اس قسم کی چیزیں دھوکا دینے کے لیے بنائی جاتی ہیں ۔

بات صرف اس قدر ہے کہ مصر میں رہنے سے بنی اسرائیل کے دل میں بت پرستی کا خیال جما ہوا تھا وہ چاہتے تھے کہ اُن کے لیے کوئی دیوتا بنایا جاوے حضرت موسٰی سے بھی اُنھوں نے چاہا تھا کہ اُن کے لیے ایک دیوتا بناویں اُنھوں نے اُن کو دھمکا دیا جب وہ پہاڑ پر چلے گئے تو حضرت ھارون کا اتنا خوف اُن کو نہ تھا اُن کے منع کرنے سے اُنھوں نے نہ مانا ۔ مصر میں ایک دیوتا تھا جس کا نام ”نیوس“ تھا اور اُس کی صورت بچھڑے جیسی تھی اُسی صورت کا اُنھوں نے بچھڑا بنایا اور بنانے والے نے اُس میں ایسی ترکیب رکھی کہ اُس ترکیب سے بچھڑے میں آواز نکلتی تھی اور لوگوں کو دھوکا و فریب دینے کے لیے حضرت موسٰی کے پاؤں تلے کی مٹی حقیقۃ یا صرف دھوکا دینے کو اُس مٹی کو حضرت موسٰی کے پاؤں تلے مٹی کی بیان کر کے بچھڑے میں ڈال دی ۔ خود قرآن مجید میں سامری کا قول منقول ہے کہ ۔ کذلک سولت لی نفسی ۔ یعنی اس طرح اُس کے

نفس نے دھوکا دیا ۔

اس مقام پر قابل غور یہ بحث ہے کہ بچھڑا بنانے والا کون تھا توریت میں لکھا ہے کہ خود حضرت ہارون بچھڑا بنانے والے تھے اور خود اُنھوں نے ھی بچھڑے کی پرستش کروائی ۔ مگر جب ہم خود توریت کے مضامین پر خیال کرتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا نے ہاروں کو بھی برکت دی تھی اور تمام احکام جو خدا نے موسیٰ کو دئے تھے اُن کی حضرت ہارون ھی تعمیل کرتے تھے بلکہ حضرت موسیٰ تو صرف نام ھی کے تھے خدا کے تمام احکام بذریعہ حضرت ہاروں پورے ہوتے تھے تو ہم اس بات کو کہ حضرت ہارون اُس بچھڑے کے بنانے والے اور بت پرستی کی اجازت دینے والے تھے جیسا کہ توریت میں لکھا ہے صحیح تسلیم نہیں کر سکتے ۔ یہ بات ممکن ہے کہ یہ بچھڑا اُس زمانہ میں بنایا گیا جب کہ حضرت موسیٰ پہاڑ پر تھے اور حضرت ہارون کو تمام بنی اسرائیل پر سردار کر گئے تھے اور اُن کے عہد سرداری میں یہ بچھڑا بنا اس لیے حضرت ہارون کی طرف منسوب کیا گیا ۔ مگر یہ بات کہ خود حضرت ہارون اُس کے بنانے والے تھے یہ بات کسی طرح صحیح متصور نہیں ہو سکتی ۔

قرآن مجید نے صاف صاف بتا دیا کہ حضرت ہارون نہیں بلکہ سامری اُس کا بنانے والا تھا ۔ ہمارے مفسرین کی جیسی عادت ہے کہ تفسیروں میں رطب و یابس صحیح و غلط روایتیں بھر دیتے ہیں اسی طرح سامری کی نسبت بھی روایتیں بھر دی ہیں جن میں سے بعض کی کچھ اصلیت بھی ہے مگر ٹھیک طور پر بیان نہیں کیں اور بعضوں نے نہایت غلطی سے سامری خاص نام بنانے والے کا سمجھا ہے جو صریح غلط ہے ۔

عیسائی علما نے یہ بات چاھی ہے کہ قرآن مجید کی غلطی

ثابت کریں مسٹر سلیڈن نے کہا کہ دراصل ہارون اور سامری ایک ہی شخص ہے نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غلطی سے اُن کو دو سمجھا ہے ۔ سمر یا شامر عبری لفظ ہے اور اُس کے معنی محافظ کے ہیں اور جب کہ موسیٰ پہاڑ پر گئے تھے تو ہارون بنی اسرائیل کے محافظ ہوئے تھے اور اس لیے وہی شامر تھے ۔

مگر مسٹر سلیڈن کا یہ قیاس محض غلط ہے اس لیے کہ اگر یہ لفظ قرآن مجید میں اخذ کیا جاتا تو اُس کے ساتھ یائے نسبت کسی طرح نہیں آ سکتی تھی اور اگر وہ علم یعنی خاص شخص کا نام متصور ہوتا تو اُس پر الف لام لازم نہیں آ سکتا تھا حالاں کہ قرآن مجید میں یائے نسبت اور الف لام دونوں موجود ہیں یعنی '' السامری '' آیا ہے پس یہ دونوں خیال محض غلط ہیں ۔

صحیح امر جس کو ہمارے مفسرین نے بھی بیان کیا ہے یہ ہے کہ بچھڑے کا بنانے والا سامرتن والوں کا ایک شخص تھا جس کا نام بیان نہیں ہوا پس '' السامری '' کے معنی یہ ہیں کہ ''رجل من الذین ھم السامرۃ '' مسٹر سیل نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اُس زمانہ میں سامرتن قوم موجود نہ تھی بلکہ اُس کے بہت زمانہ بعد وہ قوم بنی تھی ۔

مگر اس اعتراض میں غلطی ہے قرآن مجید کے الفاظ سے اُس وقت یہی نام ہونا لازم نہیں آتا ۔ بنی اسرائیل کے بارہ سبط تھے اور سب ایک سلطنت کے ماتحت تھے ۔ مگر جب '' رجعام '' حضرت سلیمان کا بادشاہ ہوا تو بنی اسرائیل کے دس سبط نے اُس سے بغاوت کی ۔ '' یا ربعام '' پسرنباط کو اپنا بادشاہ بنایا اُس نے اپنے ملک میں بمقام بیت ایل اور دان کے سونے کے بچھڑے بنائے (دیکھو اول سلاطین باب ۱۲ ورس ۲۸ و ۲۹) اور اُن کی پرستش شروع کی ۔

جب کہ ''عمری'' اُن لوگوں پر بادشاہ ھوا تو اُس نے کوہ شومون کو اُس کے مالک سے جس کا نام ''شمر'' تھا خرید لیا اور وھاں شہر بنایا جو دارالخلافت ھو گیا (دیکھو اول سلاطین باب ۱۶ ورس ۲۳ لغایت ۲۵) اور اسی سبب سے وہ لوگ سمارتن یا شامری یا سامری مشہور ھوۓ اور وہ قوم جس میں کے شخص نے بنی اسرائیل کے لیے بچھڑا بنایا تھا قرآن مجید کے بہت پہلے سے سامری کے نام سے کہلاتی تھی - قرآن مجید میں السامری کہنے سے صرف یہ اشارہ ھے کہ اُس کا بنانے والا اُس قوم میں سے تھا جنھوں نے آخرکار یا ربعام کی اطاعت کر کے سونے کے بچھڑوں کی پرستش کی تھی اور جو لوگ سامری یعنی سمارتن کے لقب سے مشہور ھیں -

جو لوگ کہ توریت کے اُن مقامات کو جو قرآن مجید کے بیان کے مخالف ھیں قرآن مجید کی غلطی ثابت کرنے کو پیش کرتے ھیں اُن کو ایسی جرأت کرنے سے پہلے توریت کے تمام مضامین مندرجہ کی صحت ثابت کرنی چاھیے اور اُن کو اس بات کا بھولنا نہیں چاھیے کہ اب تک یہ بھی تحقیق نہیں ھوا ھے کہ موجودہ توریت کس نے لکھی اور کب لکھی گئی خود توریت سے ثابت ھوتا ھے کہ اُس کے مضامین یاد سے اور کچھ تحریروں سے اخذ کیے گئے ھیں اور بہت سی باتیں جو اُس زمانہ میں جب کہ و لکھی گئی یہودیوں میں مشہور یا مروج تھیں وہ بھی اُس میں داخل کی گئی ھیں اور جو مضامین اس میں داخل ھیں وہ ایسے افسانہ آمیز ھیں کہ جب تک اُن افسانوں کو علیحدہ نہ کیا جاوے اصل واقعہ پر کسی طرح یقین نہیں ھو سکتا - بشپ نیٹال نے جو کچھ اس کی نسبت لکھا ھے اُس کو بھی بھولنا نہیں چاھیے پس یہ امر کہ کوئی واقعہ جو توریت کے برخلاف ھو وہ صحیح نہیں ھے اُس کو کوئی

ذی عقل تسلیم نہیں کر سکتا ۔ بلاشبہ توریت میں احکام الٰہی بھی مندرج ھیں اور وہ ”فیہا ھدی و نور“ کہنے کے مستحق ھیں اور تاریخی واقعات بھی ھیں جو غلطی سے پاک نہیں ۔

پانزدھم ۔ ستر آدمیوں کا منتخب کرنا

قرآن مجید میں ایک جگہ یہ بیان ہوا ھے کہ موسیٰ کی قوم

و اذ قلتم یا موسیٰ لن نومن لک حتیٰ نری اللہ جہرۃ فاخذتکم الصاعقہ و انتم تنظرون ۔ (سورۃ بقر آیت ۵۲)	نے حضرت موسیٰ سے کہا کہ ہم تجھ پر ایمان نہیں لانے کے جب تک کہ ھم کھلم کھلا خدا کو نہ دیکھ لیں اور سورہ اعراف میں فرمایا ھے کہ موسیٰ
و اختار موسیٰ قومہ سبعین رجلا لمیقاتنا ۔ (سورہ اعراف آیت ۱۵۴)	نے ستر آدمیوں کو خدا کے وعدہ کی جگہ لے جانے کے لیے منتخب کیا ۔

حضرت موسیٰ نے بھی بحالت ذھول خدا سے کہا تھا کہ ”رب ارنی انظر الیک“ خدا نے جواب دیا ”لن ترانی و لکن انظرالی الجبل“ ۔ بنی اسرائیل نے بھی حضرت موسیٰ سے کہا کہ ھمیں خدا دکھلا دو حضرت موسیٰ پر یہ واقعہ خود گذر چکا تھا اور وہ جان چکے تھے کہ خدا کا دیکھنا محال ھے بلکہ صرف خدا کے وجود پر ایقان ھی خدا کا دیدار ھے اور خدا کے وجود پر ایقان اس کی عجائب مخلوقات پر غوز و فکر کرنے اس کے دیکھنے سے حاصل ھوتا ھے ۔ خدا نے حضرت موسیٰ کو بھی اس عجیب ھیبت ناک آتشین پہاڑ کی طرف خدا پر ایقان لانے کے لیے متوجہ کیا تھا اسی طرح حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل میں سے ستر آدمیوں کو خدا کی اس قدرت کاملہ اور تجلی شان دکھانے کو منتخب کیا تاکہ ان کو بھی ایقان وجود باری

عزاسمہ پر حاصل ہو۔

خدا کا دیکھنا دنیا میں نہ ان آنکھوں سے ہو سکتا ہے اور نہ اُن آنکھوں سے جو دل کی آنکھیں کہلاتی ہیں اور نہ قیامت میں کوئی شخص خدا کو دیکھ سکتا ہے وہ بیچون و بیچگون ہے کسی حیز و صورت میں آنے کے قابل ہی نہیں ہے پھر وہ کیوں کر دنیا میں یا عقبیٰ میں دکھائی دے سکتا ہے۔ بہت سے عابد و زاہد دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نے آنکھوں سے دنیا ہی میں خدا کو دیکھا ہے۔ بہت سے کہتے ہیں کہ ان آنکھوں سے نہیں بلکہ دل کی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اُنھوں نے دیکھا دکھایا کچھ نہیں بلکہ خود اُنہی کا خیال یا ایقان ہے جو اُنھوں نے دیکھا ہوگا عقبیٰ میں اگر خدا کا دیکھنا تسلیم کیا جاوے تو وہ بھی خدا کا دیکھنا نہ ہوگا بلکہ خود اُنہی کا ایقان اُن کو دکھائی دے گا نہ خدائے بیچون و بیچگون و بے مثل و بے نمون۔

علمائے ظاہر جو اس مسئلہ کی حقیقت نہیں سمجھتے صرف لفظوں پر بحث کیا کرتے ہیں وہ اس مسئلہ کی حقیقت کے سمجھنے کے لائق ہی نہیں ہیں۔ ہاں علمائے ربانی جنھوں نے اپنے نفس پر اور انسان کے نیچر پر غور کی ہے اُن کی سمجھ اس مسئلہ کی نسبت علمائے ظاہری کی سمجھ سے زیادہ اعتبار کے قابل ہے اور اُن میں سے بھی بالتخصیص اُن کے جو باوجود علم باطنی کے علم ظاہری میں بھی بہت بڑا درجہ کمال کا رکھتے تھے۔ اس مسئلہ کی تحقیق میں مرشدنا و مولانا عالم ربانی حضرت شیخ احمد سر ہندی نقش بندی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے جو کچھ فرمایا ہے بجنسہ اس مقام پر لکھا جاتا ہے۔

حضرت ممدوح قدس سرہ نے جلد سوم مکتوب نوزدھم جو بنام فقیر ہاشم کشمی لکھا ہے اور جس میں در باب کیفیت مشاہدہ

قلب عرفا حق جل و علا کو سوال کیا گیا تھا اس طرح ارقام فرمایا ہے " پرسیده بودند که بعضے از محققان صوفیه اثبات رویة و مشاهده او تعالٰی بدیده دل در دنیا مے فرمایند کما قال‌الشیخ العارف فی کتابه العوارف ۔ موضع المشاهد بصر القلب الخ و شیخ ابو اسحاق کلا بادی قدس سره که از قد مائے ایں طائفه علیه است و از رؤ سائے ایشاں در کتاب تعرف آورده اجمعوا علٰی انه تعالٰی لا یری فی الدنیا بالا بصار و لا بالقلوب الا من جهة الایقان توفیق میان ایں دو تحقیق چیست و رائے تو ہرکدام و اجماع باوجود اختلاف بچه معنی است ۔ بداں ارشدک الله تعالٰی که مختار ایں فقیر دریں مسئله قول صاحب تعرف است قدس سره و میداند که قلوب را دریں نشا ازاں حضرت جل سلطانه غیر از ایقان نصیبے نیست آں را رویة انگارند یا مشاهده و چوں قلب را رویة نبود ابصار را چه بود که او دریں نشا در ایں معامله بیکار و معطل است غایة ما فی الباب معنی ایقان که قلب را حاصل شده است در عالم مثال بصورت رویة ظاهر مے شود و موقن به صورت مرئی چه در عالم مثال هر معنی را صورتیست مناسب و چوں در عالم شهادت کمال یقین در رویة است آں ایقان نیز بصورت رویة در مثال ظاهر مے گردد و چوں ایقان بصورت رویة ظاهر شود متعلق آنکه موقن به است ناچار بصورت مرئی آنجا ظاهر گردد و چوں سالک آں را در مرأت مثال مشاهده مے نماید از توسط مرأت ذاهل گشته و صورت را حقیقت دانسته مے انگارد که حقیقت رویتے او را حاصل گشته است و مرئی پیدا آمده نمے داند که آں رویت صورت ایقان اوست و آں مرئی صورت موقن به او ۔ ایں از اغلاط صوفیه است و از تلبسات صور بحقائق ۔ و همیں دید چوں غالب می آید و از باطن بظاهر مے تراود سالک را در هم مے اندازد که رویة بصری نیز حاصل

گشت و مطلوب از گوش به آغوش آمد نمیداند که حصول این معنی چون دراصل که بصیرت است نیز مبنی بر تو هم و تلبس است به بصر که دریں نشا فرع او است چه رسد و رویت او را از کجا حاصل شود در رویت قلبی جم غفیر از صوفیه در تو هم افتاد افتاده اند و حکم بو قوع آں کرده و در رویت بصری مگر نا قصے ازیں طائفه در تو هم وقوع آں افتاده باشد که مخالف اجاع اهل سنت و جاعت است شکر الله سعیهم -

سوال موقن به را چون صورت در مثال پیدا شد لازم آمد که حق را سبحانه آنجا صورت بود -

جواب تجویز نموده اند که حق را سبحانه هر چند مثل نیست اما مثال است و روا داشته اند که در مثال بصورتے ظهور فرماید چناں چه صاحب فصوص قدس سره رویت اخروی را نیز بصورت جامعه لطیفه مثالیه مقرر ساخته است و تحقیق این جواب آنست که آں صورت موقن به صورت حق نیست سبحانه در مثال بلکه صورت مکشوف صاحب ایقان است که ایقان اوباں تعلق گرفته است و آں مکشوف بعض وجوه و اعتبارات ذات حق است سبحانه نه ذات حق جل و علا لهذا چون معامله عارف بذات میر سد جل سلطانهٗ این قسم تخیلات پیدا نمے شود و هیچ رویت و مرئی متخیل نمے گردد و چه ذات اقدس سبحانه را در مثال صورتے کائن نیست تا آنرا بصورت مرئی وا نماید و ایقان آنرا بصورت وا نماید یا آنکه گوئیم در عالم مثال صور معانی است نه صورت ذات و چون عالم بتمامه مظاهر اسماء و صفات است و از ذاتیه بهره ندارد و چناں‌چه تحقیق آں را در مواضع متعدد نموده ایم پس ناچار بتمامه از قسم معانی باشد و در مثال آنرا صورتے کائن بود و در کمالات و جوبی هر جا صفت و شان است که قیام بذات وارد از قبیل معانی است که اگر آں را در مثال صورتے

بود و او بالنقص گنجائش دارد اما ذات او را سبحانه حاشا که در مرتبه از مراتب صورت بود چه صورت مستلزم تهدید و تقیئد است در هر مرتبه که باشد مجوز نیست مراتب همه که مخلوق اویند سبحانه کجا گنجائش دارند که خالق را محدود و مقید سازند هر که تجویز مثال در آن حضرت جل شانه نموده است باعتبار وجوه و اعتبارات است نه باعتبار عین ذات تعالیٰ و هر چند تجویز مثل در وجوه و اعتبارات حضرت ذات تعالیٰ هم برین فقیر گران است مگر آنکه در ظلے از اظلال بعیده آن تجویز نموده آید ازیں بیان واضح گشت که در عالم مثال ارتسام صور معانی و صفات را کائن است نه ذات تعالیٰ را پس آن چه صاحب فصوص تجویز رویت اخروی بصورت مثالیه نموده است چناں چه گذشت آن رویت حق نیست تعالیٰ بلکه رویت صورت حق هم نیست سبحانه چه او را سبحانه صورتے نیست تا رویت بآن تعلق پیدا کند و اگر در مثال صورتے هست ظلے از اظلال بعیده او را کائن است پس رویت آن رویت حق چرا باشد سبحانه شیخ قدس سره در نفی رویت حق جل و علا از معتزله و فلاسفه هیچ کم پائی نمی کند بلکه اثبات رویت بر نهجے مے نماید که مستلزم نفی رویت است و آن ابلغ در نفی است از صریح نفی لان الکنایة ابلغ من التصریح قضیه مقرره است ایں قدر فرق است که مقتدائے آن جماعت عقل شان است و مقتدائے شیخ کشف بعید از صحت مانا که اوله غیر تا مه مخالفان که در متخیله شیخ نشسته بود کشف او را نیز دریں مسئله از صواب منحرف گردانیده است و مائل بمذهب شان ساخته چون از اهل سنت بود صورت اثبات نموده است و بآن اکتفا کرده و آن را رویت انگاشته ربنا لا تواخذنا ان نسینا او اخطانا و تحقیق ایں مسئله دقیقه که در حل بعض از مواضع کتاب عوارف نوشته است نیز تحریر یافته است و آن چه

از اجماع پرسیده بودند تواند بود که تا آن وقت خلافے که شایان اعتداد باشد بظهور نیامده باشد یا اجماع مشائخ عصر خود خواسته باشد واللہ سبحانه اعلم بحقیقه الحال ۔ انتہٰی ۔

شانزدهم ۔ ذکر استسقائے قوم موسیٰ ۔ هفدهم ۔ سایه کرنا ابر کا ۔ هیزدهم ۔ من و سلویٰ کا آترنا نوزدهم ۔ دخول باب

یه چاروں موضوع سرسید نے حضرت موسیٰ علیه السلام کے متعلق اپنے ایک دوسرے مضمون میں جو اس کے بعد نقل کیا جا رها هے ۔ درج کر دیے هیں ۔ لٰهذا یه آخر کی چاروں بحثیں اگلے مضمون میں ملاحظه فرمائیں ۔ اختصار کے لحاظ سے یه چاروں باتیں یہاں چھوڑ دی گئی هیں ۔ (محمد اسماعیل پانی پتی)

قصہ موسیٰ علیہ السلام کا

حضرت موسیٰ کے جو واقعات قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں وہ سورۂ بقر ، نسا ،مائدہ ، انعام ، اعراف ، یونس ، ہود ، بنی اسرائیل کہف ، مریم ، طٰہٰ[1] ، مومنین ، شعرا ، نمل ، قصص ، صافات ، مومن ، زخرف ، دخان ، نازعات ، بیس سورتوں میں آئے ہیں ۔ ان میں مکرر بھی مضامین بیان ہوئے ہیں اور کسی میں کسی جگہ کا واقعہ بیان ہوا ہے کسی میں کسی جگہ کا۔ ہم ان تمام آیات اور انفاظ کو منتخب کر کر بہ ترتیب موسیٰ کے قصہ کو مع ترجمہ حاشیہ[1] میں لکھ دیتے ہیں تاکہ تمام قصہ جس قدر قرآن مجید میں ہے بلفظہ بہ ترتیب معلوم ہو جاوے اور پھر ایک آیت کے مطلب کو اس کے مناسب مقام پر بیان کریں گے ۔

---

(۱) نتلوا علیک من نباء موسیٰ و فرعون بالحق لقوم یومنون ان فرعون علیٰ فی الارض و جعل اھلھا شیعاً یستضعف طائفة منھم یذبح ابناء ھم و یستحیی نساء ھم انه کان من المفسدین (قصص) یسومونکم (آل فرعون) سوء العذاب (بقر) یقتلون (اعراف) یذبحون ابناءکم و یستحیون نساءکم و فی

ہم ٹھیک تجھ کو سنا دیں ایمان والوں کے لیے موسیٰ و فرعون کی کچھ خبریں فرعون دنیا میں بہت بڑھ گیا تھا اور مصر کے رہنے والوں کو گروہ گروہ بتا دینا تھا اور ان میں سے ایک گروہ کو زبون حالت میں پہنچا دیا تھا ۔ ذبح کر ڈالتا تھا ان کے بیٹوں کو اور جیتا رہنے دیتا تھا ان کی بیٹیوں کو اور وہ مفسدوں میں سے تھا ۔ فرعون والے بنی اسرائیل کو بری طرح کے عذاب پہنچاتے تھے ۔ بنی اسرائیل کے بیٹوں کو مار ڈالتے تھے

سورہ بقر میں جو واقعات حضرت موسیٰ کے بیان ہوئے ہیں
ان میں سے واقعہ عبور بحر اور غرق فرعون قابل غور کے ہے اول

(بقیہ حاشیہ)
ذالکم بلاء من ربکم عظیم (بقر) نرید ان نمن علی الذین استضعفوا فی الارض و نجعلهم ائمة و نجعلهم الوارثین و نمکن لهم فی الارض و نری فرعون و هامان و جنودهما منهم ما کانو یحذرون (قصص) ۔
و اوحینا الی ام موسیٰ ان ارضعیه فاذا خفت علیه (قصص) اقذ فیه فی التابوت ('طه') فالقیه (قصص) فاقذ فیه فی الیم فالیلقه الیم بالساحل یا خذه عدولی و عدوله (طه) و لا تخافی و لا تحزنی انا رادوه الیک و جاعلوه من المرسلین فالتقطه آل فرعون (قصص) فبصرت (ای اخت موسیٰ) به عن جنب و هم لا یشعرون (قصص) قالت امراة فرعون قرة عین لی و لک لا تقتلوه عسیٰ ان ینفعنا او نتخذه ولدا (قصص) و حرمنا علیه المراضع من قبل فقالت

ذبح کر ڈالتے تھے اور ان کی بیٹیوں کو جیتا رہنے دیتے تھے اور اس میں بنی اسرائیل پر اُن کے پروردگار کی طرف سے بڑی بلا تھی۔ ہم نے ان پر جو دنیا میں کمزور ہو گئے تھے مہربانی کرنی چاہی اور ان کو سردار بنانا اور ان کو وارث بنانا اور زمین پر قدرت والا ٹھہرانا اور فرعون اور ہامان اور ان کے لشکروں کو جس بات سے وہ ڈرتے تھے ان کے ہاتھ سے دکھلانا چاہا ۔
ہم نے موسیٰ کی ماں کے دل میں یہ بات ڈالی کہ موسیٰ کو دودھ پلاوے جب اس کو موسیٰ کے مارے جانے کا خوف ہو تو اس کو ایک صندوق میں رکھ دے پھر اس کو ڈال دے پھینک دے دریا میں پھر دریا میں اس کو کنارہ پر ڈال دے گا ۔ اس کو آٹھا لے گا میرا دشمن اور اس کا دشمن اور تو مت ڈر اور نہ غمگین ہو ہم اُس کو پھر تیرے پاس لوٹا دیں گے اور اس کو رسولوں میں سے کریں گے ۔ (جب موسیٰ کی ماں نے ان کو دریا میں ڈال دیا اور وہ صندوق کنارہ پر آ لگا) تو فرعون کے لوگوں میں سے کسی نے اس کو اٹھا لیا ۔ موسیٰ کی بہن نے دور سے اُس کو دیکھا اور فرعون

تو بہت لوگوں نے یہ غلطی کی ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ نے دریائے نیل سے عبور کیا تھا یہ بالکل غلط ہے

(بقیہ حاشیہ)

ھل ادلکم علی اھل بیت یکفلونہ لکم و ھم لہ ناصحون فرددنہ الیٰ امہ‌لی تقر عینھا و لا تحزن۔ (قصص)

والے نہیں جانتے تھے۔

ولما بلغ اشدہ واستوی (قصص) دخل المدینۃ علی حین غفلۃ من اھلھا فوجد فیھا رجلین یقتتلان ھذا من شیعتہ و ھذا من عدوہ فاستغاثہ الذی من شیعتہ علی الذی من عدوہ فوکرہ موسیٰ فقضی علیہ (قصص) فاصبح فی المدینۃ خائفاً یترقب فاذ الذی استنصرہ بالامس یستصرخہ قال لہ موسیٰ انک لغوی مبین فلما ان اراد ان یبطش بالذی ھو عدولھما قال یا موسیٰ اترید ان تقتلنی کما قتلت نفسا بالامس۔ (قصص)

و جاء رجل من اقصی المدینۃ یسعی قال یا موسیٰ ان الملاء یا تمرون بک لیقتلوک فاخرج انی لک من الناصحین فخرج منھا خائفا یترقب قال رب نجنی من القوم الظالمین (قصص)۔

فرعون کی عورت بولی کہ یہ تو میری اور تیری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے اس کو مت مارو شاید اس سے ہم کو نفع ہو اور ہم اس کو بیٹا بنا لیں ہم نے پہلے ہی پلائیوں کا دودھ اس پر حرام کر دیا تھا۔ موسیٰ کی بہن بولی کہ کیا میں تم کو ایسی گھر والی بتا دوں جو تمہارے لئے اس کو پالے اور اس کو اچھی طرح رکھیں (اس نے موسیٰ کی ماں ہی کو بتایا) پھر ہم نے موسیٰ کو اس کی ماں کے پاس ہی لوٹا دیا تا کہ اس کی آنکھوں کو ٹھنڈک رہے اور غمگین نہ ہو۔ جب موسیٰ چاق چوبند ہوا تو شہر والوں کی بے خبری میں شہر میں گیا وہاں اس نے دو آدمیوں کو مارتے مرتے پایا۔ ایک تو موسیٰ کی قوم کا تھا اور ایک اس کے دشمنوں میں سے تھا موسیٰ کی قوم والے نے اس کے دشمنوں کی فریاد کی موسیٰ نے اس کو گھونسا مارا کہ وہ مر گیا۔ پھر شہر ہی میں ڈرتے ہوئے اور کسی خرابی کے آنے کی توقع میں

بلکه انھوں نے بحر احمر کی ایک سے عبور کیا تھا ۔ تمام مفسرین حضرت موسیٰ کے عبور اور فرعون کے غرق ہونے کو بطور ایک ایسے معجزے

(بقیه حاشیه)

قال موسیٰ لفتاہ لا ابرح حتیٰ ابلغ مجمع البحرین او امضی حقبا فلما بلغ مجمع بینھما نسیا حوتھما فاتخذ سبیله فی البحر سربا فلما جاوزا قال لفتاہ اتیناہ غدائنا لقد لقینا من سفرنا ھذا نصبا قال ارایت اذا وینا الی الصخرة فانی نسیت الحوت وما انسانیه الا الشیطن ان اذکرہ واتخذ سبیله فی البحر عجبا قال ذالک ما کنا نبغ فارتد علیٰ آثار ھما قصصا فوجدا عبدا من عبادنا اتیناہ رحمة من عندنا وعلمناہ من لدنا علما قال له موسیٰ ھل اتبعک علیٰ ان تعلمن مما علمت رشدا قال انک لن تستطیع معی صبرا و کیف تصبر علی مالم تحط به خبرا قال ستجدنی ان شاء الله صابرا ولا اعصی لک امرا قال فان اتبعتنی فلا تسئلنی عن شی حتی

صبح کی جس مدد موسیٰ نے کل کی تھی اور اس نے موسیٰ کو پکارا موسیٰ نے اسے کہا تو ھی علانیه جھگڑالو ھے پھر موسیٰ نے اس کے جو اس کا اور موسیٰ کا بھی دشمن تھا پکڑنے کا ارادہ کیا (جو چلایا تھا وہ یه سمجھا که موسیٰ مجھی کو پکڑے گا) کہا اے موسیٰ کیا تو میرے مار ڈالنے کا بھی ارادہ کرتا ھے جس طرح که کل تو نے ایک آدمی کو مار ڈالا ھے ۔ اتنے میں ایک آدمی شہر کے پرلے کنارے سے دوڑتا آیا کہا اے موسیٰ فرعون کے درباری تیری نسبت مشورہ کرتے ھیں که تجھ کو مار ڈالیں پس یہاں سے نکل جا میں تیرا خیر خواہ ھوں ۔ پھر موسیٰ ڈرتا ھوا اور کسی آفت کی توقع کرتا ھوا وھاں سے نکلا اور کہا اے پروردگار اس ظالم قوم سے مجھے بچا ۔ موسیٰ نے اپنے ساتھی جوان سے (غالباً اسی شخص سے جس نے آ کر قتل کے مشورہ کی خبر دی تھی) کہا که میں ٹھہرنے کا ھی نہیں جب تک دو دریاؤں کے ملنے کے مقام تک نه پہنچ جاؤں یا چلا جاؤں گا بہت دنوں تک (یعنی اس

کے قرار دیتے جو خلاف قدرت واقع ہوا ہو جس کو انگریزی میں سپر نیچرل کہتے ہیں کہ اور یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ نے سمندر

(بقیہ حاشیہ)

احدث لک منه ذکرا فانطلقا حتی اذا رکبا فی السفینة خرقها قال اخرقتها لتغرق اهلها لقد جئت شیئاً امرا قال الم اقل انک لن تستطیع معی صبرا قال لا تو اخذنی بما نسیت ولا ترهقنی من امری عمرا فانطلقا حتیٰ اذ لقیا غلاما فقتله قال اقلت نفسا زکیة بغیر نفس لقد جئت شیئاً نکرا قال الم اقل لک انک لن تستطیع معی صبرا قال ان سالتک عن شئی بعدها فلا تصاحبنی قد بلغت من لدنی عذرا فانطلقا حتیٰ اذا اتیا اهل قریة استطعما اهلها فابو ان یضیفو لهما فوجدا فیها جدار یریدان ینقض فاقامه قال لو شئت لتخذت علیه اجرا قال هذا فراق بینی و بینک سانئبک بتاویل مالم تستطع علیه صبرا اما السفینة فکانت

سے بھی پرے) - پھر وہ جب دونوں دریاؤں کے ملنے کے مقام تک پہنچے تو اپنی مچھلی وہاں رکھ کر بھول گئے پھر مچھلی نے خشک جگہ میں سے دریا کا رستہ لیا پھر جب وہ اس سے آگے بڑھے تو موسیٰ نے اپنے ساتھی جوان سے کہا کہ ہمارا صبح کا کھانا لاؤ ہم نے تو اس سفر میں بڑی مصیبت اٹھائی اس جوان نے کہا کہ تم نے دیکھا ہوگا کہ جب ہم اس پتھر سے تکیہ لگا کر بیٹھے تو میں اس مچھلی کو بھول گیا (یعنی اس کا خیال نہ رہا) اور اس قصہ کا ذکر کرنا (یعنی موسیٰ سے) بجز شیطان کے کسی نے مجھ کو نہیں بھلایا اور مچھلی نے عجب طرح سے دریا میں اپنا رستہ لیا موسیٰ نے کہا یہی ہے جو ہم چاہتے تھے (یعنی دونوں دریاؤں کے ملنے ہی تک ہم آنا چاہتے تھے اب آگے کیوں جاویں) پھر وہ دونوں اپنے قدموں کا نشان دیکھتے ہوئے الٹے پھرے پھر ان دونوں بندوں کو میرے بندوں میں سے ایک بندہ ملا جس پر میں نے اپنی مہربانی کی تھی اور اس کو میں نے دانش مندی سکھا دی تھی

پر اپنی لاٹھی ماری وہ پھٹ گیا اور پانی مثل دیوار کے یا پہاڑ کے ادھر اُدھر کھڑا ہو گیا اور پانی نے بیچ میں خشک رستہ چھوڑ دیا

(بقیہ حاشیہ)

لمساکین یعمون فی البحر فاردت ان اعیبھا و کان و راءھم ملک یاخذ کل سفینۃ غصبا و اما الغلام فکان ابواہ مومنین فخشینا ان یرھقھما طغیانا و کفرا فا ردنا ان یبدلھما ربھما خیرا منہ زکوۃ و اقرب رحما و اما الجدار فکان لغلامین یتمین فی المدینۃ و کان تحتہ کنزلھما و کان ابو ھما صالحاً فاراد ربک ان یبلغا اشد ھما و یستخر جا کنزلھما رحمۃ من ربک وما فعلتہ عن امری ذالک تاویل مالم تستطع علیہ صبرا (کہف)۔

موسٰی نے اس سے کہا کہ کیا میں تمہارے ساتھ ہو لوں اگر مجھ کو بھی ان دانشمندیوں میں سے جو تم نے سیکھی ہیں سکھلا دو اس بندے نے کہا کہ تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے اور تم کس طرح پر اس بات پر صبر کرو گے جو تمہارے دانش کے احاطہ میں نہیں ہے - موسٰی نے کہا انشاء اللہ تم مجھ کو صبر کرنے والا پاؤ گے اور میں تمہارے کسی کام میں بر خلاف نہ کروں گا اُس بندے نے کہا کہ اگر تم میری تابعداری کرنا چاہتے ہو تو جب تک میں خود ہی نہ کہہ دوں مجھ سے کسی بات کو مت پوچھنا پھر دونوں چلے یہاں تک کہ جب ایک کشتی پر سوار ہوئے تو اس بندے نے کشتی میں سوراخ کر دیا موسٰی نے کہا کہ کیا تم نے کشتی کے لوگوں کے ڈبونے کے لیے اس میں شگاف کیا ہے اُس بندے نے کہا کہ دیکھو تم نے یہ بری بات کی اس بندے نے کہا کہ میں نے تم سے نہ کہا تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے موسٰی نے کہا کہ جو بات میں نے بھول کر کہی اس پر مواخذہ مت کرو اور میرے کام میں سختی مت ڈالو پھر دونوں چلے یہاں تک کہ جب ایک نوجوان سے ملے تو اس بندے نے اس نوجوان کو مار ڈالا موسٰی نے کہا کہ تم نے ایک شخص بے گناہ کو بغیر جان کے بدلے مار ڈالا - دیکھو تم نے برا کام کیا اس بندے نے کہا میں نے تم سے نہ کہا

اور حضرت موسیٰ اور تمام بنی اسرائیل اس رستہ سے پار اُتر گئے۔ فرعون بھی اُسی رستہ میں دوڑ پڑا اور پھر سمندر مل گیا اور سب

(بقیہ حاشیہ)
تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے موسیٰ نے کہا کہ اگر اس کے بعد میں تم سے کوئی بات پوچھوں تو پھر مجھ کو اپنے ساتھ مت رکھنا میں اپنا عذر تمہارے سامنے پیش کرتا ہوں پھر وہ دونوں چلے یہاں تک کہ ایک گاؤں کے لوگوں کے پاس پونچے توان سے کھانا مانگا انہوں نے ان کو کھانا کھلانے سے انکار کیا وہاں ان دونوں نے ایک دیوار دیکھی کہ گر پڑنا چاہتی ہے اُن دونوں نے اس کو سیدھا بنا دیا حضرت موسیٰ کو بھوک لگی ہوئی تھی کسی نے کھانے کو دیا نہ تھا ٹکا پیسہ پاس نہ تھا انہوں نے اس بندے سے کہا کہ اگر تم چاہتے تو اس پر مزدوری لے لیتے اس بندے نے کہا کہ بس اب مجھ میں اور تجھ میں جدائی ہے میں ان باتوں کی تاویل جن پر تم صبر نہ کر سکے بتا دیتا ہوں وہ کشتی تو غریب آدمیوں کی تھی جو دریا میں کھیو آکھیا کرتے تھے۔ میں نے اس کو عیب دار کر دینا چاہا ان کے پرے ایک بادشاہ ہے جو زبردستی سے ہر ایک کشتی کو پکڑ لیتا ہے اور وہ نوجوان اس کے ماں باپ ایمان والے ہیں مجھ کو خوف ہوا کہ یہ ان کو سرکشی وکفر میں تنگ کرے گا پس میں نے چاہا کہ ان کا پروردگار اس کا نعم البدل پاکیزگی اور محبت میں ان کو دے گا اور وہ دیوار شہر کے دو یتیم لڑکوں کی تھی اور اس کے نیچے ان کے لئے خزانہ تھا اور ان کا باپ اچھا آدمی تھا پس میرے پرور دگار نے چاہا کہ جب وہ دونوں جوانی میں بھر پور ہوں وہ اپنا خزانہ نکال لیں تیرے پرور دگار کی مہربانی سے اور میں نے یہ کام اپنی طرف سے نہیں کیے یہ بیان ان باتوں کا ہے جن پر تو صبر نہ کر سکا۔

و لما توجہ تلقاء مدین قال عسی ربی ان یھدنی سواء السبیل ولما ورد ماء مدین وجد علیہ اُمۃ من الناس یسقون و وجد من دونھم امرا تین

اور جب موسیٰ شہر مدین کی طرف چلے تو کہا کہ اُمید ہے کہ میرا پروردگار مجھ کو سیدھا رستہ بتا دے اور جبکہ شہر مدین کے پانی کے پاس پہنچے تو وہاں لوگوں کے گروہ کو (مویشی کو) پانی پلاتے پایا اور

ڈوب گئے۔ اگر درحقیقت یہ واقعہ خلاف قانون قدرت واقع ہوا تھا تو خدا تعالیٰ نے سمندر کے پانی ہی کو ایسا سخت کر دیتا کہ

(بقیہ حاشیہ)

تذودان قال ما خطبکما قالتا لا نسقی حتی یصدر الرعاء و ابونا شیخ کبیر فسقی لہما ثم تولیٰ الی الظل قال رب انی لما انزلت الی من خیر فقیر فجاءتہ احداٰ ھما تمشی علی استحیاء قالت ان ابی یدعوک لیجزیک اجر ماسقیت لنا فلما جاءہ وقص علیہ القصص قال لا تخف نجوت من القوم الظلمین قالت احدا ھما یابت استاجرہ ان خیر من اساجرت القوی الامین قال انی ارید ان انکحک احدی ابنتی ھا تین علی ان تاجرنی ثمنی حجج فان اتممت عشرا فمن عندک ما اریدان اشق علیک ستجدنی انشاء اللہ من الصالحین قال ذالک بینی و بینک ای الاجلین قضیت فلا عدوان علی و اللہ علی ماںقول وکیل۔ (قصص)

اس کے پرے دو عورتوں کو پایا کہ اپنے مویشی روکے کھڑی ہیں موسیٰ نے کہا کہ تمہارا کیا حال ہے انھوں نے کہا کہ جب تک چرواہے پانی پلا کر نہ لے جاویں ہم نہیں پلا سکتیں اور ہمارا باپ بڈھا ہے پھر موسیٰ نے ان دونوں کے مویشی کو پانی پلا دیا پھر چھاؤں میں جا کھڑے ہوئے پھر کہا کہ اے میرے پروردگار تو نے میری ایسی حالت کر دی ہے کہ تھوڑی سی بھلائی کا بھی محتاج ہوں پھر ان دونوں میں سے ایک شرمیلی چلتی ہوئی موسیٰ کے پاس آئی کہا میرے باپ نے تجھ کو بلایا ہے تاکہ ہمارے (مویشی کو) جو پانی تو نے پلایا ہے اس کی اجرت دے پھر جب موسیٰ اس کے پاس (یعنی اس عورت کے باپ کے پاس) آئے اور اپنا قصہ اس سے کہا تو اس نے کہا کہ مت ڈرو تم نے ظالم قوم سے نجات پائی اس کی بیٹیوں میں سے ایک نے کہا کہ اے باپ اس کو مزدوری پر رکھ لے۔ اچھا مزدور جس کو مزدوری پر لگا دے طاقت ور اور دیانت دار ہونا چاہیے اس شخص نے موسیٰ سے کہا کہ میں نے ارادہ کیا ہے کہ اپنی دو

که مثل زمین کے اس پر سے چلے جاتے - خشک رستہ نکالنے ھی سے
یہ بات پائی جاتی ھے کہ یہ واقعہ یا معجزہ جو اس کو تعبیر کرو

(بقیه حاشیه)

بیٹیوں میں سے ایک کا نکاح تجھ سے کر دوں اس بات پرکہ تو آٹھ برس تک میرے ھاں مزدوری کرے پھر اگر تو دس برس پورے کرے دے تو تیری طرف سے ھوگا میں تجھ پر مشقت ڈالنا نہیں چاھتا تو مجھ کو انشاء اللہ اقرار پورا کرنے والوں میں پاوے گا موسیٰ نے کہا کہ مجھ میں اور تجھ میں یہ اقرار ھو چکا ان دونوں میں سے جونسی میں پوری کر دوں تو پھر مجھ پر زیادتی نہ ھو اور جو میں کہتا ھوں خدا اس مددگار ھے - پھر موسیٰ

فلبثت سنین فی اھل مدین ثم جئت علیٰ قدر یا موسیٰ - (طہٰ)

اھل مدین میں چند سال رھا پھر تو اے موسیٰ وقت پر آ گیا -

فلما قضیٰ موسیٰ الا جل وسار باھلہ انسٰ من جانب الطور نارا قال لاھلہ امکثوا انی انست نار العلّی آیتکم منھا بخبر (قصص) او آتیکم بشاب قبس (نمل) جذوۃ من النار لعلکم تصطلون (قصص) اواجد علی النار ھدی (طہٰ) فلما اتا ھانودی من شاطی الوادی الا یمن (قصص) من جانب الطور الا یمن (مریم) فی البقعه المبارکة من الشجرۃ (قصص) ان بورک من فی النار و من حولھا و سبحان اللہ رب العالمین یا موسیٰ انہ انا اللہ العزیز

پھر جب موسیٰ نے میعاد مقررہ پوری کی اور اپنی بی‌بی‌کو لیکر چلا تو اس‌کو پہاڑ کی‌جانب سے آ گ معلوم‌ھوئی موسیٰ نے اپنی بیوی سےکہا کہ ٹھیرو مجھےآگ معلوم ھوئی شاید میں‌وھاں سے کچھ خبر لےآوں یا ایک بھڑکتی ھوئی لکڑی‌اٹھا لاؤں‌یا آگ‌کا انگارہ‌لےآوں‌تاکہ تم تاپو یا آ گ کے پاس کوئی راہ بتانے والا پاؤں پھر جب‌موسیٰ آ گ کےپاس آیا تو جنگل کے دائیں کنارے سے پہاڑ کی دائیں‌طرف سے اس مبارک جگہ میں درخت میں سے کسی‌نے اس‌کو آواز دی کہ‌جو آگ میں‌ھےاور جو اس کےگرد ھے اس‌کو برکت دی گئی ھے اور اللہ پاک ھے اور تمام عالموں کا پالنےوالا ھے اے موسیٰ بیشک میں ھی‌خدا ھوں سب پر غالب اور بڑی حکمت والا بیشک میں

مطابق قانون قدرت کے واقع ہوا تھا جو مطلب مفسرین نے بیان کیا ہے وہ مطلب قرآن مجید کے لفظوں سے بھی نہیں نکلتا ۔ سمندر میں

(بقیہ حاشیہ)

الحکیم (نمل) انی انا اللہ رب العالمین (قصص) انی انا ربک فاخلع نعلیک انک بالواد المقدس طویٰ (طہٰ) ما تلک بیمینک یا موسیٰ قال ھی عصای اتو کاء علیھا و اھش بھا علی غنمی ولی فیھا ما رب اخری (طہٰ) الق عصاک فلما راھا تھتز کانھا جان ولی مدبر ولم یعقب یا موسیٰ اقبل (قصص) خذھا ولا تخف سنعید ھا سیرتھا الاولی ۔ (طہٰ) اسلک یدک فی جیبک (قصص) واضمم یدک الیٰ جناحک تخرج بیضاء من غیر سوء آیۃ اخری (طہٰ) و اضمم الیک جناحک من الذھب فذنک برھانن من ربک (قصص) فی تسع آیات (نمل) الیٰ فرعون و ملائہ انھم کانوا قوماً فاسقین (قصص) و قربناہ نجیا ۔ (مریم)

ہی خدا ہوں تمام عالموں کا پالنے والا بیشک میں تیرا خدا ہوں پھر جوتیاں اتار ڈال بے شبہ تو پاک جنگل میں پھرتا ہے ۔ اے موسیٰ یہ کیا تیرے دائیں ہاتھ میں ہے موسیٰ نے کہا کہ یہ میری لاٹھی ہے اس کو میں ٹیک لیتا ہوں اور اس سے اپنے ریوڑ پر پتے جھاڑ لیتا ہوں اور وہ میرے کام میں بھی آتی ہے خدا نے کہا کہ اپنی لاٹھی ڈال دے (جب ڈال دی) تو لاٹھی کو ہلتے ہوئے دیکھا گویا کہ وہ سانپ ہے تو موسیٰ پیٹھ پھیر کر پلٹا اور پیچھے پھر کر بھی نہ دیکھا خدا نے کہا اسے موسیٰ آگے بڑھ اس کو پکڑ لے اور مت ڈر وہ جیسی پہلی تھی ویسی ہی ہو جاویگی ڈال اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں اور اپنے ہاتھ کو اپنے بازو سے ملا دے تیرا ہاتھ بےعیب سفید نکلے گا بطور ایک دوسری نشانی کے جو ڈر تجھ کو ہوا ہے اس سے اپنے کو دونوں بازو ملا کر تھام ۔ پھر یہ دونوں نشانیاں ہیں تیرے پروردگار کی نو نشانیوں میں سے فرعون اور اس کے درباریوں کے لئے بیشک وہ بد کار قوم ہے اور ہم نے موسیٰ کو باتیں کرنے سے مقرب کیا ۔

راستہ ہو جائے کی نسبت قرآن مجید میں تین جگہ ذکر آیا ہے اول سورۂ بقر میں جہاں فرمایا ہے کہ ''اذ فرقنا بکم البحر'' دوم

(بقیہ حاشیہ)

ثم ارسلنا موسیٰ واخاہ ہارون بایتنا و سلطان مبین الی فرعون و ملائه (ہود) ہامان و قارون (سومن) ان اخرج قومک من الظلمات الی النور (ہود) ان ایت القوم الظلمین قوم فرعون (شعراء) اذھب الی فرعون انه طغیٰ (نازعات) قال رب انی اخاف ان یکذبون (شعرا) رب انی قتلت منھم نفسا (قصص) و لھم علی ذنب فاخاف ان یقتلون (شعرا) و یضیق صدری ولا ینطلق لسانی (شعرا) رب اشرح لی صدری و یسرلی امری و احلل عقدۃ من لسانی یفقھوا قولی (طہٰ) و اخی ہارون ھو افصح منی لسانا (قصص) اجعل لی وزیرا من اھلی ہارون اخی (طہٰ) فارسل الی ہارون (شعرا) فارسله معی رداء (قصص) قال سنشد عضدک باخیک ونجعل لکما سلطانا (قصص) قال قد اوتیت سولک یا موسیٰ (طہٰ) اذھب انت و اخوک

پھر ہم نے موسیٰ کو اور اس کے بھائی ہارون کو اپنی نشانیوں اور علانیہ غلبہ کے ساتھ فرعون اور اس کے درباریوں ہامان اور قارون کے پاس بیھجا کہ اپنی قوم کو اندھیرے سے روشنی میں نکال لاوے - جاؤ ظالم قوم کے پاس جو فرعون کی قوم ہے جا فرعون کے پاس کہ وہ سرکش ہے موسیٰ نے کہا کہ اے پروردگار میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے جھٹلا دینگے اے نے پرورد گار میں نے ان میں کا ایک آدمی مار ڈالا ہے - میں ان کا قصور کیا ہے پھر میں ڈرتا ہوں کہ وہ مار ڈالیں گے میرے سینے میں دم گھٹ جاتا ہے اور میری زبان نہیں چلتی - اے پرورد گار میرے سینہ کو کھول دے اور میرا کام مجھ پر آسان کر دے اور میری زبان کی گرہ کھول دے تا کہ وہ میری بات سمجھیں اور میرے بھائی ہارون کی زبان مجھ سے زیادہ فصیح ہے میرے کنبہ میں سے میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر کر پھر ہارون کو میرے پاس بھیج پھر اس کو میرے ساتھ بطور مددگار کے بھیج خدا نے کہا میں تیرے بازو کو تیرے بھائی سے مضبوط کر دوں گا اور تم دونوں کو وہ غلبہ

سورہ الشعر میں فرمایا کہ ''او حینا الٰی موسیٰ ان اضرب بعصاک البحر فانفلق فکان کل فرق کالطود العظیم

(بقیہ حاشیہ)

بایاتی لا و تنیا فی ذکری اذھبا الٰی فرعون انہ طغی (طہٰ) قال کلا فاذھبا بایتنا انا معکم مستمعون فائتیا فرعون فقولا انا رسول رب العالمین ان ارسل معنا بنی اسرائیل (شعرا) فقولا لہ قولا لینا لعلہ یتذکر او یخشی قالا ربنا اننا نخاف ان یفرط علینا او ان یطغی قال لاتخافا اننی معکما اسمع و اری فاتیاہ (طہٰ) فقل ھل لک الی ان تزکی و اھدیک الی ربک فتخشی (نازعات) فقولا انا رسولا ربک فارسل معنا بنی اسرائیل ولا تعذبھم قد جئناک بایۃ من ربک (طہٰ) قال فمن ربکما یا موسیٰ قال ربنا یا موسیٰ قال ربنا الذی اعطی کل شی خلقہ ثم ھدی قال فما بال القرون الاولیٰ قال علمھا عند ربی (طہٰ) قال و ما رب العالمین قال رب السموات والارض وما بینھما

دوں گا ۔ خدا نے کہا اے موسیٰ جو تو نے مانگا تجھ کو دیا گیا جاتو اور تیرا بھائی میری نشانیوں سمبیت اور سستی نہ کرو میری نصیحت میں تم دونوں فرعون پاس جاؤ کہ وہ سرکش ھے خدا نے کہا کہ وہ ھر گز تم کو نہ مار سکیں گے پھر تم دونوں میری نشانیوں سیمت جاؤ میں تمہارے ساتھ ہوں تمہاری بات سنوں گا پھر فرعون کے پاس جاؤ اور پھر اس سے کہو کہ ہم دونوں تمام عالموں کے پروردگار کے رسول ھیں۔ ھمارے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دے اور اس سے نرم بات کہو شاید کہ نصیحت مانے اور خوف کرے انھوں نے کہا کہ اے ھمارے پروردگار بیشک ہم ڈرتے ھیں کہ ھم پر زیادتی کرے یا ھم سے سرکشی کرے خدا نے کہا کہ تم مت ڈرو میں تمہارے ساتھ ھوں تمہاری بات سنوں گا اور تم کو دیکھتا رھوں گا پھر اس کے پاس جاؤ موسیٰ گئے اور کہا کہ تجھ کو پاک ھونے کی کچھ خواھش ھے اور میں تجھ کو تیرے پروردگار کی راہ بتاؤں تاکہ تو خوف کرے خدا نے کہا کہ تم دونوں فرعون سے کہو کہ ھم دونوں تیرے پروردگار کے رسول

تیسرے سورہ طہ[1] میں جہاں فرمایا ہے کہ فاوحینا الی موسیٰ ان اسر بعبادی فاضرب لھم طریقا فی البحر یبسا الا

(بقیہ حاشیہ)

ان کنتم موقنین قال لمن حوله الا تستمعون قال ربکم و رب ابائکم الاولین ۔ ہیں پھر ہمارے ساتھ نبی اسرائیل کو بیھج دو اور ان کو عذاب مت دے ہم تیرے پروردگار کی نشانی لائے ہیں فرعون بولا اے موسیٰ تمہارا پروردگار کون ہے ۔ موسیٰ نے کہا کہ ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے تمام چیزوں کی خلقت ان کو عطا کی ہے پھر سیدھی راہ بتائی ہے فرعون نے کہا کہ پھر اگلے زمانے کے لوگوں کا کیا حال ہے ۔ موسیٰ نے کہا کہ اس کی خبر خدا کو ہے ۔ فرعون نے کہا کہ تمام عالموں کا خدا کون ہے موسیٰ نے کہا جو آسمانوں کا اور زمین اور جوکچھ ان میں ہے اس سب کا پروردگار ہے اگر تم یقین لاؤ ۔ فرعون نے ان لوگوں سے جو اس کے ارد گرد تھے کہا کہ کیا تم نہیں سنتے ہو موسیٰ نے کہا کہ تمہارا پروردگار اور ہم سب کے باپ دادا کا ۔

قال ان رسولکم الذی ارسل علیکم لمجنون قال رب المشرق والمغرب و مابینھما ان کنتم تعقلون قال لئن اتخذت الھا غیری لا جعلنک من المسجونین (شعرا) قال الم نربک فینا ولید او لبثت فینا من عمرک سنین و فعلت فعلتک التی فعلت و انت من الکافرین قال فعلتھا اذا و انا من الضالین ففررت منکم لما خفتکم فوھب لی ربی حکما و جعلنی من المرسلین و تلک نعمة تمنھا علی ان عبدت بنی

فرعون نے اپنے درباریوں سے کہا کہ تمہارے پاس جو رسول آیا ہے البتہ دیوانہ ہے موسیٰ نے کہا (کہ تمام عالموں کا خدا وھی ہے) جو مشرق و مغرب کا اور جو اس میں ہے اس سب کا پرودگار ہے اگر تم سمجھتے ہو فرعون نے کہا کہ اگر تو نے میرے سوا اور کسی کو خدا ٹھہرایا تو میں ضرور تجھ کو قید میں داخل کروں گا ۔ فرعون نے کہا کہ کیا ہم نے تجھ کو نہیں پالا جب کہ تو ہم میں بچہ تھا اور کیا تو نے بسر نہیں کیے ہم میں اپنی عمر کے چند سال اور تو نے وہ کام کیا جو کیا اور تو ناشکروں میں ہے موسیٰ نے کہا کہ میں نے کیا تھا

تخاف ورکاء لاتخشی فاتبعھم فرعون بجنودہ فغشیم من الیم ماغشیھم'' پہلی آیت میں تو کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے

(بقیه حاشیه)

اسرائیل (شعرا) فقال له فرعون انی لا ظنک یموسیٰ مسحورا (بنی اسرائیل) قال اولو جئتک بشئی مبین (شعرا) قال ان کنت جئت بایة فات بھا (اعراف) ان کنت من الصادقین فالقی عصاہ فاذا ھی ثعبان مبین و نزع یدہ فاذا ھی بیضاء للناظرین (شعرا) قال موسیٰ یا فرعون انی رسول من رب العالمین حقیق علی ان لا اقول علی الله الا الحق قد جئتکم بینة من ربکم فارسل معی بنی اسرائیل (اعراف) واستکبر ھو و جنودہ فی الارض بغیر الحق وظنو انھم الینا لا یرجعون (ھود) فاستکبرو و کانو قوما عالین (مومنون) مجرمین (یونس) قالوا انومن لبشرین مثلنا و قومھا لنا عابدون (مومن) فظلموا (اعراف) فکذبوا ھما (مومن) فقالو ساحر کذاب (مومن). قال

جب کہ میں گمراھوں میں تھا ۔ پھر میں تم سے ڈرا اور تم میں سے بھاگ گیا پھر خدا نے مجھ کو حکم دیا اور مجھ کو پیغمبروں میں سے کیا اور یہ بھلائی جس کا احسان تو مجھ پر رکھتا ہے اس بناء پر ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے فرعون نے موسیٰ سے کہا کہ میں تجھ کو سحر زدہ سمجھتا ھوں ۔ موسیٰ نے کہا کہ جب بھی اگر میں کوئی بڑی نشانی لاؤں ۔ فرعون نے کہا کہ اگر تو کوئی نشانی لا سکتا ہے تو اس نشانی کو لا اگر تو سچا ہے ۔ پھر موسیٰ نے اپنی لاٹھی ڈال دی پھر یکایک ھو بہو سانپ تھی اور اپنا ھاتھ نکالا پھر یکایک دیکھنے والوں کو چمکتا معلوم ھوتا تھا ۔ موسیٰ نے کہا اے فرعون میں پروردگار عالموں کا رسول ھوں مجھ کو لائق ہے کہ میں خدا پر سوائے سچ کے اور کچھ نہ کہوں میں لایا ھوں تمھارے پاس تمھارے پروردگار کی نشانی پھر میرے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دے پھر فرعون اور اس کے لشکروں نے بغیر کسی حق کے دنیا میں تکبر کیا اور گمان کیا کہ وہ ھمارے پاس نہ پھریں گے پھر انھوں نے تکبر کیا

سمندر کے جدا ہو جانے یا پھٹ جانے کو خلاف قانون قدرت قرار دیا جا سکے ۔ دوسری آیت میں جو الفاظ ہیں آنھی پر تمام مفسرین

(بقیہ حاشیہ)

للملاء حولہ ان ھذا لساحر علیم یریدان یخرجکم من ارضکم بسحرہ فماذا تامرون قالوا ارجہ و اخاہ وابعث (شعرا) و ارسل فی المدائن حاشرین یا توک بکل ساحر علیم (اعراف) قال اجئتنا التخرجنا من ارضنا بسحرک یا موسٰی فلنا تینک بسحر مثلہ فاجعل بیننا و بینک موعد الا نخلفہ نحن ولا انت مکانا سوی قال موعدکم یوم الزنیۃ و ان یحشر الناس ضحی فتولٰی فرعون فجمع کیدہ ثم اتیٰ (طہٰ) قال فرعون ائتونی بکل ساحر علیم (یونس) فجمع السحرۃ لمیقات یوم معلوم و قیل للناس ھل انتم مجتمعون لعلنا تتبع السحرۃ ان کانو ھم الغالبین (شعراء) فلما جاء السحرۃ فرعون قالو ائن لنا لاجرا ان کنا نحن الغالبین قال نعم و انکم اذا لمن المقربین (شعرا)

اور وہ ایک قوم بڑھی ہوئی تھی ۔ گنہ‌گار تھی ۔ بولی کہ کیا ہم ایسے دو شخصوں پر ایمان لاویں جو ہمارے سے ہیں اور ان کی قوم ہماری غلام ہے پھر انہوں نے ظلم کیا ۔ اور ان دونوں کو جٹھلایا اور کہا کہ جھوٹے جادوگر ہیں ۔ فرعون نے اپنے اردو گرد کے درباریوں سے کہا کہ یہ جادوگر بڑا جاننے والا ہے چاہتا ہے کہ تم کو تمہارے ملک سے اپنے جادو سے نکال دے پھر تم کیا کہتے ہو ۔ وہ بولے کہ اس کو اور اس کے بھائی کو مہلت دے اور شہروں میں (جادوگروں کے) اکٹھا کرنے والوں کو بھیج تیرے پاس لے آویں ہر ایک بڑے علم والے جادوگر کو ۔ فرعون کے کہا کہ اے موسٰی کیا تو ہمارے پاس ہم کو ہمارے ملک سے اپنے جادو سے نکالنے کو آیا ہے پھر بے شبہ ہم بھی تیرے پاس ویسا ہی جادو لاویں گے پس کسی چوپٹ میدان میں ہم میں اور اپنے میں (مقابلہ کے لیے) کوئی وقت مقرر کر ۔ نہ ہم اس کے برخلاف کریں اور نہ تو ۔ موسٰی نے کہا کہ جشن کا دن تمہارے وعدے کا سہی اور تھوڑے دن چڑھے سب

کا دار و مدار ھے ۔ وہ ان اضرب بعصاک البحر کے یہ معنی
معنی لیتے ھیں کہ خدا نے موسیٰ سے کہا کہ سمندر کو اپنی لاٹھی

(بقیہ حاشیہ)

فتنازعوا امرھم بینھم و
اسر و النجوی قالوا ان
ھذان لساحر ان یریدان ان
یخرجاکم من ارضکم بسحر
ھما و یذھبا بطر یقتکم
المثلی فاجمعوا کیدکم
ثم ائتوا صفا و قد افلح
الیوم من استعلی (طه)
قالوا یا موسی اما ان
تلقی و اما ان اکون اول
من القی (طه) و اما ان
لکون نحن الملقین فلما
القوا سحروا اعین الناس
استرھبوھم و جاؤا بسحر
عظیم (اعراف) فالقوا حبالھم
و عصیھم و قالوا بعزة
فرعون انا لنحن الغلبون
(شعرا) فاذا حبالھم و عصیھم
یخیل الیه من سحرھم
انھا تسعی (طه) فلما القوا
قال موسی ماجئتم به
السحران الله سیبطله
(یونس) فاوجس فی نفسه
خیفة موسی قلنا لا تخف
انک انت الاعلی (طه) و
اوحینا الی موسی ان القا

آدمی وھاں اکٹھے ھو جاویں پھر فرعون
(اپنے محل میں) گیا اور اپنے جادوگروں
کو جمع کیا ۔ فرعون نے کہا کہ ھر
ایک بڑے جادوگر کو بلاؤ پھر تمام
جادوگر وقت معین پر جمع ھوگئے اور
لوگوں سے کہا کہ کیا تم بھی اکٹھے
ھوگے تاکہ اگر جادوگر غالب آجاویں
تو ھم ان کا ساتھ دیں جب فرعون کے
جادوگر فرعون کے پاس آئے تو انھوں
نے کہا کہ اگر ھم غالب ھوں تو
ھمارے لیے کچھ انعام ھے فرعون نے
کہا کہ ھاں تب تو تم مقربوں میں
سے ھو گے پھر ان کے باھم ان کے
کام میں کچھ جھگڑا ھوا اور انھوں
نے اپنے مشورہ کو چھپایا انھوں نے
کہا کہ بے شبہ یہ دونوں جادوگر
ھیں اور اپنے جادو کے زور سے تم کو
تمھارے ملک نکالنا اور تمھارے عمدہ
مذھب کو کھو دینا چاھتے ھیں پس
اپنے جادوگروں کو جمع کر کے کہا
کہ پھر اکٹھے ھو کر چلو اور آج کے
دن جو غالب ھو گا وھی کامیاب ھو گا
چنانچہ (یوم موعود کو سب جمع ھوئے)
فرعون کے جادوگروں نے موسیٰ سے
کہا کہ یا تو تو پہلے ڈال یا ھم پہلے
ڈالتے ھیں ۔ موسیٰ نے کہا تم ھی ڈالو

سے مار سے مار چنانچہ حضرت موسیٰ نے لاٹھی ماری اور سمندر
ھٹ گیا یا پھٹ گیا یا سمندر کی ته زمین کھل گئی وہ اس جملہ

(بقیه حاشیه)
عصاک فاذا هی تلقف ما یافکون (اعراف) فالقٰی عصاه فاذا هی تلقف ما یافکون (شعرا) ماصنعوا انما صنعوا کید لساحرو لایفلح الساحر حیث اتٰی (طه) فوقع الحق و بطل ما کانوا یعملون فغلبوا هنالک و انقلبوا ساغرین والقی السحرة ساجدین (اعراف) سجدا (طه) قالوا امنا برب العالمین رب موسٰی و هرون قال فرعون آمنتم به قبل ان اذن لکم ان هذا لمکر مکر تموه فی المدینة لتخرجوا منها اهلها فسوف تعلمون (اعراف) انه لکبیر کم الذی علمکم السحر فلا قطعن ایدیکم و ارجلکم من خلاف ولا صلبنکم فی جذوع النخل ولتعلمن اینا اشد و عذابا و ابقی قالوا لن نوثرک علٰی ما جائنا من البینات والذی فطرنا فاقض ما انت قاض

پھر جب انھوں نے ڈالا تو لوگوں کی آنکھوں پر ڈھٹ بند کر دی اور ان کو ڈرا دیا اور بہت بڑا جادوگر لائے ۔ جب انھوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں ڈالیں اور کہا کہ فرعون کی عزت کی قسم ہم ھی غالب ھیں تب تو موسٰی کے خیال میں ان کی رسیاں اور لاٹھیاں ان کے جادو سے چلتی ہوئی لگنے لگیں ۔ موسٰی نے کہا کہ یہ جو تم نے کیا یہ جادو ھے اس کو خدا باطل کر گیا مگر موسٰی دل میں ڈر گیا خدا نے کہا مت ڈر تو ھی جیتے گا اور خدا نے موسٰی کے دل میں ڈالا کہ اپنی لاٹھی ڈال کہ وہ اس سب بناوٹ کو نگل جاوے گی ۔ پھر موسیٰ نے اپنی لاٹھی ڈالی پھر اس سب بناوٹ کو جو انھوں نے کی تھی ، نگلتی تھی ۔ انھوں نے تو جادوگروں کا سا مکر کیا تھا اور حق کے سامنے جادوگر کامیاب نہیں ھو سکتا پس حق ثابت ھو گیا اور جو انھوں نے کیا تھا وہ باطل ھو گیا پھر وھاں ھار کر ذلت سے لوٹ گئے اور فرعون کے جادوگروں نے سجدہ کیا بولے ھم پروردگار عالموں پر ایمان لائے جو موسٰی وھارون کا پروردگار ھے ۔ فرعون

کو اس طرح پر بطور شرط و جزا کے قرار دیتے ہیں کہ شرط گویا علت ہے اور جزا اس کا محلول یعنی لاٹھی مارنے کے سبب سے

(بقیہ حاشیہ)

(طه) وما تنقم منا الا ان آمنا بایات ربنا لما جاء تنا ربنا افرغ علینا صبرا و توفنا مسلمین (اعراف)

نے کہا کہ تم میری اجازت سے پہلے موسیٰ پر ایمان لے آئے بے شبہ یہ مکر ہے جو تم نے اس شہر میں شہر والوں کے نکالنے کو کیا پھر تم جلد اس کا انجام جانو گے ۔ موسیٰ ہی تمہارا گرو ہے جس نے تم کو جادو سکھایا ہے ضرور میں تمہارے ہاتھ ایک طرف کے اور تمہارے پاؤں دوسری طرف کے کاٹوں گا اور تم کو کھجوروں کے درختوں کے تنوں کی سولی پر چڑھا دوں گا اور بلاشبہ تم جانو گے کہ کون سب سے زیادہ عذاب دینے میں سخت ہے اور کس کا عذاب زیادہ پائدار ہے ۔ وہ بولے کہ جو چیزیں علانیہ ہمارے سامنے ہوئی ہیں ان پر اور اس پر جس نے ہم کو پیدا کیا ہے تجھ کو ہم ترجیح نہیں دے سکتے پھر جو تو حکم دینا چاہتا ہے حکم دے تو ہم پر بجز اس کے کہ ہم اپنے پروردگار کی نشانیوں پر ایمان لائے ہیں اور کوئی گناہ نہیں ٹھراتا ۔ اے ہمارے پروردگار جب (یہ مصیبتیں) ہم پر آویں تو ہمارے (دل میں) صبر ڈال دے اور ہم کو مسلمان مار ۔

ولقد اخذنا آل فرعون بالسنین و نقص من الثمرات لعلهم یذکرون فاذا جاءتهم الحسنه قالوا لنا هذه و ان تصبهم سیئه یطیروا موسیٰ و من معه الا انما طائرهم عند الله ولکن اکثرهم لا یعلمون و قالوا مهما تاتنا به من آیة تسحرنا بها فما نحن لک بمومنین فارسلنا علیهم الطوفان والجراد

اور بلاشبہ ہم نے فرعون والوں کو قحطوں میں اور پھلوں کی کم پیداوار میں گرفتار کیا شاید کہ وہ نصیحت پکڑیں اور پھر جب ان کو فراخی ہوتی تھی کو کہتے تھے کہ یہ تو ہمارے لیے ہے ۔ جب ان پر سختی پڑتی تھی تو موسیٰ کی اور اس کے ساتھ کے لوگوں کی نحوست بتلاتے تھے ۔ سمجھو کہ اس کے سوا کوئی بات نہیں کہ جو نحوست اس کے لیے تھی وہ خدا کے پاس سے تھی مگر ان میں بہت سے لوگ نہیں جانتے فرعون والوں

سمندر پھٹ گیا" اور زمین نکل آئی مگر یہ استدلال صحیح نہیں ہے
"انفلق" ماضی کا صیغہ ہے اور عربی زبان کا یہ قاعدہ ہے کہ

(بقیہ حاشیہ)

و القمل والضفادع والدم آیات مفصلات فاستکبروا کانوا قوما مجرمین (اعراف) فلما جاءتھم بآیتنا مبصرۃ قالوا ھذا سحر مبین و حجدوا بھا (نمل) ولقد اریناہ آیاتنا کلھا فکذب و ابیٰ (طہ) فلما جاءھم موسیٰ بایاتنا قالوا ما ھذا الا سحر مفتری وما سمعنا بھذا فی آبائنا الاولین قال موسیٰ ربی اعلم بمن جاء بالھدیٰ من عندہ و من تکون لہ عاقبۃ الدار (قصص) قالوا اجئتنا لتافکنا عما وجدنا علیہ آبائنا و تکون لکما الکبریاء فی الارض وما نحن لکما بمومنین (یونس) قال فرعون یا ایھا الملاء ما علمت لکم من الہ غیری فا و قدلی یا ھامان علی الطین فاجعل لی (قصص) ابن لی (مومن) صرحاً لعلی الطلع الی الہ موسیٰ (قصص) لعلی ابلغ الاسباب باب السموات (مومن) و انی لا

نے موسیٰ سے کہا کہ جو نشانیاں تم لاؤ گے تاکہ ہم پر ان سے جادو کرو تو بھی ہم تجھ پر ایمان نہیں لانے کے پھر ہم نے ان پر طوفان اور ٹڈی دل اور جوئیں اور مینڈک اور خون کا (مینھہ) نازل کیا - جدا جدا نشانیاں - پھر انھوں نے تکبر کیا اور وہ گنہگار قوم تھی - جب ان کے پاس دکھائی دیتی ہوئی ہماری نشانیاں آئیں تو بولے کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے اور ان نشانیوں کا انکار کیا اور البتہ ہم نے فرعون کو اپنی تمام نشانیاں دکھلائیں پھر اس نے جھٹلایا اور انکار کیا اور جب موسیٰ ان کے پاس ہماری نشانیاں لے کر آیا تو بولے کہ یہ تو بجز بتنگڑ بنائے ہوئے جادو کے اور کچھ نہیں ہے اور ہم نے اپنے اگلے پرکھاؤں سے ایسی بات نہیں سنی، موسیٰ نے کہا کہ میرا پروردگار جانتا ہے کہ کون اس کے پاس سے ھدایت لے کر آیا ہے اور کس کے لیے پیچھے کو اس گھر (یعنی عاقبت) کی بھلائی ہو گی - فرعون والے بولے کہ کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہم کو اس بات سے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے ھٹا دے اور تم دونوں کو

جب ماضی جزاء میں واقع ہوتی ہے تو اس کی دو حالتیں ہوتی ہیں
اگر ماضی اپنے معنوں پر نہیں رہتی بلکہ شرط کی معلول ہوتی ہے تو

(بقیہ حاشیہ)

ظنہ من الکذبین (قصص)
وجاء ھم (ای قوم فرعون)
رسول کریم ان ادو الی عباد
اللہ انی لکم رسول آمین و ان
لا تعلوا علی اللہ انی آتیکم
بسلطان مبین و انی عذت
بربی و ربکم ان ترجمون و
ان لم تومنوا لی فاعتزلون
(دخان) فلما جاء ھم الحق
من عندنا قالوا اقتلوا
بناء الذین امنوا معہ
واستحیوا نساء ھم وما
کید الکافرین الا فی ضلل
وقال فرعون ذرونی اقتل موسیٰ
ولیدع ربہ انی اخاف ان یبدل
دینکم او ان یظہر فی الارض
الفساد (مومن) و قال رجل
مومن من آل فرعون یکتم
ایمانہ اتقتلون رجل ان
یقول ربی اللہ وقد جاء کم
بالبینات من ربکم و ان
یک کاذبا فعلیہ کذبہ و
ان یک صادقا یصبکم
بعض الذی یعدکم ان اللہ
لا یھدی ھو مسرف کذاب
یقوم لکم الملک الیوم
ظاھرین فی الارض فمن

دنیا میں بڑائی ھو اور ھم تم دونوں
کو نہیں مانتے ھیں - فرعون نے کہا
کہ اے درباریو میں تمھارے لیے اپنے
سوا کوئی خدا نہیں جانتا پھر اے
ہاماں میرے لیے مٹی کی اینٹیں آگ
میں پکا اور میرے لیے اونچا محل بنا
تاکہ میں موسیٰ کے خدا کے پاس
چڑھ جاؤں اور میں تو اس کو جھوٹوں
میں سمجھتا ھوں اور آیا فرعون کی
قوم کے پاس ایک بزرگ پیغمبر (یعنی
موسیٰ) یہ کہتا ھوا کہ میرے حوالے
کر دو خدا کے بندوں کو بے شک
میں تمھارے لیے خدا کا بھیجا ھوا
امانت دار پیغمبر ھوں اور تم خدا پر
سرکشی مت کرو - میں ضرور تمھارے
سامنے کھلی دلیلیں لاتا ھوں
بے شبہ میں نے اپنے پروردگار اور
تمھارے پروردگار کی اس بات سے کہ
تم مجھ کو سنگ سار کرو پناہ مانگی ھے
اور اگر تم مجھ کو نہیں مانتے تو مجھ
سے جدا ھو جاؤ - پھر جب موسیٰ ان
کے پاس ھمارے پاس سے حق بات لے
کر آیا تو بولے کہ اُن لوگوں کے
بیٹوں کو مار ڈالو جو اس پر ایمان
لائے ھیں اور ان کی عورتوں کو زندہ
رہنے دو حالانکہ کافروں کی مکاری
بہ جز گمراھی کے اور کچھ نہیں اور

اس وقت اس پر 'ف' نہیں لاتے اور جب کہ وہ اپنے معنوں پر باقی رہتی ہے اور جزا کی معلول نہیں تب اس پر 'ف' لاتے ہیں جیسے

(بقیہ حاشیہ)

ینصرنا من باس اللہ ان جاءنا قال فرعون ما اریکم الا ما اری وما اھدیکم الا سبیل الرشاد (مومن) وقال الذی امن یاقوم انی اخاف علیکم مثل یوم الاحزاب مثل داب قوم نوح وعاد وثمودالذین من بعدھم وما اللہ یرید ظلما للعباد یا قوم انی اخاف علیکم یوم التناد یوم تولون مدبرین مالکم من اللہ من عاصم ومن یضلل اللہ فمالہ من ھاد (مومن) ولقد جاءکم یوسف من قبل بالبینات فما زلتم فی شک مما جاءکم بہ حتی اذا اھلک قلتم لن یبعث اللہ من بعدہ رسولا۔ (مومن)

فرعون نے کہا کہ مجھ کو چھوڑ دو (یعنی اجازت دو) کہ میں موسیٰ کو مار ڈالوں اور وہ اپنے پروردگار کو پکارا ہی کرے بلاشبہ مجھے خوف ہے کہ تمھارا دین بدل دے اور ملک میں فساد برپا کرے اور فرعون والوں میں سے ایک مسلمان شخص نے جو اپنے ایمان کو چھپاتا تھا کہا کہ کیا تم ایسے شخص کو مار ڈالو گے جو یہ کہتا ہے کہ میرا پروردگار اللہ ہے اور تمھارے پاس تمھارے پروردگا سے نشانیاں لایا ہے اور اگر وہ جھوٹا ہو تو اس کا جھوٹ اس پر ہے۔ اور اگر وہ سچا ہے تو تم کو بعضی وہ مصیبتیں پہونچیں گی جن کا وہ وعدہ کرتا ہے ہرگز خدا اس شخص کو جو حد سے تجاوز کرنے والا دروغ گو ہو ہدایت نہیں کرتا۔ اے میری قوم آج کے دن تمھارے لیے بادشاہت ہے دنیا پر غلب ہو پھر وہ خدا کے عذاب سے اگر وہ ہم پر آ جاوے کون ہم کو مدد دے گا۔ فرعون نے کہا کہ میں تم کو بہ جز اس کے جو میں دیکھتا یا سمجھتا ہوں اورکچھ نہیں سمجھاتا اور میں تم کو بہ جز راہ راست کے اور کچھ نہیں بتاتا اس شخص نے جو ایمان لے آیا تھا کہا کہ اے میری قوم بے شک میں تم پر ایسے دن کا جو اگلے گروہوں پر گذرا ہے خوف کرتا ہوں جیسے قوم نوح اور عاد اور ثمود اور ان کی جو اس کے بعد ہوئیں حالت ہوئی اور خدا بندوں پر ظلم کرنے کا ارادہ نہیں کرتا اے میری قوم بے شک میں تم پر چل چلاہٹ پڑنے کے دن کا خوف کرتا ہوں اس

کہ اس مثال میں ہے ۔ ''ان اکرمتنی فاکرمتک امس''
یعنی اگر تعظیم کرے گا تو میں تیری تعظیم کل کر چکا ہکا ہوں ۔

(بقیہ حاشیہ)

دن کہ تم اوندھے منہ پیٹھ پھیر کر پھرو گے کوئی تم کو خدا سے بچانے والا نہ ہوگا اور جس کو خدا گمراہ کرتا اس کو کوئی راہ بتانے والا نہیں ہوتا ۔ البتہ تمہارے پاس اس سے پہلے کھلی ہوئی نشانیاں لےکر یوسف آیا تھا پھر تم ہمیشہ اس بات میں جو وہ تمہارے پاس لایا تھا شبہ میں رہے یہاں تک کہ جب وہ مر گیا تو تم نے کہا کہ ہرگز نہیں بھیجنے کا اللہ اس کے بعد کسی پیغمبر کو ۔

و قال فرعون یا ھامان ابن لی صرحا لعلی ابلغ الاسباب اسباب السموات فاطلع الی الہ موسیٰ و انی لا ظنہ کاذبا و کذالک زین لفرعون سوء عملہ وصد عن السبیل وما کید فرعون الا فی تباب ۔ (مومن)

فرعون نے کہا کہ اے ہامان میرے لیے ایک محل بناتا کہ میں رستوں تک آسمانوں کے رستوں تک پہنچ جاؤں پھر موسیٰ کے خدا کے پاس چڑھ جاؤں اور میں تو اس کو جھوٹا سمجھتا ہوں اور اسی طرح فرعون کے لیے اس کے بدعمل بھڑک دار کیے گئے اور سیدھے راستے سے روک دیا گیا تھا اور فرعون کے مکر بجز تباہی کے اور کچھ نہ تھے ۔

ان قارون و کان من قوم موسیٰ فبغی علیھم و آیتناہ من الکنوز ما ان مفاتحہ لتنئو بالعصبۃ اولی القوۃ اذ قال لہ قوم لا تفرح ان‌اللہ لا یحب الفرحین واتبع فیما اتاک اللہ الدار الاخرہ ولا تنس نصیبک من الدنیا و احسن کما احسن اللہ الیک ولا تبغ الفساد

قارون موسیٰ کی قوم میں سے تھا پھر آن سے پھر گیا اور ہم نے اس کو اتنے خزانے دیے تھے کہ اس کی کنجیاں ایک قوی گروہ پر بھاری تھیں ۔ جب اس کی قوم نے اس سے کہا کہ مت اترا کہ خدا اترانے والوں کو دوست نہیں رکھتا اور جو کچھ خدا نے تجھ کو دیا ہے اس میں آخرت کو ڈھونڈ اور اپنے حصہ کو دنیا میں سے مت بھول اور احسان کر جس طرح کہ

اس مثال میں جزاء (یعنی کل میں تعظیم کرنا اور شرط کی مغلول نہیں ہے کیوں کہ داس سے پہلے ہو چکی تھی ۔ اس طرح اس آیت

(بقیہ حاشیہ)

فی الارض ان اللہ لا یحب المفسدین قال انما اوتیتہ علی علم عندی اولم یعلم ان اللہ قد اھلک من قبلہ من القرون من ھو اشد منہ قوۃ و اکثر جمعا ولا یسل عن ذنوبھم المجرمون فخرج علی قومہ فی زینۃ قال الذین یریدون الحیوۃ الدنیا یا لیت لنا مثل ما اوتی قارون انہ' لذواحظ عظیم وقال الذین اوتوا العلم ویلکم ثواب اللہ خیر لمن آمن و عمل صالحاً ولا یلقاھا الا الصابرون فخسفنا بہ و بدارہ الارض فما کان لہ من فئۃ ینصرونہ من دون اللہ وما کان من المنتصرین و اصبح الذین تمنوا بامکانہ باالامس یقولون و یکان اللہ یبسط الرزق لمن یشاء من عبادہ و یقدر لہ لولا ان من اللہ علینا لخشف بنا ویکانہ لایفلح الکافرون ۔ (قصص)

خدا نے تجھ پر احسان کیا ہے اور دنیا میں فساد مت مچا کہ اللہ تعالیٰ مفسدوں کو دوست نہیں رکھتا ۔ اس نے کہا کہ مجھ کو یہ دولت صرف میری دانائی کے سبب دی گئی ہے ۔ کیا وہ یہ نہ سمجھا کہ بے شبہ خدا نے کسی زمانہ میں اس سے پہلے ان کو ہلاک کر دیا جو اس سے بھی زیادہ قوی اور زیادہ دولت والے تھے اور کیا گنہگار اپنے گناہوں پر پوچھے نہ جاویں گے پھر قارون اپنی قوم کے سامنے تجمل سے نکلا جو لوگ دنیا ہی کی زندگی چاہتے تھے انھوں نے کہا کہ کاش ہمارے پاس بھی وہ کچھ ہوتا جو قارون کو دیا گیا ہے ۔ بے شک وہی بڑا صاحب نصیب ہے اور جن لوگوں کو دانش دی گئی تھی انھوں نے کہا کہ افسوس تم پر، خدا کا ثواب ان کے لیے جو ایمان لائے ہیں اور اچھے کام کیے ہیں بہت اچھا ہے اور وہ بجز صبر کرنے والوں کے اور کسی کو نہیں ملتا ۔ پھر ہم نے قارون کو اس کے گھر سمیت زمین میں دھنسا دیا پھر کوئی گروہ خدا کے سوا نہ اس کے لیے تھے نہ جو اس کی مدد کرے اور نہ وہ اپنے آپ

میں سمندر کا پھٹ جانا یا زمین کا کھل جانا حزب کا معلوم نہیں
ہو سکتا ۔

(بقیہ حاشیہ)

مدد کر سکتا تھا اور جن لوگوں نے کل اس کے مرتبہ کی تمنا کی تھی اُنھوں
نے یہ کہتے ہوئے صبح کی او ھو ، اللہ اپنے بندوں میں سے جس کے لیے
چاھتا ھے رزق کو فراخ کرتا ھے اور جس کے لیے چاھتا ھے تنگ کرتا ھے
اگر خدا ھم پر احسان نہ کرتا تو ھم کو بھی دھنسا دیتا ، اوھو وہ نہیں
فلاح پہونچاتا کافروں کو ۔

و نادیٰ فرعون فی قومہ
قال یقوم الیس لی ملک
مصر و ھذا الانھار و تجری
من تحتی افلا تبصرون
ام انا خیر من ھذا الذی
ھو مھین ولا یکاد یبین فلولا
القی علیہ اسورۃ من ذھب
او جاء معہ الملائکۃ
مقترنین (زحرف) ولما وقع
علیھم الرجز قالوا یا
موسیٰ ادع لنا ربک بما
عھد عندک لئن کشفت
عنا الرجز المومنین
و لنرسلن معک بنی اسرائیل
فلما کشفنا عنھم الرجز
الی اجل ھم بالغوہ اداھم
ینکثون (اعراف) و اخذنا
ھم بالعذاب لعلھم یرجعون
و قالوا یایھا الساحر ادع
لنا ربک بما عھد عندک
اننا لمھتدون ۔ (زخرف)

اور فرعون نے اپنے لوگوں میں
پکار کر کہا کہ اے لوگو کیا میرے
پاس مصر کا ملک نہیں ھے اور یہ نہریں
جو میرے ملک کے نیچے بہتی ھیں پھر
کیا تم نہیں دیکھتے ھو آیا میں اچھا
ھوں اُس شخص سے جو ذلیل ھے
اور نہیں بیان کر سکتا کہ کیوں نہ اس
پر ڈالے گئے سونے کے کنگن اور کیوں
نہ اس کے ساتھ فرشتے رہنے کو آئے
اور جب فرعون والوں کو آفت پڑی تو
بولے اے موسیٰ ھمارے لیے اپنے پروردگار
سے جس طرح اس نے تجھ کو بتایا ھے
دعا مانگ اگر ھم پر سے آفت جاتی
رھے تو تجھ پر ضرور ایمان لاویں گے
اور تیرے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج
دیں گے پھر جب ھم نے ان پر سے ایک
مدت تک آفت کو دور کردیا جس آفت
تک وہ پہنچنے کو تھے تو وہ پھر گئے اور
ھم نے ان کو عذاب میں گرفتار کیا
کہ شاید وہ (بد راہ سے) پھر جاویں ۔
فرعون والوں نے کہا کہ اے جادوگر
ھمارے لیے اپنے پروردگار سے جس طرح

اصل یہ ہے کہ یہودی اس بات کے قائل تھے کہ حضرت موسیٰ کی لاٹھی مارنے سے سمندر پھٹ گیا تھا اور زمین نکل آئی تھی اور

(بقیہ حاشیہ)
کہ اس نے تجھ کو بتایا ہے دعا مانگ بے شک ہم ھدایت پا گئے ھیں ۔

قال موسیٰ ربنا انک آتیت فرعون و ملائہ زینة و اموالا فی الحیوة الدنیا ربنا لیضلوا عن سبیلک ربنا اطمس علی اموالھم و اشدوا علی قلوبھم فلا یومنوا حتی یرو العذاب الالیم قال قد اجیبت دعوتکما فاستقیما ولا تتبعان سبیل الذین لا یعلمون (یونس) قال موسیٰ لقومہ استعینوا باللہ واصبروا ان الارض للہ یورثھا من یشاء من عبادہ والعاقبة المتقین قالوا اوذینا من قبل ان تاتینا و من بعد ما جئتنا قال عیسیٰ ربکم ان یھلک عدوکم و یستخلفکم فی الارض فینظر کیف تعلمون ۔ (اعراف)

موسیٰ نے کہا اے ھمارے پروردگار تو نے فرعون کو اور اس کے درباریوں کو تجمل اور دولت دنیا کی زندگی میں دی ھے اور ھمارے پروردگار کیا اس نے کہ تیرے رستہ سے گمراہ کریں ۔ اے پروردگار ھمارے ستیاناسی ڈال ان کے مالوں پر اور سختی ڈال ان کے دلوں پر پھر وہ نہیں ایمان لانے کے جب تک کہ دکھ دینے والا عذاب نہ دیکھیں گے خدا نے کہا کہ تم دونوں کی دعا قبول کی گئی پھر مستقل رھو اور ان کی راہ مت چلو جو نہیں جانتے ۔ موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا خدا سے مدد مانگو اور صبر کرو بے شک یہ زمین خدا کی ھے اس کو اپنے بندوں میں سے جس کو چاھتا ھے دیتا ھے اور آخر کو بھلائی پرھیزگاروں کے لیے ھے انھوں نے کہا کہ ھمیں تو تیرے آنے سے پہلے اور تیرے آنے کے بعد اذیت ھی دی گئی ھے ۔ موسیٰ نے کہا کہ قریب ھے تمھارے دشمن کو خدا ھلاک کرے گا اور عنقریب تم کو زمین پر خلیفہ کر دے گا پھر دیکھے گا کہ تم کس طرح کرو گے ۔

ولقد اوحینا الیٰ موسیٰ ان اسر بعبادی فاضرب لھم طریقا فی البحر یبسا لاتخاف درکا ولا تخشیٰ (طہ)

ھم نے موسیٰ پر وحی کی کہ رات کو لے چل میرے بندوں کو ان کے لیے سمندر کے سوکھے رستہ میں مت خوف کر پکڑ لیے جانے سے اور نہ کسی

لاٹھی مارنے سے پتھر میں سے پانی بہہ نکلا تھا - علمائے اسلام سے تفسیروں میں اور خصوصاً بنی اسرائیل کے قصوں میں یہودیوں کی

(بقیہ حاشیہ)

فاسر بعبادی لیلا انکم متبعون و اترک البحر رھو انھم جند مغرقون (دخان) ان اضرب بعصاک البحر فانفلق فکان کل فوق کالطود العظیم (شعرا) و اذ فرقنا بکم البحر فانجینکم و اغرقنا آل فرعون و انتم تنظرون (بقر) فاتبعوھم مشرقین فلما تراء الجمعان قال اصحاب موسیٰ انا مدرکون قال کلا ان معی ربی سیھدین (شعرا) فاتبعھم فرعون بجنودہ فغشیھم من الیم ماغشیھم و اضل فرعون قومہ وما ھدی (طہ) و از لفنا ثم الاخرین و انجینا موسیٰ و من معہ اجمعین ثم اغرقنا الاخرین (شعرا) فانتقمنا منھم فاغرقناھم فی الیم بانھم کذبوا بایاتنا

طرح کا ، ڈر کر لے چل میرے بندوں کو رات کو تم (دشمن سے) تعاقب کیے جاؤ گے اور چھوڑ چل سمندرکو ایسی حالت میں کہ اترا[1] ہوا ہے بے شک فرعون کے لوگ ایک لشکر ہے کہ ڈبویا جاوے گا چل اپنی لاٹھی کے سہارے سے سمندر میں کہ وہ پھٹا ہوا ہے پھر تھا ہر ایک ٹکڑا بڑے پہاڑ کی مانند اور جب کہ ہم نے تمہارے سبب سے سمندر کو جدا کر دیا پھر ہم نے تم کو بچایا اور ہم نے فرعون والوں کو ڈبو دیا اور تم دیکھتے تھے - پھر سورج کے نکلتے ہی فرعون والوں نے بنی اسرائیل کا پیچھا کیا پھر جب دونوں گروہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو موسیٰ کے لوگوں نے کہا کہ اب ہم پکڑے گئے موسیٰ نے کہا ہر گز نہیں بیشک میرے ساتھ میرا خدا ہے جو ٹھیک رستہ بتا دے گا پھر فرعون نے اپنے لشکر سمیت ان کا پیچھا کیا پھر ڈھانک دیا ان کو سمندر میں سے

۱- ”رھوا“ کا ترجمہ شاہ عبدالقادر صاحب نے ”تھم“ کیا ہے اور شاہ رفیع الدین صاحب نے ”خشک“ کیا ہے اور شاہ ولی اللہ صاحب نے ”ارمیدہ“ اور قاموس میں اس کے معنی لکھے ہیں ”المرتفع والمخفض ضد والسکون“۔

پیروی کرنے کے عادی تھے اور قرآن و مجید کے مطالب خواہ نخواہ کھینچ تان کر یہودیوں کی روائتوں کے موافق کرتے تھے اس نے

(بقیہ حاشیہ)

و کانوا عنہا غافلین فاخذناہ و جنودہ فنبذناھم فی الیم (قصص) فارادان یستفرھم من الارض فاغرقناہ ومن معہ جمیعاً و قلنا من بعدہ لبنی اسرائیل اسکنو الارض فاذا جاء وعد الاخرۃ جئنابکم لفینا ۔ (بنی اسرائیل)

جس نے ان کو ڈھانک لیا اور غلط راہ پر لے گیا فرعون نے اپنی قوم کو اور ٹھیک رستہ نہ بتایا اور ہم نے پچھلوں کو قریب کر دیا اور ہم نے موسیٰ کو اور جو اس کے ساتھ تھے سب کو بچا دیا پھر ہم نے پچھلوں کو ڈبو دیا پھر ہم نے بدلا لیا ان سے اور ہم نے ان کو سمندر میں ڈبو دیا اس لیے کہ بے شبہ انھوں نے ہماری نشانیوں کو جٹھلا دیا تھا اور اس سے غافل تھے پھر پکڑا ہم نے فرعون کو اور اس کے لشکر کو اور ان کو ہم نے سمندر میں ڈال دیا ۔ فرعون چاھتا تھا کہ ان کو زمین سے نکال دے پھر ہم نے اس کو ڈبو دیا اور سب کو جو اس کے ساتھ تھے اور اس کے بعد ہم نے بنی اسرائیل کو کہا کہ رہو اس زمین پھر جب آوے گا آخرت کا وعدہ تو ہم تم کو لائیں گے ملوان ۔

و ظللنا علیکم الغمام وانزلنا علیکم المن والسلوی کلو من طیبات ما رزقناکم وما ظلمونا ولکن کانو انفسھم یظلمون (بقر) ونزلنا علیکم المن والسلوی کلوا من طیبات مارزقنکم ولا تطغو فیہ فیحل علیکم غضبی و من یحلل علیہ غضبی فقد ھوی (طہ) وقطعنا ھم اثنتی عشرۃ اسباطا امما و اوحینا الی موسیٰ اذا استسقاہ

ہم نے تم پر چھاؤں کی ابر کی اور تم پر من و سلوی اتارا کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو ہم نے تم کو دیں اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا ۔ مگر انھوں نے آپ اپنے اوپر ظلم کیا تھا اور ہم نے تم پر من و سلوے اتارا کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو ہم نے تم کو دی ھیں اور اس میں زیادتی مت کرو تاکہ میرا غصہ تم پر نازل نہ ہو اور جس پر میرا غصہ نازل ہوا وہ ھلاک ہوا اور جدا کر دیے ہم نے بنی اسرائیل کے اسباط کے بارہ گروہ اور ہم نے موسیٰ پر وحی کی جب کہ اس کی قوم نے

انھوں نے اس جگه بھی اور وھاں بھی جہاں قرآن میں آیا ھے
فاضرب بعصاک الحجر فانفجرت منه اثنا اعشرة

(بتیه حاشیه)

قومه ان اضرب بعصاک الحجر فانبجست (اعراف) فانفجرت منه اثنتا عشره عینا قد علم کل اناس مشربھم کلوا واشربوا من رزق الله ولا تعصوا فی الارض مفسدین (بقر) و اذ قتلتم یا موسیٰ لن نصبر علی طعام واحد فادع لنا ربک یخرج لنا مما تنبت الارض من بقلھا و قثاءھا و فومھا و عدسھا و بصلھا قال اتستبدلون الذی ھو ادنی بالذی ھو خیرا ھبطوا مصر افان لکم ما سالتم -

پانی مانگا که چل اپنی لاٹھی کے سہارے اس چٹان پر اس سے بہتے ھیں پھوٹ نکلے ھیں بارہ چشمے - ان میں ھر ایک نے اپنا گھاٹ جان لیا کھاؤ اور پیو خدا کے رزق سے اور زمین پر مفسد ھوکر نافرمانی مت کرو جب تم نے کہاکه اے موسیٰ ھم ایک کھانے پر صبر نہیں کر سکتے پھر اپنے پروردگار سے دعا مانگ که ھمارے لیے وہ چیزیں نکالے جو زمین اگاتی ھے - ترکاری اور ککڑی اورگیہوں اور مسور اور پیاز اور لہسن موسیٰ نے کہا تم بدلنا چاھتے ھو برے کو بھلے سے جا اترو شہر میں که تم کو ملے گا جو تم مانگتے ھو - (بقر)

وجاوزنا ببنی اسرائیل البحر فاتو علی قوم یعکفون علی اصنام لھم قالوا یا موسی اجعل لنا الھا کما لھم الھة قال انکم قوم تجھلون ان ھولاء متبر ماھم فیه و باطل ما کانوا یعملون (اعراف) او اذ قلنا ادخلو ھذه

اور ھم بنی اسرائیل کو دریا سے نکال لے گئے پھر وہ ایک ایسی قوم کے پاس آئے جو اپنےبتوں کی سیوا کرتے تھے بنی اسرائیل نےکہاکه اے موسیٰ ھمارے لیے بھی ایسے معبود بنا جیسے ان کے معبود ھیں موسیٰ نے کہا که بے شک تم جاھل قوم ھو یه خراب حالت ھے جس میں یه لوگ ھیں اور غلط ھے جو یه کرتے ھیں اور جب

عینا ضرب کے معنی زدن کے لیے اور سیدھے سادھے معجزہ کو ایک معجزہ خارج از قانون قدرت بنا دیا ۔

(بقیہ حاشیہ)

القریہ فکلو منہا حیث شئتم رغداً و ادخلو الباب سجدوا قولو حطۃ نغفرلکم خطایا کم و سنزید المحسنین فبدل الذین ظلموا قولا غیر الذی قیل لہم فارسلنا علیہم رجزا من السماء بما کانوا یفسقون (بقر) یظلمون (اعراف) ولما جاء موسیٰ لمیقا تنا و کلمہ ربہ قال رب ارنی انظر الیک قال لن ترانی و لکن انظر الی الجبل فان استقر مکانہ فسوف ترانی فلما تجلی ربہ للجبل جعلہ دکا و خر موسیٰ صعقا فلما افاق قال سبحانک تبت الیک و انا اول المومنین قال یموسیٰ انی اصطفیتک علی الناس برسالاتی و بکلامی فخذ ما اتیتک وکن من الشاکرین (اعراف) واذ قلتم یا موسیٰ لن نومن لک حتی نری اللہ جہرۃ (بقر) و اختار موسی قومہ سبعین رجلا لمیقاتنا (اعراف) فاخذتکم الصعقۃ

ہم نے تم سے کہا کہ داخل ہو اس شہر میں پھر کھاؤ اس میں سے جو چاہو پیٹ بھر کر اور داخل ہو دروازوں میں سجدہ کرتے ہوئے اورکہو کہ ہم معافی چاہتے ہیں بخش دیں گے ہم تمہاری سب خطائیں اور نیکی کرنے والوں کو زیادہ دیں گے پھر ظالموں نے بات بدل دی اُس کے سوا جو اُن سے کہی گئی تھی پھر ہم نے ان کی بدکاری کے سبب اُن پر آسمان سے آفت بھیجی اور جب موسیٰ ہمارے وقت مقررہ پر آیا اور اس کے پروردگار نے اُس سے بات کی تو اس نے کہا کہ تو مجھکو اپنےتئیں دکھا دے تاکہ میں تجھ کو دیکھوں خدا نے کہا کہ تو مجھ کو ہرگز نہیں دیکھ سکتا لیکن تو اس پہاڑ کو دیکھ پھر اگر یہ پہاڑ اپنی جگہ ٹھہرا رہا تو تو مجھ کو دیکھ سکے گا پھر جب اس کے پروردگار نے پہاڑ پر تجلی کی تو اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گرا پھر جب ہوش میں آیا تو کہا کہ تو پاک ہے اے اللہ میں توبہ کرتا ہوں تیرے سامنے اور میں پہلا ایمان لانے والا ہوں ۔ خدا نے کہا اے موسیٰ میں

اس مقام پر حزب کے معنی زدن کے نہیں ہیں بلکہ چلنے کے یا جلد چلنے کے ہیں جیسے کہ عرب بولتے ہیں ''حزب فی الارض''

(بقیہ حاشیہ)

وانتم تنظرون ثم بعثنکم من بعد موتکم لعلکم تشکرون (بقر) فلما اخذتھم الرجفه قال رب لو شئت اھلکتھم من قبل و ایای (اعراف) و ان اخذنا میثاقکم ورفعنا فوقکم الطور خذ و اما اتینکم بقوه و اذکروا ما فیه لعلکم تتقون (بقر) و اذنتقنا الجبل فوقھم کانه ظلة وظنوا انه واقع بھم خذوا وما اتیناکم بقوة (اعراف) وما اعجلک عن قومک یا موسیٰ قال ھم آولاء علی اثری و عجلت الیک رب لترضی (طه) و واعدنا موسیٰ ثلثین لیله و اتممنھا بعشرفتم میقات ربه اربعین لیلة و قال موسیٰ لاخیه ھارون اخلفنی فی قومی و اصلح ولا تتبع سبیل المفسدین (اعراف) واتخذ قوم موسیٰ من بعده من حلیھم عجلا جسد اله خوار (اعراف) قال فانا قد فتنا قومک من بعدک و اضلھم السامری (طه)

نے تجھ کو اور لوگوں پر اپنا رسول کرنے اور خود کلام کرنے سے برگزیدہ کیا ہے پھر جو میں تجھ کو دیتا ہوں اس کو لے اور شکر کرنے والوں میں ہو اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم تجھ پر ایمان نہ لاویں گے جب تک کہ علانیہ خدا کو نہ دیکھیں اور موسیٰ نے ہمارے وقت مقررہ پر حاضر ہونے کے لیے اپنی قوم میں سے ستر آدمی چھانٹے پھر تم کو بجلی کی کڑک نے پکڑ لیا اور یہ سب باتیں تم دیکھتے تھے پھر ہم نے تم کو تمھارے مر جانے (بیہوش ہو جانے) کے بعد اٹھایا کہ شاید تم شکر کرو - پھر جب اُن کو کپ کپاھٹ نے پکڑا تو موسیٰ نے کہا اے پروردگار اگر تو چاھتا تو اس سے پہلے ھی ان کو اور مجھ کو بھی مار ڈالتا اور جب ہم نے تم سے قول لیا اور ہم نے تمھارے اوپر پہاڑ کو بلند کیا کہ مضبوط پکڑو جو کچھ ہم نے تم کو دیا ہے اور یاد رکھو جو کچھ اس میں ہے شاید کہ تم بچ جاؤ اور جب ہم نے ان پر پہاڑ کو اٹھایا گویا کہ وہ سائبان تھا اور انھوں نے گمان کیا کہ وہ ان پر گرے گا

چلایا دوڑا زمین پر خود قرآن مجید میں آیا ہے - و اذا آخر یتھم فی الارض فلیس علیکم جناح ان تقصرو من الصلوۃ

(بقیہ حاشیہ)

فاخرج لھم عجلا جسداله خوار فقالو ھذا الھکموالہ موسیٰ فنسی افلا یرون ان لا یرجع الیھم قولا ولا یملک لھم ضروا ولا نفعا ولقد قال لھم ھارون من قبل یاقوم انما فتنتم به وان ربکم الرحمان فاتبونی واطیعو امری قالو الن نبرح علیه عاکفین حتیٰ یرجع الینا موسیٰ (طه) فرجع موسیٰ الی قومه غضبان اسفا (طه) قال موسیٰ لقومه یا قوم انکم ظلمتم انفسکم باتخاذکم العجل فتوبوا الیٰ بارئکم فاقتلوا انفسکم ذالکم خیرلکم عند بارئکم (بقر) ان الذین اتخذو العجل سینالھم غضب من ربھم و ذلة فی الحیوۃ الدنیا (اعراف)

مضبوطی سے پکڑو جو ہم نے تم کو دیا ہے - ہم نے موسیٰ سے کہا کہ کیوں تو جلدی کر کے چلا آیا اپنی قوم کے پاس سے کہا وہ بھی میرے پیچھے ہیں اور میں تیرے پاس جلدی چلا آیا ہوں تا کہ اے پروردگار تو راضی ہو اور وعدہ کیا ہم نے موسیٰ سے تیس رات کا اور ہم نے پورا کیا اس کو دس سے پھر تمام ہو گئی میعاد اس کے پروردگار کی چالیس رات اور موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا کہ میری قوم میں میرا خلیفہ ہو اور اصلاح کر اور مفسدوں کے طریق کی پیروی مت کر - موسیٰ کی قوم نے اس کے بعد اپنے زیور سے ایک بچھڑے کا پتلا بتایا جس میں سے آواز نکلتی تھی خدا نے موسیٰ سے کہا کہ ہم نے تیرے بعد تیری قوم کو فتنہ میں ڈالا اور سامری نے ان کو گمراہ کر دیا - پھر سامری نے ان کے لیے بچھڑے کا پتلا بنایا جس میں آواز نکلتی تھی پھر وہ بولے کہ یہ ہے ہمارا خدا اور موسیٰ کا خدا تو بھول گیا کیا وہ نہیں دیکھتے کہ وہ ان کی بات کا آلٹ کر جواب نہیں دیتا اور نہ آن کے لیے ضرر اور نہ نفع پہنچانے کا مالک ہے اور پہلے ہی ہارون نے آن سے کہا تھا کہ اے قوم اس کے سوا کچھ نہیں کہ تم اس سے فتنہ میں ڈالے گئے ہو اور بے شک تمہارا پروردگار رحم والا ہے - میری پیروی کرو اور میرے حکم کی اطاعت کرو انھوں نے کہا

(نساء) یعنی جب تم چلو زمین پر یعنی سفر کرو تو کچھ حرج نہیں ہے ۔ کہ نماز میں کمی کرو ، پس صاف معنی یہ ہیں کہ خدا

(بقیہ حاشیہ)

کہ ہم اس کی سیوا کیا کریں گے جب تک کہ موسیٰ لوٹ کر نہ آوے پھر موسیٰ اپنی قوم کے پاس لوٹ کر آیا غصہ میں بھرا ہوا افسوس کرتا ہوا موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ تم نے اس بچھڑے کے بنانے میں اپنی جانوں پر ظلم کیا توبہ کرو اللہ کے سامنے اور مار ڈالو اپنی جانوں کو کہ یہی تمہارے حق میں تمہارے خدا کے نزدیک بہتر ہے جن لوگوں نے بچھڑا بنایا قریب ہے کہ ان کے پروردگار کا غصہ ان تک پہنچے گا اور ذلت دنیا کی اس زندگی میں ۔

قال یاقوم الم یعدکم ربکم وعد احسنا افطال علیکم العھد ام اردتم ان یحل علیکم غضب من ربکم فاخلفتم موعدی (طہ) قال بئسما خلفتمونی من بعدی اعجلتم امر ربکم و القی الالواح و اخذ براس اخیہ یجرہ الیہ قال ابن ام ان القوم استضعفونی و کادوا یقتلوننی فلا تشمت بی الاعداء ولا تجعلنی مع القوم الظالمین (اعراف) انی خشیت ان تقول فرقت بین بنی اسرائیل ولم ترقب قولی (طہ) قالو ما اخلفنا موعدک بملکنا ولکنا حملنا اوزارا من زینۃ القوم فقذ فناھا فکذالک القی

موسیٰ نے کہا اے قوم میری کیا تم سے خدا نے وعدہ نہیں کیا تھا اچھا وعدہ اور کیا ایک لمبا زمانہ تم پر گذر گیا تھا بلکہ تم نے چاہا کہ تم پر تمہارے پروردگار کا غصہ اترے اس لیے تم نے میرے وعدے کے برخلاف کیا موسیٰ نے کہا کہ بہت برا کیا تم نے میرے بعد کیا جلدی کی تم نے اپنے پروردگار کے حکم میں اور پھینک دیا الواح توریت کو اپنے بھائی کے سر کے بال پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اس نے کہا کہ اے میرے ماں جائے ان لوگوں نے مجھ کو کمزور جانا تھا اور مجھ کو مارے ڈالتے تھے پھر میرے دشمنوں کو مت خوش کرو اور مت کرو مجھ کو ان ظالموں کے ساتھ ۔ مجھ کو یہ ڈر تھا کہ تو یہ کہے گا تو نے تفریق ڈال دی بنی اسرائیل میں اور نہ انتظار کیا تو

نے حضرت موسیٰ کو کہا کہ ''اپنی لاٹھی کے سہارے سے سمندر میں چل وہ پھٹا ہوا یا کھلا ہوا ہے یعنی پایاب ہو رہا ہے''

(بقیه حاشیه)

انسامری (طه) قال فما خطبک یا سامری قال بصرت بمالم یبصروا به فقبضت قبضة من اثر الرسول فنبذتها وکذالک سعلت فی نفسی قال فاذهب فان لک فی الحیواة ان تقول لامساس ۔ (طه)

نے میری بات کا انھوں نے کہا ہم نے تو اپنے اختیار سے تیرے وعدے کے خلاف نہیں کیا بلکه هم قوم (قبطی) کے زیور کا بوجھ اٹھا رہے تھے پھر هم نے اس کو پھینک دیا اور اسی طرح پھینک دیا سامری نے ۔ پھر سامری نے بچھڑے کی مورت بنائی جس میں سے آواز نکلتی تھی۔ موسیٰ نے کہا اے سامری تیرا کیا حال ہے اس نے کہا مجھے وہ بات سمجھائی جو ان کو نہیں سجھائی پھر میں نے پیغمبروں کے پانوں تلے کے نشان کی مٹی لی پھر میں نے بچھڑے میں ڈال دی اور اسی طرح کرنا میرے دل نے مجھے اچھا بتایا موسیٰ نے کہا کہ دور ہو تجھ کو اس دنیا میں یہی سزا ہے کہ تو کہتا رہے گا کہ میرے پاس مت آؤ ۔

فلما سکت عن موسی الغضب اخذ الالواح وفی نسختها هدی ورحمة للذین هم یرهبون (اعراف) ثم آتینا موسی الکتاب تماماً علی الذی احسن و تفصیلا لکل شئی وهدی و رحمة لعلهم بلقاء ربهم یومنون (انعام)

پھر جب موسیٰ کا غصه تھا تو اس نے الواح کو اٹھا لیا اور اس میں آن کے لیے هدایت اور رحمت تھی جو ڈرتے ھیں ۔ پھر هم نے موسیٰ کو کتاب دی جو لوگ نیکی کرنے والے ھیں آن پر نعمت پوری کرنے کو اور هر چیز کی تفصیل بتانے کو اور هدایت اور رحمت کرنے کو کہ شاید وہ اپنے پروردگار سے ملنے پر ایمان لاویں ۔

و اذ اخذنا میثاق بنی اسرائیل وبعثنا منهم اثنا عشر نقیبا و قال الله انی معکم لان اقمتم الصلوة

اور جب هم نے بنی اسرائیل سے وعدہ لیا اور آن میں سے بارہ سردار کھڑے کیے اور خدا نے کہا کہ میں تمھارے ساتھ ہوں اگر تم قائم

سورہ طہ میں جو آیت ہے اس میں صاف بیان ہوا ہے کہ میرے بندوں کو رات کو سمندر میں سوکھے رستے سے لے کر نکل چل پس جو

(بقیہ حاشیہ)

و اتیتم الزکوۃ و آمنتم برسولی و عزرتموھم و اقرضتم اللہ قرضاً حسنا ۔ (مائدہ)

کرتے رہو گے نماز اور تم دیتے رہو گے زکوۃ اور تم ایمان لاتے رہو گے میرے رسولوں پر اور تم مدد کرتے رہو گے ان کی اور تم قرض دیتے رہو گے اللہ کو قرض حسنہ ۔

اذ قال موسیٰ لقومہ ان اللہ یامرکم ان تذبحوا بقرۃ قالوا اتتخذنا ھزوا قال اعوذ باللہ ان اکون من الجاھلین قالوا ادع لنا ربک یبین لنا ماھی قال انہ یقول انھا بقرہ لا فارض ولا بکر عوان بین ذالک فافعلو ما تو مرون قالوا ادع لنا ربک یبین لنا مالونھا قال انہ یقول انھا بقرہ صفرا فاقع لونھا تسر الناظرین قالوا ادع لنا ربک یبین لنا ماھی ان البقر تشابہ علینا و انا ان شاء اللہ لمھتدون قال انہ یقول انھا بقرۃ لا ذلول تثیر الارض ولا تسقی الحرث مسلمۃ لاشیہ فیھا قالوا الان جئت بالحق فذبحوھا وما کادوا یفعلون (بقر)

جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ خدا تم کو یہ حکم کرتا ہے کہ ذبح کرو بیل کو انھوں نے کہا کہ کیا تو ہم سے ھنسی کرتا ہے موسیٰ نے کہا کہ میں تو اللہ سے پناہ مانگتا ھوں جاھل قوم سے انھوں نے کہا کہ اپنے پروردگار سے پوچھ کہ ہم کو بتلاوے کہ وہ کیسا بیل ھو کہا کہ وہ بیل نہ بوڑھا ھو اور نہ بچہ میانہ سال ان دونوں کے بیچ میں کرو جو تم کو حکم دیا جاتا ہے ۔ انھوں نے کہا کہ ھمارے لیے اپنے پروردگار سے پوچھ کہ بتلاوے کیا ھو اس کا رنگ موسیٰ نے کہا کہ خدا کہتا ہے کہ وہ بیل ڈھڈھاتے زرد رنگ کا ھو اس کا رنگ خوش کرتا ھو دیکھنے والوں کو انھوں نے کہا کہ پوچھ ھمارے لیے اپنے پروردگار سے کہ بتلاوے وہ کیسا ہے کہ ھم پر بیل مشتبہ ھو گئے ھیں اور اگر خدا نے چاھا تو ھم ھدایت پاویں گے ۔

معجزہ تھا وہ یہی تھا کہ ایسے مشکل کے وقت میں سمندر کے پایاب ہونے سے خدا تعالیٰ نے موسیٰ کو اور تمام بنی اسرائیل کو

(بقیہ حاشیہ)

یاقوم ادخلو الارض المقدسۃ التی کتب اللہ لکم ولا ترتدوا علی ادبارکم فتنقلبوا خسرین قالوا یا موسیٰ ان فیھا قوما جبارین وانا لن ندخلھا حتی یخرجوا منھا فان یخرجوا منھا فانا داخلون قال رجلان من الذین یخافون انعم اللہ علیھما ادخلوا علیھم الباب فاذا دخلتموہ فانکم غالبون و علی اللہ فتوکلوا ان کنتم مومنین قالوا یا موسیٰ انالن ندخلھا ابدا ماداموا فیھا فاذھب انت و ربک فقاتلا انا ھھنا قاعدون قال رب انی لا املک الا نفسی و اخی فافرق بیننا و بین القوم الفاسقین قال فانھا محرمۃ علیھم اربعین سنۃ یتیھون فی الارض فلا تاس علی القوم الفاسقین ۔ (مائدہ)

موسیٰ نے کہا کہ خدا کہتا ہے کہ وہ ایسا بیل ہو جو نہ جوتا ہو کہ زمیں کو پھاڑے یا کھیتی کو پانی دے اس کے تمام اعضا مسلم ہوں اور اس میں کوئی دھبہ نہ ہو انھوں نے کہا اب تو نے ٹھیک بات بتائی پھر انھوں نے ذبح کیا اور کرتے نہیں لگتے تھے اے لوگو تم اس پاک زمین میں داخل ہو جو خدا نے تمھارے لیے لکھ دی ہے اور مت پھرو اپنے پیٹ کے بل پیچھے پھرو پلٹو گے نقصان اٹھانے والے انھوں نے کہا اے موسیٰ اس میں تو بہت زبردست قوم رہتی ہے ہم ھرگز اس میں نہیں جائیں گے جب تک کہ وہ اس میں سے نہ نکل جاویں جب وہ اس زمین سے نکل جاویں گے تب ہم اس میں داخل ہوں گے ان میں سے دو آدمیوں نے کہا کہ جو خدا سے ڈرتے تھے جن پر خدا نے نعمت کی تھی کہ اے لوگو جا گھسو اس قوم کے دروازہ میں جب تم جا گھسو گے تم ہی غالب ہو گے اور خدا ہی پر بھروسہ کرو اگر تم ایمان لانے والے ہو ۔ انھوں نے کہا کہ اے موسیٰ ہم ھرگز اس میں نہیں گھسیں گے جب تک کہ وہ اس میں ہیں تو جا اور تیرا پروردگار تم دونوں لڑو ہم تو یہاں بیٹھے ہیں ۔ موسیٰ نے کہا اے پروردگار مجھ کو اختیار نہیں

فرعون کے پنجے سے بچا دیا اور جب فرعون نے پایاب اترنا چاھا تو پانی بڑھ گیا تھا وہ مع اپنے لشکر کے ڈوب گیا ۔

اس مقام پر یہ بحث پیش آوے گی کہ جب ''حزب'' کے معنی چلنے کے آتے ھیں اس کے صلہ میں ''فی'' کا لفظ آتا ھے جیسے کہ '' اذ ضربتم فی الارض' میں ھے حالانکہ ''فاضرب بعصاک البحر'' اور ''فاضرب بعصاک الحجر'' میں ''فی'' نہیں ھے مگر ''فی'' کے نہ ھونے سے کچھ ھرج نہیں ھے اس لیے کہ جب ''ضرب'' کے معنی چلنے کے لیے جاتے ھیں تو بواسطہ حرف جر یعنی ''فی'' کے متعدی کیا جاتا ھے اور جو افعال کہ بواسطہ جر کے متعدی ھوتے ھیں ان میں حرف جر کو محذوف کرنا اور فعل کو بلا واسطہ مفعول کی طرف متعدی کرنا جائز ھے اور اس مفعول کو منصوب علی نزع الخافض کہتے ھیں ۔

اس مقام پر ''اضرب'' کے ''عصا'' کے ساتھ ربط دینے کو ایک حرف جر یعنی ''ب'' ، 'عصا' پر آ چکی تھی پھر اس فعل کو مفعول کی جانب متعدی کرنے کے لیے دوسرے حرف جر یعنی ''فی'' کا لانا کسی قدر فصاحت کلام کے مناسب نہ تھا اور اس لیے اس کا حذف اولٰی تھا ۔ پس تقدیر کلام کی یہ ھے کہ '' فاضرب بعصاک البحر'' اور قرینہ حذف ''فی'' کا خود قرآن مجید سے پایا جاتا ھے کیوں کہ یہی قصہ انھی الفاظ سے سورہ طہ[1] میں بھی آیا ھے جہاں فرمایا ھے کہ ''فاضرب لھم طریقاً فی البحر'' پس ایک جگہ لفظ ''فی'' مذکور ھے تو یہی قرینہ باقی مقامات میں اس کے محذوف ھونے کا ھے ۔ اسی آیت میں فعل '' اضرب'' کے بلاواسطہ حرف جر متعدی الی المفعول ھونے کی مثال بھی موجود ھے ۔ شاہ ولی اللہ صاحب

(بقیہ حاشیہ)

مگر اپنی جان پر اور اپنے بھائی پر پھر ھم میں اور اس بدکار قوم میں فرق کر خدا نے فرمایا کہ وہ حرام کر دی گئی ھے اُن پر چالیس برس تک وہ ٹکراتے پھریں گے زمین میں اور تو رنج مت کر اس بدکار قوم پر ۔

نے اس آیت کا ترجمہ کیا ہے کہ ''پس برو برائے ایشاں در راہ خشک'' یعنی شاہ صاحب نے ''ضرب'' کے معنی زدن کے نہیں لیے 'رفتن' کے لئے ہیں جو لازمی ہے اور لفظ ''طریقا'' اس آیت میں ''اضرب'' کا مفعول ہے اور بلا واسطہ حرف جر متعدی الی المفعول ہوا ہے ۔

جغرافیہ کے نقشوں کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ خلیج عرب اور بحر احمر عدن کے پاس مل گئے ہیں دونوں طرف پہاڑ ہیں اور ان کے بیچ میں نہایت تنگ رستہ ہے جو جہاز خلیج عرب سے بحر احمر میں جاتے ہیں وہ اسی تنگ رستہ میں ہو کر گزرتے ہیں اس رستہ کو طے کرنے کے بعد بحر احمر ملتا ہے جو نہایت بڑا اور وسیع سمندر ہے جب اس کے شمال کی طرف چلے جاؤ تو اخیر کو اس کی دو شاخیں ہو گئی ہیں ''اگر تم اپنے دائیں ہاتھ کو چت کر کر سب انگلیاں بند کرو اور صرف بیچ کی انگلی اور کلمے کی انگلی کھول دو اور دونوں کو پھیلا کر تانو تو بحر احمر کی شاخوں کی بالکل صورت بن جاوے گی ۔ کلمہ کی انگلی دائیں طرف رہے گی اور بیچ انگلی بائیں طرف اور ان دونوں کے بیچ میں ایک مثلث کی صورت دکھائی دے گی ۔ بحر احمر کی دائیں شاخ جو جانب شرق ہے چھوٹی ہے جیسے کہ کلمہ کی انگلی چھوٹی ہے اور بائیں شاخ جو جانب غرب ہے کسی قدر بڑی ہے جیسے کہ بیچ کی انگلی بڑی ہے اور یہ سمجھو کہ بیچ کی انگلی یعنی بڑی شاح کے بائیں طرف مصر ہے اور ان دونوں انگلیوں کے بیچ میں جو مثلث جگہ ہے وہ جگہ ان جنگلوں اور پہاڑوں کی ہے جہاں بنی اسرائیل چالیس برس تک ٹکراتے پڑے پھرے اور اسی جگہ کوہ سینا یا کوہ طور ہے جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تجلی ہوئی اور توریت ملی ۔

جس زمانے میں بنی اسرائیل مصر میں رہتے تھے اور فرعون

مشہور بادشاہ تھا اس زمانہ میں اس کا دارالسلطنت شہر رامیس تھا اس کے بائیں طرف تھوڑے فاصلہ پر دریائے نیل تھا اور دائیں طرف یعنی جانب مشرق تین منزل کے فاصلہ پر بحر احمر کی بڑی شاخ تھی حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو شہر رامیس سے لے کر نکلے پہلی منزل ”سکوت“ میں ہوئی دوسری منزل ”ایثام“ میں تیسری منزل ”فہا حیروت“ میں یہ مقام بحر احمر کی بڑی شاخ کے بائیں کنارہ پر یعنی جانب غرب ۔ اُس شاخ کی نوک کے پاس واقع تھا ۔ جب فرعون نے مع اپنے لشکر کے بنی اسرائیل کا تعاقب کیا ۔ تو راتوں رات حضرت موسیٰ اسرائیل سمیت بحر احمر کی بڑی شاخ کی نوک میں سے جہاں ہم نے نقشہ میں نقطوں کا نشان کر دیا ہے پار اُتر گئے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت بہ سبب جوار بھاٹے کے جو سمندر میں آتا رہتا ہے اس مقام پر کہیں خشک زمین نکل آتی تھی اور کہیں پایاب رہ جاتی تھی بنی اسرائیل پایاب و خشک راستہ سے راتوں رات بہ امن اُتر گئے۔یہی مطلب صاف اس آیت سے پایا جاتا ہے ۔ جو سورۂ دخان میں ہے کہ ”واترک البحر رھوا“ جس کا ٹھیک مطلب یہ ہے کہ چھوڑ چل سمندر کو ایسی حالت میں کہ اُترا ہوا ہے ۔ صبح ہوتے فرعون نے جو دیکھا کہ بنی اسرائیل پار اُتر گئے اس نے بھی ان کا تعاقب کیا اور لڑائی کی گاڑیاں اور سوار پیادے غلط رستے پر سب دریا میں ڈال دیے اور وہ وقت پانی کے بڑھنے کا تھا لمحہ لمحہ میں پانی بڑھ گیا جیسے کہ اپنی عادت کے موافق بڑھتا ہے اور دباؤ ہو گیا جس میں فرعون اور اس کا لشکر ڈوب گیا ۔

علمائے اسلام کا زمانہ گیارہ بارہ سو برس سے سمجھنا چاہیے ان بزرگوں نے جو اپنے ہوش سے بحر احمر اور اس کی شاخ اُس کو جس میں سے حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل نے عبور کیا تھا نہایت عمیق اور ایک قہار سمندر دیکھا ہے اور ان کے خیال میں بھی نہیں آ سکتا

تھا کہ کیسا ھی بڑا جوار بھاٹا آوے وہ جگہ کبھی پایاب نہیں
ھو سکتی اس لیے اُنھوں نے قرآن مجید کی صاف صاف عبارت اور
الفاظ کو جو صریح جوار بھاٹے اور خشک زمین کے نکل آنے پر دلالت
کرتی تھی اُلٹ پلٹ کر اس واقعہ کو بطور ایک عجیب واقعہ کے
بنایا اور ایسا معجزہ جو قانون قدرت کو بھی توڑ دے ٹھیرا دیا ۔ مگر
حقیقت حال یہ نہیں ھے معلوم ھوتا ھے کہ اُس زمانہ میں جب
بنی اسرائیل نے عبور کیا بحر احمر ایسا قہار سمندر نہ تھا جیسا کہ
اب ھے ۔ گو اُس زمانہ کا صحیح جغرافیہ ھم کو نہ ملے مگر بہت
پرانا جغرافیہ جو بطلیموس نے بنایا تھا مع اس کے نقشہ جات کے
جو بطلیموس کے جغرافیہ کے مطابق بنائے گئے ھیں خوش قسمتی سے
ھمارے پاس موجود ھے اور اس میں بحر احمر کا بھی نقشہ ھے اس سے
معلوم ھوتا ھے کہ بطلیموس کے زمانہ تک بحر احمر میں تیس چھوٹے
بڑے جزیرے موجود تھے اور یہ صاف دلیل اس بات کی ھے کہ
اس زمانہ میں بحر احمر ایسا قہار سمندر نہ تھا جیسا کہ اب ھے یا
جیسا کہ ھمارے علمائے اسلام بارہ سو برس سے اس کو دیکھتے آئے
ھیں ۔ بحر احمر کی اس حالت پر خیال کرنے سے بالکل یقین ھو جاتا
ھے کہ وہ مقام جہاں سے بنی اسرائیل اُترے تھے بلاشبہ جوار بھاٹے
کے سبب رات کو پایاب اور دن کو عمیق ھو جاتا ھوگا ۔ مزید
توضیح کے لیے بطلیموس کے جغرافیہ میں سے بعینہٖ بحر احمر کے
نقشہ کو ھم اس مقام پر نقل کرتے ھیں ۔ یہ جغرافیہ ھمارے پاس
اصل یونانی زبان میں جس میں بطلیموس نے لکھا تھا مع لیٹن ترجمہ
کے موجود ھے ۔ جو ۱٦۱۸ء میں لوئیس سیزدھم شاہ فرانس کے عہد
میں چھپا تھا ۔ اس میں وہ تمام جزیرے جو بحر احمر میں موجود تھے
مندرج ھیں ۔ مؤرخین کے قول کے بموجب بنی اسرائیل سنہ عیسوی
سے دو ھزار پانسو تیرہ برس قبل بحر احمر کی شاخ سے اُترے تھے
اور بطلیموس جس نے جغرافیہ لکھا تھا اور جس کو گلاڈیوس ٹالمی

کہتے ہیں سنہ عیسوی کی دوسری صدی میں تھا پس بنی اسرائیل کے عبور کرنے کے دو ہزار سات سو برس بعد تک وہ جزیرے موجود تھے - یہ بطلیموس یونانی تھا مگر مصر میں رہتا تھا اور اس لیے
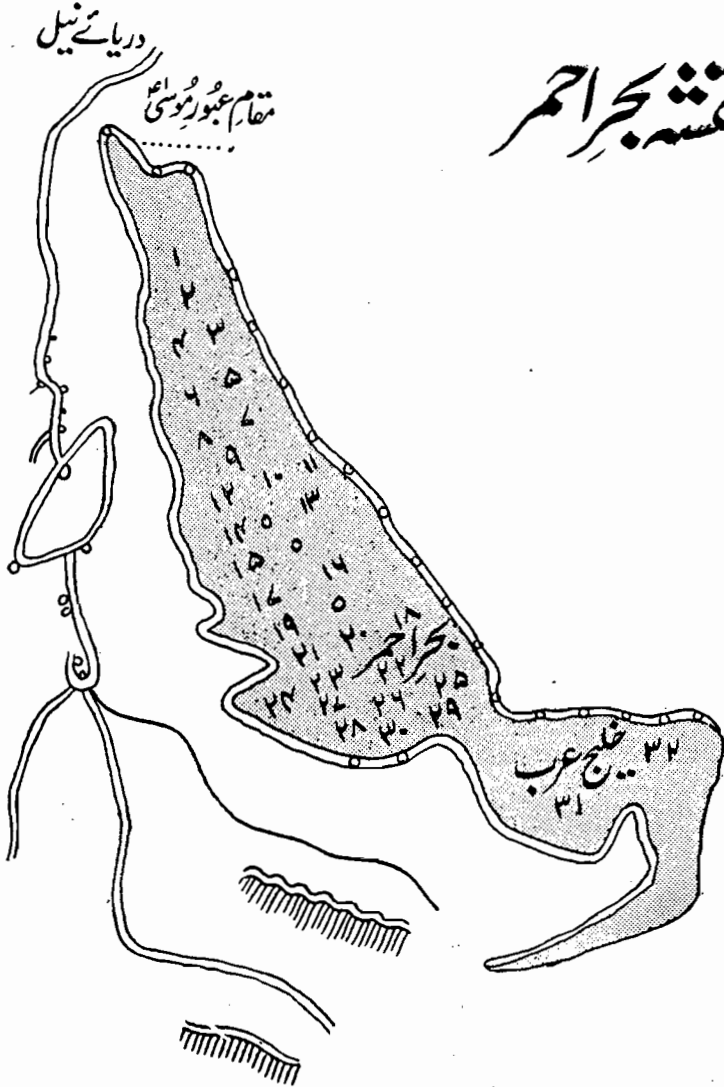
بحر احمر کا جو حال اس نے لکھا ہے زیادہ اعتبار کے لائق ہے سمندر کے جزیرے مدت تک نکلے رہتے ہیں اور پھر کسی زمانہ میں ان اسباب سے جن کا ذکر علم جیالوجی میں ہے دفعةً زمین میں بیٹھ جاتے ہیں اور جہاں لوگ بستے تھے اور جن پایاب مقامات پر لوگ چلتے تھے وہاں دفعةً میلوں گہرا پانی ہو جاتا ہے اسی طرح بطلیموس کے زمانہ کے بعد کسی وقت میں یہ جزیرے بھی جو بحر احمر میں تھے غائب ہو گئے ہیں اور اب ہم کو اتنا بڑا قہار سمندر دکھائی دیتا ہے مگر موسیٰ کے عہد میں ایسا نہ تھا اور اس بات پر یقین کرنے کی بہت سی وجوہات ہیں کہ حضرت موسیٰ کو اس مقام پر سمندر کے پایاب ہو جانے کا حال معلوم تھا اور اسی سبب سے یہ رستہ انھوں نے اختیار کیا تھا ۔ کیوں کہ سمندر کے پار ایسے جنگل و پہاڑ تھے جس میں فرعون کو لشکر لے جانا اور بنی اسرائیل کا تعاقب کرنا غیر ممکن تھا ۔

اسماء جزیرہ ہائے بحر احمر ۔

۱- تمی جینس	۱۱- جریکم	۲۱- اکبن تھین
۲- ونرس	۱۲- سیٹی رورم	۲۲- کیم بستا
۳- زجینیا	۱۳- کیٹی ٹھری	۲۳- مکبرنیا
۴- اگئی تھونس	۱۴- میرونس	۲۴- ارنیان
۵- دیمونم	۱۵- تھرب ڈی ڈیس	۲۵- بیکائی
۶- اسارٹی	۱۶- ساکرٹیٹس	۲۶- بیکائی
۷- پالی پچ	۱۷- مجورم	۲۷- ایڈینی
۸- ایر اپلیڈس	۱۸- گارڈی منیڈ	۲۸- ڈایو دوارے
۹- جبسی ٹس	۱۹- ڈیف نین	۲۹- پینس
۱۰- گوما ڈیرم	۲۰- ایری	۳۰- اسی ڈس

(عجل) بچھڑا بنانے کا واقعہ اس وقت ہوا تھا جب کہ

حضرت موسیٰ چالیس دن رات پہاڑ پر جا کر رہے تھے۔ بنی اسرائیل نے بچپن سے مصریوں میں پرورش پائی تھی اور دیکھا کرتے تھے کہ وہ ساری قوم بتوں اور جانوروں کی پرستش کرتی ھے مصری بندر اور سانپ اور بیل اور اور بہت سے قسم کے جانوروں کی پوجا کیا کرتے تھے۔ جب بنی اسرائیل سمندر کے پار ھوئے تو وھاں بھی انھوں نے بتوں کی پرستش کرتے ھوئے لوگوں کو پایا اور موسیٰ سے کہا کہ ھم کو بھی ایسے ھی معبود بنا دے (یہ قصہ سورۂ اعراف میں ھے) گمان غالب ھوتا ھے کہ وہ لوگ بچھڑے ھی کی مورت کی پوجا کیا کرتے ھوں گے اور اسی کی نقل پر بنی اسرائیل نے بھی بچھڑے کی مورت بنائی تھی - جس کے سبب خدا کی خفگی ھوئی -

(فاقتلوا) اس آیت سے یہ بات نہیں پائی جاتی کہ بنی اسرائیل میں سے کسی ایک نے بھی اپنے آپ کو مار ڈالا تھا کیوں کہ یہ کہنا کہ "مار ڈالو اپنے آپ کو" حضرت موسیٰ کا قول ھے اور یہ کہنا ایسی طرح کا کہنا ھے جیسے کوئی بزرگ کسی کو نفریں کرتے وقت کہے کہ ڈوب مر ایسا کرنے سے تو تیرا مرنا بہتر ھے - پس بنی اسرائیل پر خود حضرت موسیٰ کے غصہ کے یہ الفاظ ھیں خدا نے اُن کو اپنے تئیں آپ مار ڈالنے کا حکم نہیں دیا تھا ۔ نہ اُن میں کسی نے اپنے تئیں آپ مار ڈالا تھا یہ مطلب اس آیت کے پچھلے حصہ سے جس میں معاف کر دینے کا ذکر ھے زیادہ تر صاف ھو جاتا ھے ۔ کیوں کہ جن لوگوں نے گوسالہ پرستی کی تھی اُنھی کی نسبت خدا نے فرمایا ھے کہ "پھر خدا نے تم کو معاف کیا"۔

(نری اللہ جھرۃ) انسان کے دل میں کسی چیز کے دیکھنے کی خواھش تین طرح پر پیدا ھوتی ھے اس کا حال اور اوصاف سننے

سے یا دل میں کسی خاص قسم کا ذوق و شوق پیدا ہو جانے سے یا اس کا حال کہنے والے کی بات پر یقین نہ کرنے سے ، موسیٰ کو بھی خدا کے دیکھنے کا شوق ہوا مگر وہ شوق دوسری قسم کا تھا جس کے غلبہ میں انسان کی عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے اور ہونی نہ ہونی بات کہہ اٹھتا ہے - بنی اسرائیل نے بھی خدا کو دیکھنا چاہا مگر یہ ان کا سوال تیسری قسم کا تھا وہ موسیٰ کی اس بات پر کہ خدائے پروردگار عالم موجود ہے اور اس نے موسیٰ کو اپنا پیغمبر کیا ہے یقین نہیں لاتے تھے اور اس بنا پر انہوں نے کہا تھا کہ ہمیں خدا کو دکھا دے جب تک ہم علانیہ خدا کو نہ دیکھ لیویں گے تجھ پر ایمان نہ لاویں گے - حضرت موسیٰ اپنے شوق کے سبب جس میں انسان کو ذھول ہو جاتا ہے بھول گئے کہ خدا ان آنکھوں سے دکھائی نہیں دے سکتا اور بنی اسرائیل نے اپنی حماقت سے یہ چاہا کہ علانیہ خدا کو ہم دیکھ لیں اور یہ نہ سمجھے کہ خدا اپنے تئیں نہ کسی کو دکھا سکتا ہے اور نہ کوئی خدا کو دیکھ سکتا ہے - ہر کوئی اس کی قدرت کا کرشمہ دیکھتا ہے اور اسی سے اس کی ذات کے موجود ہونے پر یقین لاتا ہے -

(صاعقه) صاعقه کے معنی لغت میں ، موت کے بھی ہیں اور عذاب مہلک کے بھی ہیں - مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس عذاب سے کوئی ہلاک ہوئے بغیر رہے ہی نہیں اور عذاب یا بلا آنے کی سنسناہٹ اور گڑ گڑاہٹ اور کڑک کے معنی بھی آتے ہیں اور بجلی آسمان پر سے گرنے والی آگ کے معنی بھی ہیں اور ''صعق'' بکسرالعین کے معنی ''غشی علیه'' یعنی بے ہوش کیا گیا -

اب دیکھنا چاہیے کہ اس جگہ فاخذتکم الصاعقة کے کیا معنی ہیں - موت کے معنی تو یہاں ہو ہی نہیں سکتے - اس لیے کہ ''و انتم تنظرون'' کا مطلب غلط ہو جاتا ہے - کیوں کہ

موت کی نسبت ''وانتم تنظرون'' نہیں کہہ سکتے۔ امام فخرالدین رازی بھی تفسیر کبیر میں فرماتے ھیں کہ یہاں صاعقہ کے معنی موت کے نہیں ھیں کیوں کہ موت کی نسبت ''تنظرون'' نہیں آ سکتا اور اس کے سوا خدا نے سورۂ اعراف میں فرمایا ھے ''و خر موسیٰ صعقا'' اور پھر فرمایا ھے '' فلما افاق'' اور افاقہ موت سے نہیں ھوتا بلکہ غشی سے ھوتا ھے ' سورۂ اعراف میں '' صاعقہ'' کی جگہ 'رجفہ' فرمایا ھے جس کے معنی کپ کپاھٹ کے ھیں۔ غرضکہ اس جگہ ''صاعقہ'' کے معنی موت کے نہیں ھیں بلکہ ٹھیک معنی ، گرج اور گڑ گڑاھٹ کے ھیں خواہ وہ گرج بجلی کی ھو خواہ وہ گڑ گڑاھٹ بادل کی ھو یا کسی آتشیں پہاڑ کی یہ کہا جا سکتا ھے کہ جب کہ اسی آیت میں ھے کہ ''ثم بعثنا کم من بعد موتکم '' تو یہ ایک قوی ثبوت اس بات کا ھے کہ یہاں 'صاعقہ' کے معنی موت کے ھیں مگر مفسرین اور خصوصاً امام فخرالدین اس بات کو تسلیم کرتے ھیں کہ کبھی ، بعث کا اطلاق ''لا بعد الموت'' پر بھی ھوتا ھے ۔ جیسے کہ خدا نے فرمایا ھے کہ فضربنا علیٰ اذانہم فی الکہف سنین عدداً ثم بعثنا ھم پس بعثنا کے لفظ سے تو ، صاعقہ کے معنی موت کے لینے پر استدلال نہیں ھو سکتا رہا لفظ ، ''موت'' کا اس کی نسبت مفسرین نے نہایت سہل رستہ اختیار کیا ھے جو ھم کو نہایت ھی مشکل اور پیچ دار معلوم ھوتا ھے انھوں نے فرمایا کہ محققین کا یہ قول ھےکہ ''صاعقہ ، سے مراد تو سبب موت ھے اور موت کے معنی موت ھی کے ھیں خدا نے ان لوگوں کو جو خدا کو دیکھنے گئے تھے صاعقہ سے جو سبب اُن کی موت کا ھوا مار ڈالا اور پھر حضرت موسیٰ کی دعا سے۔ اور گڑ گڑا کر یہ کہنے سے کہ یہ تو ستر کے ستر مر گئے اب بنی اسرائیل کو میں کیا جواب دوں گا

اور میری نبوت کی گواهی کون دے گا خدا نے پھر ان کو زندہ کر دیا ۔

مگر میری سمجھ میں خدائے پاک کا کلام ایسا بودا نہیں ھے بلکه جیسا اس کا قانون قدرت مستحکم اور مضبوط ھے ایسا ھی اس کا کلام بھی مضبوط ھے ۔ جب که هم کو یه ثابت هو گیا که صاعقه کے معنی 'موت' کے نہیں ھیں بلکه اس مقام پر هو بھی نہیں سکتے اور 'بعث' کا اطلاق "لا بعد الموت" پر بھی آتا ھے تو هم لفظ ، موت ، کو اس کے حقیقی معنوں پر یعنی بدن سے جان نکل جانے پر اطلاق نہیں کر سکتے بلکه مردے کے مانند هو جانے پر اطلاق کرتے ھیں اور اس کی دلیل خود قرآن مجید میں موجود ھے ۔ اس لیے کہ جو واقعه اس مقام پر بیان هوا ھے وهی واقعه سورۂ اعراف میں بھی آیا ھے اور وهاں یه فرمایا ھے ۔ "فلما اخذتهم الرجفة قال رب لو شئت اهلکتهم من قبل و ایای" ۔ یعنی بنی اسرائیل میں سے ستر آدمی جو خدا کے دیکھنے کے لیے گئے تھے ڈر کے مارے کانپنے لگے تو حضرت موسیٰؑ نے کہا که اے پروردگار اگر تو چاهتا تو اس سے پہلے ھی آن کو اور مجھ کو بھی مار ڈالتا ۔

اس سے صاف پایا جاتا ھے که ان کے مرنے تک نوبت نه پہنچی تھی یا بے هوش هو گئے تھے یا آن کی حالت مردے کی سی هو گئی تھی اور اسی سبب سے یہاں ان پر مرده کا اطلاق کیا گیا ھے علاوہ اس کے حضرت موسیٰ پر بھی پروردگار کی تجلی هوئی تھی جس کے سبب پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے هو گیا تھا وهاں یه لفظ "و خر موسیٰ صعقا" یعنی موسیٰ بے هوش هو کر گر پڑا ، سورۂ احزاب[1] میں خود خدا تعالیٰ نے خوف کی حالت کو

۱۔ فاذا جاء الخوف رایتم ینظرون الیک تزروا رائیتم کالذی یغشی علیه من الموت (لاحزاف) ، ۱۹ ۔

موت کی بے ہوشی کی حالت سے تشبیہ دی ہے پس ان سب آیتوں کے ملانے سے ظاہر ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل پر بھی یہی حالت گزری تھی۔

'موت' کے لفظ کا نہایت وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ امام فخرالدین رازی اور صاحب تفسیر ابن عباس نے سورہ زمر کی تینتالیسویں آیت میں لفظ موت کو بہ معنی نوم قرار دیا ہے، 'حین موتہا' کی تفسیر 'حین منامہا' اور قران مجید میں رنج میں پڑے رہنے پر بھی موت کے لفظ کا استعمال ہوئے جہاں سورہ آل عمران میں فرمایا ہے ''قل موتوا ابیظکم'' یعنی اپنے غصہ سے مر جاؤ۔ یعنی اس میں مبتلا رہو ڈھے ہوا ہے شہر غیر آباد یا فصل گزری ہوئی زمین پر بھی موت کا استعمال ہوتا ہے بے جان یا معدوم شے پر بھی موت کا لفظ بولا جاتا ہے جہاں فرمایا ہے کہ کنتم امواتاً فاحیاکم ثم یمیتکم ثم یحیبکم اور جگہ فرمایا ہے یخرج الحی من المیت و یخرج المیت من الحی غرض کہ جہاں تک غور کیا جاتا ہے اس مقام پر لفظ 'موتکم' سے جو قرآن مجید میں آیا ہے ان لوگوں کے فی الحقیقت مر جانے پر استدلال نہیں ہو سکتا۔

یہ تمام واقعات موسیٰ و بنی اسرائیل پر سینا کے مقام میں گزرے تھے وہاں ایک سلسلہ پہاڑوں کا ہے جس کو طور سینا، یا طور سینین کہتے ہیں اور کبھی صرف طور ھی اس کا نام لیتے ہین کچھ شبہ نہیں ہو سکتا کہ حضرت موسیٰ کے زمانے میں وہ کوہ آتش فشاں تھا جب بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ سے کہا کہ ہم علانیہ خدا کو دیکھنا چاہتے ہیں تو وہ بجز اس کی قدرت کاملہ کے ایک عظیم الشان کرشمہ کے اور کچھ ان کو نہیں دکھا سکتے تھے۔ پس وہ ان کو اس پہاڑ کے قریب لے گئے جس کی آتش فشانی اورگڑگڑاہٹ

اور زور شور کی آواز اور پتھروں کے اڑنے کے خوف سے وہ بے ہوش یا مردے کی مانند ہو گئے ۔ خدا تعالیٰ ان تمام کاموں کو جو اس کے قانون قدرت سے ہوتے ہیں خود اپنی طرف منسوب کرتا ہے جن کے منسوب کرنے کا بلا شبہ وہ مستحق ہے اسی طرح ان واقعات عجیبہ کو بھی اس نے اپنی طرف منسوب کیا ہے ۔

اس بات کے آثار کہ کوہ سینا در حقیقت آتش فشاں تھا ، اب تک پائے جاتے ہیں اور ہر شخص اب بھی جا کر دیکھ سکتا ہے ایک بہت بڑا عالم شخص یعنی کینن اسٹینلی حال میں بطور سیاحت اس وادی میں گئے تھے جہاں سے حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل نے گزر کیا تھا ۔ انھوں نے اس پہاڑ کا حال اس طرح پر لکھا ہے کہ ”چٹانوں کی راہ سے جو بطور زینہ کے بنی ہوئی تھیں ہم ایک وادی میں پہنچے جو سرخ پتھر کے پہاڑوں کے درمیان تھیں یہاں پر عجیب و غریب پہاڑ دیکھنے میں آئے جن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ گویا سرخ و سیاہ مادہ کی گرم نہریں ان پر بہتی ہیں در حقیقت آتشی مادہ اوپر بہہ آیا تھا جب کہ وہ زمین سے اٹھتے تھے یہ راستہ ایسی جگہ ہو کر گزرتا تھا جہاں بجز جلے ہوئے مادوں اور خاکستر کے اور کچھ نہ تھا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی ہتھیار ڈھالنے کے کارخانے میں ڈھیر ہوتے ہیں یہاں اکثر ایسی چیزیں دیکھنے میں آئیں جن کو کوئی نیا آدمی آتش فشاں پہاڑ کے آثار تصور کرے لیکن یہ غلط فہمی ہے جلے پہاڑوں کی مانند جو بڑے بڑے ڈھیر معلوم ہوتے ہیں وہ صرف لوہے کے ریزے ہیں جو بھرے بھرے پتھروں کی بناوٹ میں ملے ہوئے ہیں ۔ سرخی مائل پتھر کی چٹانوں میں جو آتشی عمل کے آثار پائے جاتے ہیں وہ ان کی ابتدائی اٹھان سے متعلق ہیں ۔ نہ کسی بعد کے انقلاب سے ، ہر جگہ پانی کے عمل کے آثار ہیں

آگ کے کہیں نہیں ہیں"۔

کینن اسٹینلی بہت بڑے پادری اور عیسائی مذہب کے پیشوا ہیں ۔ عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ درحقیقت خدا ہی آگ کی صورت میں پہاڑ پر آترا تھا ۔ اس لئے انھوں نے اپنی تحریر میں اس پہاڑ کو آتشیں پہاڑ کہنے سے بہت بچایا ہے ۔ مگر جو شے کہ موجود ہے اس کو کوئی شخص ہیر پھیر کر بیان کرنے سے معدوم نہیں کر سکتا ۔ خود توریت میں جو کچھ اس پہاڑ کی نسبت بیان ہوا ہے (اگر صحیح تسلیم کیا جاوے) تو کچھ شبہ نہیں رہتا کہ وہ آتش فشاں پہاڑ تھا ۔ کتاب خروج باب نوزدھم میں لکھا ہے کہ "بوقت طلوع صبح رعدھا و برقھا و غمامہ و مظلمہ بالائے کوہ نمایاں شد و آواز کرنا بحدے شدید شد کہ تمامی قوی کہ در اردو بودند لرزیدند و تمامی کوہ سینی را دو و فرا گرفت و دودش مثل و دوتنور متصاعد بود و تمامی کوہ بغایت متزلزل شد ، یہ تمام حالتیں وہ ہیں جو کوہ آتش فشاں میں واقع ہوتی ہیں اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانے میں وہ آتش فشاں تھا اور کینن اسٹینلی کی یہ تاویل کہ وہ نشانیاں اس پہاڑ کی بناوٹ ہی کی ہیں صحیح نہیں ہو سکتی ۔

خدا کی تجلی ہر چیز میں ہے جس کو اس نے اپنی قدرت کاملہ سے بنایا اور پیدا کیا ۔ ہم بلا شبہ کہ سکتے ہیں کہ فلما تجلی ربنا علی الجبل ، فلما تجلی ربنا علی البحر ، فلما تجلی ربنا علی الانسان ، فلما تجلی ربنا علی الحمار ، فلما تجلی ربنا علی البعوضة ، و ما فوقہا ، فقد وقع کذا ، مگر کسی مادی یا فانی صورت میں نہ خدا آ سکتا ہے نہ سما سکتا ہے پس ہم توریت کے اس لفظ پر کہ " خداوند در آتش بر آں تنزل نمود" یقین نہیں لا سکتے گو کینن اسٹینلی کو یقین ہو ۔ ہاں اگر ان لفظوں

کے معنی بھی تجلی اور ظہور قدرت کے لیے جاویں تو پھر مقام انکار نہیں رہتا ۔

(وظللنا علیکم الغمام) توریت میں بنی اسرائیل پر بادلوں کی چھاؤں ہونے کا واقعہ عجیب طرح سے لکھا ہے کہ بادل تمام دن بنی اسرائیل[1] کو راہ دکھانے کے لیے اُن کے آگے آگے چلتا تھا اور جہاں ٹھہر جاتا تھا وہاں بنی اسرائیل قیام کرتے تھے اور رات کو وہی بادل روشنی کا ستون ہو جاتا تھا مگر اس پر کیوں کر یقین ہو سکتا ہے جب کہ چالیس برس تک بنی اسرائیل کو منزل مقصود تک پہونچنے کا راستہ نہیں ملا ۔ ہمارے علمائے مفسرین نے بھی اپنی عادت کے موافق یہودیوں کی پیروی کی ہے اور اس آیت کی تفسیر میں ایسی قسم کی باتیں جن کا اشارہ تک اس آیت میں نہیں ہے بیان کی ہیں ۔

قرآن مجید سے بنی اسرائیل کے ساتھ ساتھ بادل کا پھرنا معلوم نہیں ہوتا اس آیت سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ کسی وقت دھوپ اور گرمی کی سختی میں بادل آ جانے سے خدا نے اُن کی تکلیف کو دور کر دیا جس کا بطور ایک احسان کے ذکر کیا ہے بڑی غلطی لوگوں کے خیال میں یہ ہے کہ جو امور موافق قانون قدرت کے ظہور میں آتے ہیں ان کو نہ معجزہ سمجھتے ہیں نہ احسان جتلانے یا ماننے کے قابل جانتے ہیں اور اس لئے اس میں بالطبع ایسی باتیں شامل کر لیتے ہیں جو قانون قدرت سے خارج ہوں حالانکہ خدا تعالیٰ نے تمام قرآن مجید میں جابجا بندروں پر اُنھی باتوں سے اپنا احسان جتلایا ہے اور انھی کو بطور معجزہ کے بتلایا

۱۔ دیکھو کتاب خروج باب ۱۴ ، ورس ۱۹ ، ۲۰ و باب ۴۰ ورس ۳۴ - ۳۸ ۔

ہے جس کو اس نے اپنی قدرت کاملہ سے موافق قانون قدرت کے پیدا کیا ہے - جب بنی اسرائیل بحر احمر کی شاخ کو پار کر گئے جس کا پانی بسبب جوار بھاٹے کے اترتا چڑھتا رہتا تھا ، تو اس پار پتھر اور ریگستان کا ایک مسطح بیابان ہے ، وہاں اکثر ریگ کا طوفان رہتا ہے جو اس ملک کے ساتھ مخصوص ہے اور حال کے سیاحوں نے بھی اس کو دیکھا ہے اس ریت کے میدان میں دھوپ کی شدت سے بنی اسرائیل کو بڑی تکلیف ہوئی ہوگی - خصوصاً اس وجہ سے کہ ریت بھی بھوبل کی مانند گرم ہوگی جس پر چلنا اور بیٹھنا نہایت مشکل ہوگا - ایسے وقت میں ابر کا آ جانا بلاشبہ بنی اسرائیل کے حق میں بہت بڑی نعمت تھی - جس کو اس مقام پر بطور احسان کے خدا نے یاد دلایا ہے -

(من و سلوی) 'من' ایک چیز ہے جو بطور ترنجبین کے ایک خاص قسم کی جھاڑیوں پر جم جاتی ہے اور سلوی بٹیر کی قسم کا جانور ہے جو اس جنگل میں جہاں بنی اسرائیل گئے تھے بکثرت پایا جاتا تھا اور وہاں وہی ان کی غذا تھی - پس اسی کا ذکر قرآن مجید میں ہے - باقی عجائبات 'من' کے جو توریت میں بیان ہوئے ہیں اور جن پر یقین کرنا ایسا ہی مشکل ہے جیسے کہ قانون قدرت سے انکار کرنا - ان کا کچھ ذکر قرآن مجید میں نہیں ہے - گو مفسرین نے اور انبیاء کے قصے لکھنے والوں نے یہودیوں کی پیروی سے اپنی تصنیفات میں ان کا ذکر کیا ہے -

حال کے سیاحوں نے بھی اس جنگل میں 'من' کو پایا ہے - کپتن اسٹینلی لکھتے ہیں کہ چشمہ مرہ سے گذر کر دو وادیاں دیکھیں جس میں سے ایک یقیناً ایلم ہوگی - عام صورت اس وسیع میدان کی یہ تھی کہ ایک ریگستان تھا اور جا بجا پانی کے سے راستے جیسے کوئی دریا خشک ہو جاتا ہے بنے ہوئے تھے ان

وادیوں کے راستہ راستہ جا کر عجیب سیاہ و سفید پہاڑ ملتے ہیں یہ بیابان بغیر درخت اور گھاس کے تھا لیکن ان وادیوں میں جن پر ایلم کا شبہ ہوتا ہے - درخت اور جھاڑیاں موجود تھیں - یہاں کھجور کے درخت چھوٹے چھوٹے تھے اور یہاں پر 'تمرسک' کے درخت بھی تھے جن کے پتوں پر وہ شے پائی جاتی ہے جس کو اہل عرب 'من' کہتے ہیں -

(و اذا قلنا ادخلوا) اس آیت میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ حضرت موسیٰ کے وقت کا قصہ نہیں ہے بلکہ بنی اسرائیل کا حال ہے - جب کہ وہ حضرت یوشع کے ساتھ شہر میں داخل ہوئے تھے اس شہر کا نام قرآن مجید میں مذکور نہیں ہے - مگر قدیم نام اس کا 'یریحو' ہے جس کو یونانی میں 'جریکو' کہتے ہیں اور مسلمان مفسروں نے اس کو ' اریحا ' لکھا ہے -

(و ادخلوا الباب سجداً) سجدہ سے مراد حقیقی سجدہ کرنا نہیں ہے جس میں ماتھا زمین پر ٹیکنا ہوتا ہے - بلکہ خشوع و خضوع سے خدا کا شکر کرتے ہوئے داخل ہونا مراد ہے - تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ " (ارادبہ الخضوع و ھو الاقرب) یعنی سجدہ سے مراد عاجزی ہے اور یہی معنی اس جگہ زیادہ اچھے ہیں -

(فبدل) اس تبدیلی سے کسی لفظ کا بدل دینا مراد نہیں ہے کیوں کہ ان کو الفاظ نہیں بتائے گئے تھے بلکہ استغفار یعنی گناہوں سے معافی چاہنے کا حکم تھا - مگر انھوں نے اس حکم کو بدل ڈالا - اور توبہ استغفار کی کچھ پروا نہیں کی - بلکہ فتح کے سبب مغرور و متکبر ہو گئے - امام فخرالدین رازی نے بھی یہ معنی اختیار کیے ہیں - چناں چہ انھوں نے لکھا ہے کہ لما امروا بالتواضع و سوال المغفرہ لم یمتثلو امر اللہ و لم یلتفتوا الیہ ، یعنی جب کہ ان کو تواضع اور استغفار کرنے کا حکم دیا گیا تھا تو

انھوں نے اللہ کے حکم کی تعمیل نہ کی اور اس پر التفات نہ کیا ۔
اور بیضاوی میں بھی یہی مطلب تسلیم کیا گیا ھے کہ '' بدلوا بما امروا بہ من التوبۃ و الاستغفار طلب مایشتھون من اعراض الدنیا'' یعنی انھوں نے بدل دیا حکم توبہ و استغفار کا جو ان کو دیا گیا تھا دنیاوی چیزوں کے چاھنے سے جس کے وہ خواھش مند تھے۔

(فانفجرت) اس آیت میں یہی ایک امر بحث کے لائق تھا کہ پانی کے بارہ چشمے کیوں کر پیدا ھوئے تھے اور اس بحث کو ھم نے سینتالیسویں آیت کی تفسیر میں بالاستیعاب بیان کیا ۔ پہاڑی ملک کو اھل عرب حجر کہتے ھیں جیسے کہ ' عرب الحجر' یعنی عرب کا پہاڑی حصہ اسی طرح ، فاضرب بعصاک الحجر'' میں لفظ حجر کا استعمال ھوا ھے ۔ بحر احمر کی شاخ کو عبور کرنے کے بعد ایک وادی ملتی ھے جس کا قدیم نام ' ایشام ' ھے وھاں پانی نہیں ملتا ۔ توریت سے معلوم ھوتا ھے کہ وھاں ایک چشمہ تھا جس کا پانی نہایت تلخ تھا اور پی نہیں سکتے تھے اس لیے اس کا نام ' مرہ ' رکھا ھے ۔ حال کے زمانہ کے سیاحوں نے بھی وھاں ایک چشمہ پایا ھے جس کو وہ 'مرہ' خیال کرتے ھیں یہی مقام ھے جہاں بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ سے پانی مانگا تھا ۔ اس مقام کے پاس پہاڑیاں ھیں جن کی نسبت خدا نے حضرت موسیٰ سے کہا کہ ''فاضرب بعصاک الحجر'' یعنی اپنی لاٹھی کے سہارے سے اس پہاڑی پر چڑھ چل ۔ اس پہاڑی کے پرے ایک مقام ھے جس کو توریت میں 'ایلم' لکھا ھے وھاں بارہ چشمے پانی کے جاری تھے۔ جس طرح پہاڑی ملک میں پہاڑوں کی جڑ یا چٹانوں کی دراڑوں میں سے جاری ھوتے ھیں جن کی نسبت خدا نے فرمایا ھے ''فانفجرت منہ اثنتا عشرۃ عینا'' یعنی اس سے پھوٹ نکلے ھیں بارہ چشمے ۔ اگر ھم توریت کی عبارت پر یقین کریں تو اس سے بھی یہی پایا جاتا ھے اور اس کی یہ عبارت ھے کہ

''بعد ازاں بہ ایلم آمدند و در آنجا دوازدہ چشمۂ آب یافتند و ھفتاد درخت خرما بود و در آنجا بہ پہلوئے آب اردوزدند''

یہ مقام اب بھی موجود ھے اور سیاحوں نے دیکھا ھے ۔ مگر اب وھاں پانی کے چشمے نہیں بہتے ۔ کیوں کہ پہاڑی چشمے انقلاب زمانہ سے سوکھ جاتے ھیں جیسے کہ مکہ معظمہ میں زمزم کا چشمہ خشک ھو گیا ھے ۔ مگر ایسے مقاموں کو ھمیشہ لوگ مقدس سمجھتے ھیں اور اس کے یاد گار یا نشان قائم رکھنے کو وھاں کنوئیں کھود دیتے ھیں جس طرح کہ مکہ معظمہ میں چاہ زمزم کھودا گیا ھے ۔ اس مقام پر بھی جہاں حضرت موسیٰ کو بارہ چشمے ملے تھے ۔ لوگوں نے کسی زمانے میں کنوئیں کھودے ھیں اور اب وھاں سترہ کنوئیں موجود ھیں اور وہ مقام عیون موسیٰ کے نام سے مشہور ھے ۔ اس مقام پر بھی 'تمرسک' کے درخت ھوتے ھیں جن کے پتوں پر 'من' جم جاتا ھے ۔

(و اذ قلتم یا موسیٰ) اس آیت کی تفسیر میں مفسروں نے دو زمانے کی جدا جدا باتوں کو خلط ملط کر دیا ھے ۔ یہ بہت لمبی آیت ھے اور اس کے جدا گانہ دو حصے ھیں ایک حصہ اس سوال و جواب کا ھے جو بنی اسرائیل نے موسیٰ سے کیا تھا ۔ اور دوسرا حصہ ان واقعات کا ھے جو بعد حضرت موسیٰ بلکہ اس سے بھی بہت زمانہ کے بعد بنی اسرائیل پر واقع ھوئے تھے ۔

جن جنگلوں اور میدانوں میں بنی اسرائیل پڑے پھرتے تھے وھاں بجز جنگل کے جانوروں کے شکار کے یا اس مویشی کے گوشت کے جو بنی اسرائیل کے ساتھ ساتھ تھے اور کوئی چیز کھانے کو میسر نہ ھوتی تھی اور ایک ھی قسم کا کھانا کھاتے کھاتے بنی اسرائیل دق ھو گئے تھے جس کی شکایت انھوں نے حضرت موسیٰ سے کی اور زمین کی پیداوار کھانے کو مانگی جو شکار کے گوشت یا پلاؤ

جانوروں کے گوشت سے ادنیٰ درجہ کی تھی - حضرت موسیٰ کا اصلی مقصد فلسطین میں جانا اور وہاں کے شہروں پر قبضہ کرنے کا تھا مگر بنی اسرائیل عمالیقیوں اور کنعانیوں سے ڈرتے تھے اور لڑنے پر اور ملک فتح کرنے پر آمادہ نہ ہوتے تھے - پس جب بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ سے زمین کی پیداوار کا کھانا ملنے کی خواہش کی ، تو انھوں نے جواب دیا کہ کسی شہر میں چل پڑو اور جا اترو وہاں سب کچھ ملے گا - پس اس سے یہ سمجھنا کہ ان کے سفر میں کوئی شہر پڑا تھا اور حضرت موسیٰ نے یا خدا نے اس میں اترنے کا حکم دیا تھا - ایک صریح غلط فہمی ہے -

دوسرا حصہ آیت کا ان واقعات کے بیان میں ہے جب کہ بنی اسرائیل فلسطین میں پہنچ گئے اور شہروں کو فتح کر لیا اور اس میں آباد ہو گئے - پھر ان کی بدیوں اور برائیوں اور انبیا کے قتل کے سبب ان پر آفت آ پڑی اور ذلیل و خوار اور مسکین بے یارو مددگار ہو گئے اور باوجودیکہ ان میں سے بادشاہان ذیشان پیدا ہوئے - مگر تمام قوم میں سے وہ شان و شوکت یک لخت جاتی رہی اور اس وقت تک ان کا یہی حال ہے -

(و رفعنا) یہ مضمون دو مقام میں آیا ہے ایک تو اسی آیت میں ہے کہ ہم نے تمہارے اوپر پہاڑ کو اونچا کیا اور سورۃ اعراف میں یہ لفظ ہیں و اذ نتقنا الجبل فوقہم کانہ ظلۃ و ظنوانہ واقع بہم ان دونوں مقاموں میں چار لفظ ہیں جن کے معنی حل ہونے سے مطلب سمجھ میں آوے گا - رفع ، فوق ، نتق ، ظلہ -

"رفع" کے معنی اونچا کرنے کے ہیں مگر اس لفظ سے یہ بات کہ جو چیز اونچی کی گئی ہے وہ زمین سے بھی معلق ہو گئی ہو لازم نہیں آتی - دیوار اونچا کرنے کو بھی 'رفعنا' کہہ سکتے ہیں - حالاں کہ وہ زمین سے معلق نہیں ہوتی -

"فوق" کے لفظ کو بھی اس شے کا زمین سے معلق ہونا لازم نہیں ہے۔

"شق" کا لفظ البتہ بحث طلب ہے جس کے معنی مفسرین نے مذہبی عجائبات بنانے کو 'قلع' کے بھی لیے ہیں۔ جس کو زمین سے یا جگہ سے علیحدہ کرنا لازم ہے 'رفع' کے بھی لیے ہیں جس کو علیحدہ کر لینا لازم نہیں ہے بیضاوی میں لکھا ہے "و اذا نتقنا الجبل فوقہم ای قلعناہ و رفعناہ"۔ مگر قاموس میں اس کے معنی ہلا دینے کے لکھے ہیں "نتقہ زعزعہ" اور زعزع کے معنی ہلا دینے کے ہیں "الزعزعۃ تحریک الریح الشجرۃ و نحوھا او کل تحریک شدید یعنی 'زعزعہ' کے معنی ہوا کا درخت کو ہلا دینے کے ہیں اور ہر جنبش شدید کو بھی زعزعہ کہتے ہیں پس صاف طور سے نتقنا، کے معنی ہلا دینے کے ہیں۔ یعنی ہم نے پہاڑ کو ہلا دیا اور الفاظ "و ظنوا انہ واقع بہم" زیادہ تر پہاڑ کے ہلا دینے کے جس سے ان کو اس کے گر پڑنے کا گمان ہوا مناسب ہیں۔

"ظلہ" کے معنی سائبان کے بھی ہو سکتے ہیں۔ چھتری کے بھی ہو سکتے ہیں اور یہ جو چیز کہ ہم پر سایہ ڈالے اس کے بھی ہو سکتے ہیں اور اس چیز کا زمین سے معلق ہمارے سر پر ہونا ضرور نہیں ہے۔ تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ "الظلہ کل ما اظلک من سقف بیت او سحابۃ او جناح حایطۃ، یعنی 'ظلہ' ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو سایہ ڈالے، گھر کی چھت یا ابر کا ٹکڑا یا احاطہ کا بازو یعنی دیوار پس "ظلہ" کے لفظ سے بھی یہ بات لازم نہیں آتی کہ وہ معلق سر کے اوپر ہو۔

اب غور کرنا چاہئے تھا کہ واقعہ کیا تھا، بنی اسرائیل جو خدا کے دیکھنے کو گئے تھے طور یا طور سینین کے نیچے کھڑے ہوئے تھے پہاڑ ان کے سر پر نہایت اونچا اٹھا ہوا تھا وہ اس کے سایہ

کے تلے تھے اور طور بہ سبب آتش فشانی کے شدید حرکت اور زلزلہ میں تھا - جس کے سبب وہ گمان کرتے تھے کہ ان کے اوپر گر پڑے گا پس اس حالت کو خدا تعالیٰ نے ان لفظوں میں یاد دلایا ہے کہ "و رفعنا فوقکم الطور"، "نتقنا الجبل فوقہم کانہ ظلۃ و ظنوا انہ واقع بہم" پس ان الفاظ میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو عجیب ہو یا مطابق واقع اور موافق قانون قدرت نہ ہو ہاں مفسرین نے اپنی تفسیروں میں اس واقعہ کو عجیب و غریب واقعہ بنا دیا ہے اور ہمارے مسلمان مفسر (خدا ان پر رحمت کرے) عجائبات دور از کار کا ہونا مذہب کا فخر اور اس کی عمدگی سمجھتے تھے - اس لیے انھوں نے تفسیروں میں لغو اور بیہودہ عجائبات بھر دی ہیں - بعضوں نے لکھا ہے کہ کوہ سینا کو خدا ان کے سر پر اٹھا لایا تھا کہ مجھ سے اقرار کرو نہیں تو میں اسی پہاڑ کے تلے کچل دیتا ہوں - اور بعضوں نے کہا کہ نہیں بیت المقدس کے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ کو اکھاڑ کر ہوا میں اڑا لایا تھا - اور پانچ میل کا چوڑا پانچ میل کا لمبا تھا - اتنی بڑائی اس کی اس لیے تھی کہ کل لشکر بنی اسرائیل کا اس کے تلے ایک ہی دفعہ میں کچل جاوے - یہ تمام خرافاتیں لغو و بیہودہ ہیں اور خدائے پاک کا کلام پاک ایسی بیہودہ باتوں سے پاک ہے -

(کونوا قردۃً) ہو جاؤ بندر - اس کی تفسیر میں بھی ہمارے علمائے مفسرین نے عجیب و غریب باتیں بیان کی ہیں اور لکھا ہے کہ وہ لوگ سچ مچ صورت و شکل اور خاصیت میں بھی بندر ہوگئے تھے - بعضوں کا قول ہے کہ وہ سب تیسرے دن مر گئے اور بعضے کہتے ہیں کہ یہ بندر جو اب درختوں پر چڑھتے اور ایک ٹہنی سے دوسری ٹہنی پر اچھلتے پھرتے ہیں انھی بندروں کی نسل میں سے ہیں -

مگر یہ تمام باتیں لغو و خرافات ھیں ۔ خدائے پاک کے کلام کا یہ مطلب نہیں ہے ۔ یہودیوں کی شریعت مین سبت کا دن عبادت کا تھا اور اُس میں کوئی کام کرنا یا شکار کھیلنا منع تھا ۔ مگر ایک گروہ یہودیوں کا جو دریا کے کنارہ پر رھتا تھا فریب سے سبت کے دن بھی شکار کھیلتا تھا ۔ ان کی قوم کے مشائخوں نے منع کیا ۔ جب نہ مانا تو ان کو قوم سے منقطع ، برادری سے خارج ، کھانے پینے سے الگ ، میل جول سے علیحدہ کر دیا اور وہ توریت پر نہ چلنے والوں کو ایسا ھی کیا کرتے تھے اور اسی لیے ان کی حالت بندروں کی سی حالت ھو گئی تھی ۔ جس کی نسبت خدا نے فرمایا ہے کہ ''کونوا قردۃً خاسئین'' یعنی جس طرح بندر بلا پابندی شریعت حرکتیں کرتے ھیں ، جس طرح انسانوں میں بندر ذلیل و خوار ھیں اُسی طرح تم بھی انسانوں سے علیحدہ اور ذلیل و خوار و رسوا ھو ۔ جس کے سبب اُس زمانے کے لوگوں کو عبرت ھو اور آئندہ آنے والے اُن کی ذلت و رسوائی کا حال سن کر عبرت پکڑیں ۔

یہ کہنا کہ وہ لوگ سچ مچ کے بندر ھو گئے تھے بجز اھل الجنۃ کے اور کوئی تسلیم نہیں کر سکتا تھا ۔ اسی سبب سے بعض مفسرین نے بھی اُن کے سچ مچ کے بندر ھو جانے سے انکار کیا ہے ۔ جس کو ھم بطور تائید اپنے کلام کے اس مقام پر نقل کرتے ھیں ۔ بیضاوی میں لکھا ہے ''و قال مجاھد مامسخت صورتھم ولکن قلوبھم فمثلوا بالقرۃ کما مثلوا بالحمار فی قولہ کمثل الحمار یحمل اسفارا'' یعنی مجاھد کا قول ہے کہ ان کی صورتیں بندر کی سی نہیں ھوگئی تھیں بلکہ ان کے دل بندروں کے سے ھو گئے اور اسی لیے بندروں کے ساتھ ان کو تشبیہہ دی ہے جیسے کہ خدا نے گدھے کے ساتھ اپنے اس قول میں کہ ان کی مثال

گدھے کی ھے جس پر کتابیں لدی ھوں تشبیھہ دی ھے ۔

(تذبحوا بقرہ) یہ قصہ توریت میں بھی ھے[1] مگر اس میں بنی اسرائیل کا موسیٰ سے اس کا اتا پتا پوچھنا مذکور نہیں ھے اور اس کے ذبح کے بعد جو قصہ توریت میں ھے وہ قرآن مجید میں نہیں ھے ۔ بہرحال اتنی بات کہ خدا نے ایک بیل کے ذبح کرنے کا حکم دیا قرآن اور توریت دونوں میں موجود ھے ۔ بقرہ، بالتحریک و مع التا گائے اور بیل دونوں پر بولا جاتا ھے اور قرآن مجید کے یہ الفاظ کہ ”لا ذلول تثیر الارض ولا تسقی الحرث“ صاف اس کے بیل ھونے پر دلالت کرتے ھیں ۔ قرآن کے تمام الفاظ سے اور ان پتوں اور نشانوں سے جو بتائے گئے ھیں صاف پایا جاتا ھے کہ وہ بیل بت پرستوں یا کافروں کے طریقہ پر بطور سانڈ کے چھوڑا ھوا تھا ۔ تفسیر کبیر میں بھی مسلمہ کی تفسیر ”ای وحشیة مرسلة عن الحبس“ لکھی ھے جو ٹھیک چھوڑے ھوئے سانڈھ کی ھے اور اسی کے ذبح کر ڈالنے کا موسیٰ نے حکم دیا تھا اور بنی اسرائیل چاھتے تھے کہ وہ ذبح ھونے سے بچ جاوے اسی لئے اس کے اتے پتے پوچھتے تھے ۔ پس اس قصہ میں کوئی عجوبہ بات نہیں ھے ۔ جس بچھڑے کو بنی اسرائیل نے پوجا تھا اس کا معدوم کرنا اور جس بیل کو بطور سانڈ کے چھوڑا تھا کہ وہ بھی ایک قسم کی پرستش ھے اس کو ذبح کر ڈالنا اس شرک و کفر کے مٹانے کے لیے تھا ۔ ھمارے مفسرین نے بلاشبہ غلطی کی ھے جو یہ سمجھا ھے کہ یہ قصہ اگلی آیت ”واذ قتلتم نفساً سے متعلق ھے اور پہلی آیت کو خدا نے پیچھے کر دیا ھے ۔

(و اذ قتلتم) اس قصہ کو پہلے قصہ سے کچھ تعلق نہیں ھے ۔ بیل کے ذبح کرنے کا قصہ ختم ھو چکا یہ دوسرا قصہ ھے کہ بنی اسرائل

---

۱ - دیکھو کتاب اعداد ۱۹ -

میں ایک شخص مارا گیا اور قاتل معلوم نہ تھا ۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کے دل میں یہ بات ڈالی کہ سب جو موجود ہیں اور انہیں میں قاتل بھی ہے ۔ مقتول کے اعضا سے مقتول کو ماریں جو لوگ در حقیقت قاتل نہیں ہیں وہ بہ سبب یقین اپنی بے جرمی کے ایسا کرنے میں کچھ خوف نہ کریں گے ۔ مگر اصلی قاتل بہ سبب خوف اپنے جرم کے جو از روئے فطرت انسان کے دل میں اور بالتخصیص جہالت کے زمانے میں اس قسم کی باتوں سے ہوتا ہے ۔ ایسا نہیں کرنے کا اور اسی وقت معلوم ہو جاوے گا اور وہی نشانیاں جو خدا نے انسان کی فطرت میں رکھی ہیں لوگوں کو دکھا دے گا ۔ اس قسم کے حیلوں سے اس زمانہ میں بھی بہت سے چور معلوم ہو جاتے ہیں اور وہ بسبب خوف اپنے جرم کے ایسا کام جو دوسرے لوگ بلا خوف بہ تقویت اپنی بے جرمی کے کرتے ہیں نہیں کر سکتے ۔ پس یہ ایک تدبیر قاتل کے معلوم کرنے کی تھی اس سے زیادہ اور کچھ نہ تھا ۔

ہمارے مفسرین نے ان آیتوں کی یہ تفسیر کی ہے کہ پہلا اور پچھلا ایک ہی قصہ ہے اور پچھلی آیتوں میں جو بیان ہوا ہے وہ باعتبار وقوع کے مقدم ہے اور قصہ یوں قرار دیا ہے کہ بنی اسرائیل نے ایک شخص قتل کیا تھا ۔ اس کا قاتل معلوم کرنے کو خدا نے ایک بیل کے ذبح کرنے کا حکم دیا اور یہ کہا کہ اس مذبوح بیل کے اعضاء سے مقتول کو مارو ان کے مارنے سے مقتول زندہ ہو گیا اور اس نے اپنے قاتل کو بتلا دیا ۔

مگر اس تفسیر میں متعدد نقصان ہیں ۔ اول تو پچھلی آیتوں کا مقدم قرار دینے اور دونوں قصوں کو ایک کر دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے ۔ دوسرے ”کذالک یحیی اللہ الموتی“ کے معنی جب مربوط ہوتے ہیں جب اس کے پہلے یہ جملہ ”فا حیاہ اللہ مقدر“

مانا جاوے اور ایسے جملہ کو جو خارج از عقل اور خلاف عادت باری تعالیٰ ہے اپنی طرف سے بغیر موجود ہونے کسی یقین یا اشارہ صریح کے مقتدر ماننا عبارت قرآن میں اضافہ کرنا ہے۔ تیسرے یہ کہ باوجود اس اضافے کے یہ ماننا پڑے گا کہ 'کذالک یحی اللہ الموتی' سے مراد احیاء اموات بروز بعث و نشر ہے اور اس جگہ بعث و نشر کے حال کے بیان کرنے کا کوئی محل و موقع نہیں ہے اور نہ کوئی مباحثہ بعث و نشر کی بابت ہے۔

جو سیدھے سادھے صاف صاف معنی آیتوں کے ہم نے بیان کیے ہیں اور جن میں نہ آیتوں کی ترتیب الٹنی پڑتی ہے اور نہ کسی جملہ خلاف از عقل و بغیر سند نقل کے اپنی طرف سے بڑھانے کی حاجت ہوتی ہے اور جو صاف طور پر قرآن مجید سے پایا جاتا ہے۔ شاید اس کی نسبت بھی بعض لوگ کچھ شبہ کریں گے۔ اول تو یہ کہیں گے 'اضربو' میں ضمیر مذکر کی ہے اور 'ببعضھا' میں ضمیر مؤنث کی، اور دونوں کا مرجع ہم نے مقتول ٹھہرایا ہے۔ مگر یہ اعتراض کسی طرح صحیح نہیں ہونے کا۔ اس آیت سے پہلے ''و اذ قتلتم نفساً'' واقع ہے اور ''ببعضھا'' کی ضمیر نفس کی جانب راجع ہے اور نفس مونث ہے اور اس کے لیے مونث ہی کی ضمیر ہونی چاہیے۔ ''اضربوہ'' کی ضمیر کو بھی تمام مفسرین نے نفس ہی کی طرف راجع کیا ہے۔ مگر باعتبار شخص مقتول کے اس کا مذکر لانا جائز قرار دیا ہے۔ چناں چہ تفسیر کبیر میں میں لکھا ہے ''الہا فی قولہ تعالیٰ فاضربوہ ضمیر وھو اما ان یرجع الی النفس وحینئذ یکون التذکیر علی تاویل الشخص والانسان واما الی القتیل وھو الذی دل علیہ قولہ وما کنتم تکتمون''۔

دوسرا یہ شبہ کریں گے کہ ''یحیی'' اور ''موتی'' کے لفظ

کے هم نے وہ معنی نہیں لیے جو صریح اُن لفظوں سے پائے جاتے هیں - مگر یہ اعتراض بھی صحیح نہ هوگا اس لیے کہ هم نے ان لفظوں کے وهی معنے لیے هیں جن معنوں میں خود خدا نے ان لفظوں کو استعمال کیا ہے جہاں فرمایا ہے - ''وکنتم امواتا فاحیاکم'' یعنی تم مردہ یعنی معدوم یا غیر موجود یا نا معلوم تھے - پھر هم نے تم کو زندہ یعنی مخلوق یا موجود یا ظاهر کیا پس اسی دلیل سے هم نے یہاں سے ''یحی'' ، ''موتی'' کے یہی معنی لیے هیں کہ نامعلوم قاتل معلوم هوگیا اور ان کے معنوں کے صحیح هونے پر خود اسی مقام میں خدا تعالیٰ نے اشارہ کیا ہے - اوپر کی آیت میں لفظ واللہ مخرج آیا ہے اسی کے مقابل اس آیت میں یحی اللہ کا لفظ آیا ہے - اوپر کی آیت میں تکتمون کا لفظ آیا ہے - اسی کے مقابل اس آیت میں موتی کا لفظ آیا ہے - پس علانیہ ثابت ہے کہ یحی اللہ سے ظاهر هونا قاتل کا اور موتی سے نا معلوم یا غیر ظاهر هونا قاتل کا مراد ہے نہ مقتول کا زندہ هونا - خدا اپنی قدرت اور اپنی حکمت کو انہی باتوں میں جو انسان روزمرہ کرتے هیں اور دیکھتے هیں ظاهر کرتا ہے - مگر انسان کا خیال اس پر قناعت نہیں کرتا اور دو راز کار باتوں کو پسند کرتا ہے -

تیسرا شبہ یہ کریں گے کہ ''کذالک یحیی اللہ الموتی'' کے قبل هم کو یہ جملہ کہ ''فاظہر اللہ'' مقدر ماننا پڑے گا - مگر یہ جملہ نہ خلاف عقل ہے نہ خلاف قرآن اور نہ خلاف سیاق کلام خدا ، کیونکہ خود خدا نے فرمایا ہے 'و اللہ مخرج' برخلاف اس پہلے جملہ کے نہ وہ زمین کا ہے نہ آسمان کا -

هاروت ماروت کی اصلیت

هاروت ماروت دونون تاریخی شخص هیں یعنی اُن کا وجود تاریخ کی کتابوں سے پایا جاتا ھے - یه دونوں شخص شام کے رهنے والے تھے - قرآن مجید میں اُن کا کوئی قصه بجز اس کے جو یہاں ھے بیان نہیں ھوا ھے - تمام قصے جو مفسرین نے اُن کی نسبت اپنی تفسیروں میں بھر لیے ھیں اُن کی کچھ اصل مذھب اسلام میں نہیں ھے - جتنی روائتیں ان کی نسبت مذکور ھیں وہ سب مصنوعی اور جھوٹی ھیں - مسٹر هائیڈ کی کتاب سے معلوم ھوتا ھے که مجوسیوں کے هاں ان کی نسبت بہت سے قصے لغو مشہور تھے - ھمارے مفسریں کی یه عادت ھے که کسی کے ھاں کا قصه ھو جب وہ اپنی تفسیروں میں اس کو داخل کرتے ھیں تو اس کے ساتھ ایک ایسی مصنوعی روایت داخل کر دیتے ھیں جس سے معلوم ھو که یه مسلمانی روایت ھے ، مگر اس جھوٹ کا جو الزام ھے وہ مفسروں یا راویوں پر ھے قرآن شریف اس سے بری ھے -

یه دونوں فرشتے نہیں تھے بلکه آدمی تھے - ھمارے ھاں کے بعض مفسروں نے بھی ان کو آدمی قرار دیا ھے چناں چه حسن نے ملکین کے لفظ کو لام کے زیر سے پڑھا ھے جس کے معنی دو بادشاھوں کے ھیں اور ضحاک سے اور ابن عباس سے بھی لام کی زیر سے پڑھنا روایت کیا گیا ھے - پھر اُن میں اس بات پر اختلاف ھوا که وہ کون تھے حسن کا قول ھے که وہ دونوں بابل مین عجم کے کافروں میں سے تھے بغیر ختنه کیے ھوئے - که لوگوں کو جادو سکھاتے تھے اور یه بھی کہا گیا ھے که وہ دونوں بادشاھوں میں

سے صالح آدمی تھے -

هم ملکین کے لفظ کو مطابق قرأت مشهور ہ لام کے زبر سے پڑھتے هیں مگر فرشتے مراد نہیں لیتے - بلکه آدمی مراد لیتے هیں - جس کو لوگ نہایت نیک سمجھتے هیں - اس پر فرشته کا اطلاق کرتے هیں - قرآن مجید سے بھی کافروں میں اس محاورہ کا هونا پایا جاتا ہے - جس طرح که زلیخا کی سہیلیوں نے حضرت یوسف کو دیکھ کر کہا تھا که " ما هذا بشرا ان هذا الا ملک کریم " اور مجوسیوں میں بھی ایسا استعمال تھا اور هایڈ صاحب کی کتاب سے بھی معلوم هوتا ہے که مجوسی هاروت ماروت کو فرشته کہتے تھے - پس اس آیت میں جس طرح که لوگوں کے اس گمان کو که ، جو علم ان کے پاس تھا وہ خدا کی طرف سے اتارا گیا تھا بیان کیا گیا ہے ، اسی طرح پر جس خیال سے که وہ ان کو فرشته کہتے تھے ملکین کا لفظ لام کے زبر سے لایا گیا ہے - یعنی ان لوگوں نے اس چیز کی پیروی کی جس کی نسبت وہ کہتے تھے که بابل میں هاروت اور ماروت پر جن کو وہ فرشته کہتے تھے خدا کی طرف سے اتاری گئی ہے - پس خدا نے یه نه فرمایا ہے که جو علم ان کے پاس تھا وہ خدا کی طرف سے اتارا هوا تھا اور نه یه فرمایا ہے که وہ دونوں فرشتے تھے بلکه جو زعم ان دونوں باتوں کی نسبت کافروں یا یہودیوں کا تھا وہ بیان کیا ہے -

اب ایک اور شبه باقی رہ جاتا ہے که وہ جادو سیکھنے والوں کو منع کیوں کرتے تھے که تم مت سیکھو اور کافر مت بنو - یعنی برا کام کرنے والے مت بنو - یه بات کچھ تعجب کی نہیں ہے - جادو سے اپنے خیال میں نقصان پہنچانا - خواہ فی الحقیقت اس سے نقصان پہنچتا هو یا نہیں - هر کوئی یہاں تک که جادوگر بھی برا جانتا ہے اور اسی وجه سے وہ سیکھنے والے کو منع کرتے تھے - اس

زمانے میں بھی بہت لوگ ایسے ھیں جوکوئی برا کام جانتے ھیں مگر جب کوئی اُن سے سیکھنا چاھتا ھے تو کہتے ھیں کہ یہ خراب کام ھے کیوں سیکھتے ھو لیکن جب سیکھنے والا اصرار کرتا ھے تو سکھا دیتے ھیں - پس ھاروت اور ماروت کا سیکھنے والوں کو ایسا کہنا ایک عام مجراء طبعی کے موافق تھا -

اسی آیت میں اس بات پر بھی دلیل ھے کہ سحر باطل ھے یعنی سحر کچھ موثر نہیں ھے کیوں کہ خدا تعالیٰ نے فرمایا ھے کہ وہ کسی کو بہ سبب اپنے سحر کے کچھ نقصان پہنچانے والے نہ تھے اور یہ کہنا نص صریح اس بات پر ھے کہ سحر کچھ اثر نہیں رکھتا اور یہی معنی سحر کے باطل ھونے کے ھیں - آگے جو خدا نے فرمایا ھے کہ ''الا باذن اللہ'' اس کے یہ معنی سمجھنا کہ ان کا سحر خدا کے حکم سے اثر کرتا تھا محض غلطی اور نا سمجھی ھے کبھی ایسا بھی ھوتا ھے کہ عامل یا جادوگر کسی کام کے لیے عمل یا جادو پڑھتا ھے اور وہ کام اتفاقیہ اس کی خواھش کے مطابق ھو جاتا ھے اور شبہ پڑتا ھے کہ عمل یا جادو کے اثر سے ھوا ھے اس شبہ کے مٹانے کو خدا نے فرمایا ھے ''الا باذن اللہ'' یعنی ایسی حالت میں جو کام ھو جاتا ھے وہ خدا کے حکم سے ھو جاتا ھے - کچھ جادو یا عمل کے سبب سے نہیں ھوتا -

---

حضرت نحمیا کا قصہ

خدا تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے :

او کالذی مرعلیٰ قریۃ وھی خاویۃ علیٰ عروشھا قال انی یحیی ھذہ اللہ بعد موتھا فاماتہ اللہ مائۃ عام ثم بعثہ، قال کم لبثت قال لبثت یوماً او بعض یوم قال بل لبثت مائۃ عام فانظر الی طعامک و شرابک لم یتسنہ و انظر الی حمارک و لنجعلک آیۃ للناس و انظر الی العظام کیف ننشزھا ثم نکسوھا لحما فلما تبین لہ قال اعلم ان اللہ علی کل شئی قدیر۔

یا (تو نے اس شخص کو نہیں دیکھا یعنی اس کا حال نہیں جانا جس نے رویا میں دیکھا) کہ گویا وہ گذرا ایک شہر پر ایسی حالت میں کہ وہ سر کے بل گرا ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ کیوں کر زندہ کرے گا (یعنی آباد کرے گا) اللہ اس کو اس کے مر جانے کے (یعنی ویران ہونے کے) بعد پھر اللہ نے اس کو سو برس تک مرا ہوا رکھا پھر اس کو اٹھایا خدا نے کہا کہ کتنی دیر تک تو پڑا رہا اس نے کہا کہ میں پڑا رہا ایک دن یا کچھ کم ایک دن کہا بلکہ تو پڑا رہا سو برس پھر دیکھ اپنے کھانے کو اور اپنے پینے کو (کیا) وہ نہیں بگڑا ہے اور دیکھ اپنے گدھے کو (کیا وہ نہیں گل گیا ہے) اور میں چاھتا ہوں کہ تجھ کو ایک نشانی آدمیوں کے لیے بناؤں اور دیکھ ہڈیوں کو کس طرح ہم ان کو حرکت میں

لاتے ہیں ۔ پھر ان کو گوشت پہناتے ہیں پھر جب اس کو یہ بات ظاہر ہوئی اس نے کہا (حالت بیداری میں) میں جانتا ہوں کہ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۔

قبل اس کے کہ اس کی تفسیر بیان کی جاوے لفظ ''کالذی'' میں جو حرف کاف ہے اس پر جو بحث ہے وہ بیان کرنی چاہیے ۔ علمائے نحو میں سے کسائی اور فراء اور ابو علی فارسی کا یہ قول ہے کہ اس سے پہلی آیت میں جہاں فرمایا ہے کہ ''الم تر الی الذی حاج ابراھیم'' وہاں بھی ''الذی'' کی جگہ ''کالذی'' مراد ہے اور پھر اس آیت میں جو ''او کالذی'' آیا ہے اس کا عطف پہلی آیتوں کے معنوں پر ہے نہ لفظ پر ۔ یہ بحث تو صرف سیاق عبارت سے اور ایک نحوی قاعدہ سے متعلق ہے ۔ اس بحث سے یہ مطلب حل نہیں ہوتا کہ ''الذی'' پر کاف تشبیہ لانے سے جو یہ معنی ہو گئے ہیں کہ 'اس شخص کی مانند' تو مانند کے کہنے سے کیا مطلب ہے ۔ اخفش نے اس بحث کو نہایت مختصر کر دیا ہے اور یہ کہا ہے کہ یہاں کاف زائد ہے ۔ مگر کاف زائد کے لانے کی اور اس کے زائد ہونے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی ۔ صاف بات تھی کہ پہلی آیت میں بتایا تھا کہ ''کیا تو نے نہیں دیکھا اس شخص کو جس نے ابراھیم سے جھگڑا کیا'' اور دوسری آیت میں فرمایا کہ ''کیا تو نے نہیں دیکھا اس شخص کو جو ایک قریہ میں گذرا'' پھر دوسری جگہ کاف زائد لانے کی اور مانند اس شخص کے جو ایک قریہ میں گزرا کہنے کی کیا حاجت تھی ۔ مبرد نحوی دوسری آیت میں چند لفظ محذوف مانتا ہے اور اس کا قول ہے کہ تقدیر آیت کی یوں ہے ''والم تر الی من کان الذی مرعلی قریۃ'' یعنی تو نے کیا نہیں دیکھا اس شخص کو جو تھا مثل اس شخص کے جو ایک قریہ پر گذرا ۔ مگر اس سے بھی آیت کا مطلب نہیں کھلتا اور یہی سوال باقی رہتا ہے کہ مثل اس شخص سے کیا مطلب ہے ۔

صاحب بیضاوی نے غالباً ان مشکلات کو خیال کیا ہے اور ایک قول بیان کرنے سے اپنی دانست میں اس مشکل کو حل کیا ہے اور لکھا ہے کہ ''او کالذی مرعلی قریۃ'' حضرت ابراہیم کا قول ہے اور سوال مقدر کا جواب ہے ۔ یعنی جب نمرود نے حضرت ابراہیم سے کہا کہ ''میں زندہ کرتا ہوں'' تو حضرت ابراہیم نے کہا کہ اگر تو زندہ کرتا ہے تو اس طرح زندہ کر جس طرح کہ خدا نے اس شخص کو زندہ کیا تھا جو ایک قریہ پر گذرا تھا ۔ اس تفسیر کے مطابق تقدیر آیت کی یہ ہوتی ہے کہ ''ان کنت تحیی فاحی کاحیاء اللہ الذی مرعلی قریۃ'' نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ لفظ کاف سے اس شخص کی مانند مراد نہیں بلکہ جس طرح وہ زندہ ہوا تھا اس طرح زندہ کرنے کی مانند مراد ہے اور پھر قاضی بیضاوی صاحب فرماتے ہیں کہ وہ شخص جو زندہ ہوا تھا یا تو عزیز تھے یا خضر تھے یا کوئی کافر منکر بعث تھا ۔ عزیز تو نہیں ہو سکتے کیونکہ وہ حضرت ابراہیم کے زمانہ کے بہت بعد ہوئے ہیں اور یہ معلوم نہیں کہ قاضی صاحب نے خضر سے مراد کس سے لی ہے اور یہ واقعہ خضر پر کب گذرا تھا اور نہ یہ معلوم کہ وہ کافر منکر بعث کون تھا ۔ رجماً بالغیب جو کچھ جی میں آیا یا سنا لکھ دیا ۔ راوی کی روایت (گو وہ کیسی ہی صریح البطلان ہو) تفسیروں میں قصوں کے لکھ دینے کو کافی ہے ۔ پس یہ قول حضرت ابراہیم کا کسی طرح نہیں ہو سکتا ۔

اگر قرآن مجید کا ٹھیک ٹھیک ادب کیا جاوے اور اس کو دیو پری کا قصہ نہ قرار دیا جاوے جیسے کہ عجائب پسند مسلمان قرار دیتے ہیں تو آیت کے معنی نہایت صاف ہیں ۔ یہ بات ہر کوئی جانتا ہے کہ کاف حرف تشبیہ کا ہے اور کان بھی اسی کاف تشبیہ سے بنا ہے اور کاف تشبیہ کو بہ سبب کسی ضرورت کے مثلاً بغرض

اهتمام تشبیهہ یا تبدیل سیاق کلام یا کسی اور ضرورت کے مشبہ بہ سے جدا کرکے مقدم کر دینا جائز ہے ۔ مثلاً ''زید کالاسد'' سے جب کاف تشبیہہ کو کسی سبب سے جدا کرکے مقدم کریں تو یوں کہیں گے ''کان زید الاسد'' اس مقام پر بھی 'الذی' مشتبہ نہیں ہے بلکہ اس سے اس شخص کے مرور کی تشبیہہ یا تمثیل مراد ہے پس تقدیر آیت کی یہ ہے کہ ''الم تر الی الذی کانہ مرعلی قریۃ'' یعنی کیا نہیں دیکھا تو نے اس شخص کو جو گویا کہ گذرا تھا ایک قریہ پر ، درحقیقت وہ شخص گذرا نہیں تھا بلکہ اس نے رویا میں دیکھا تھا کہ میں ایک قریہ پر گذرا ہوں جو ویران پڑا ہے اور جو تقدیر آیت کی ہم نے بیان کی ہے اس سے صاف پایا جاتا ہے کہ اس شخص کا حال بیان کیا جاتا ہے جو یہ سمجھا تھا کہ گویا میں ایک قریہ میں گیا ہوں اور اس طرح کا بیان صریح دلالت کرتا ہے کہ وہ رویا کا واقعہ ہے مگر نحوی قاعدہ کے مطابق ''کان'' کا لفظ 'الذی' موصول کے صلہ میں واقع نہیں ہو سکتا ۔ اس ضرورت سے حرف تشبیہہ یعنی لفظ کان کو مقدم لانا پڑتا تھا اور وہ مقدم نہیں ہو سکتا تھا ۔ کیونکہ اس کے اسم و خبر صلہ کے جزو تھے۔ اس لیے حرف کاف جو اصل لفظ تشبیہہ کا تھا وہ اس کی جگہ مقدم کیا گیا ۔

قرآن مجید میں اس شخص کا جس کا رویا یہاں بیان ہوا ہے ذکر نہیں ہے اور نہ اس قریہ کا ذکر ہے جس میں اس شخص نے رویا میں دیکھا تھا ۔ غالباً اس قریہ کے تعین کی ضرورت بھی نہیں کیونکہ اس شخص نے رویا میں دیکھا ہوگا کہ میں ایک قریہ میں گزرا ہوں جو ویران پڑا ہے ۔ البتہ اس شخص کی جس نے یہ رویا دیکھا اس کی تعین کرنی چاہیے ۔ غالباً آں حضرت کے زمانے میں اس شخص کے نام کو ہرکوئی جانتا ہوگا

مگر اب ہمارے پاس اس شخص کا نام متعین کرنے کو بجز روایات اور تاریخی واقعات کے اور کچھ نہیں ہے - تاریخی واقعات سے جہاں تک کہ تحقیق ہو سکتی ہیں اور جن پر اعتماد ہو سکتا ہے اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ شخص حضرت نحمیا نبی تھے -

توریت میں جو واقعات بیت المقدس کی ویرانی کے لکھے ہیں اور جو زمانہ اس کا قرار دیا ہے - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بخت نصر نے ۵۹۰ قبل مسیح میں بیت المقدس کا محاصرہ کیا اور ۵۸۸ قبل مسیح میں بیت المقدس کو فتح کر لیا اور معبد کو جلا دیا اور بیت المقدس کو ویران کر دیا مگر کیخسرو بادشاہ ایران نے غلبہ پا کر یہودیوں کو قید بابل سے آزاد کیا اور ۵۳۶ قبل مسیح کے اُنھوں نے بیت المقدس میں واپس آ کر قربانیاں کیں اُس کے بعد کسی بادشاہ نے یہودیوں کو بیت المقدس کی تعمیر کی اجازت دی اور کسی نے پھر منع کر دیا پھر ۵۱۸ قبل مسیح میں دارا نے بیت المقدس کی تعمیر کی اجازت دے دی. مگر ہامان کی دشمنی سے حرج پڑتا رہا -

۴۶۷ء قبل مسیح کے عزیز پیغمبر بیت المقدس میں گئے اور یہودیوں کی بھلائی کا زمانہ شروع ہوا مگر بیت المقدس اسی طرح جلا ہوا اور ڈھیا ہوا پڑا تھا حضرت نحمیا نبی کو اس کا نہایت رنج تھا اُنھوں نے خدا سے بہت التجا اور دعا کی کہ وہ کسی طرح پھر تعمیر ہو - ایک دفعہ ارتحششتائی بادشاہ کے حضور میں حاضر تھے بادشاہ نے پوچھا کہ تم کیوں رنجیدہ ہو ، اُنھوں نے کہا کہ میں کیوں کر رنجیدہ نہ ہوں کہ وہ شہر جس میں ہمارے بزرگوں کے مزار ہیں ، ویران پڑا ہے اور اس کے دروازے آگ سے جلے پڑے ہیں بادشاہ نے پوچھا کہ پھر تو کیا چاہتا ہے حضرت نحمیا نے کہا کہ آپ مجھ کو وہاں جانے دیں تا کہ میں اس کو

پھر تعمیر کروں ، بادشاہ نے اجازت دی اور ایک میعاد مقرر کی
کہ اس عرصہ میں تعمیر کرکے واپس آ جانا ۔

جب حضرت نحمیا بیت المقدس کی تعمیر میں مصروف تھے تو
ان لوگ پر ھنستے تھے اور کہتے تھے کہ کیا وہ بیت المقدس کو بنا
لیں گے اور اس کے پتھروں کو جو جلے ھوئے اور خاک کے ڈھیروں
کے تلے جمع ھیں نکال لیں گے کتاب نحمیا سے معلوم ھوتا ھے کہ
حضرت نحمیا کو بیت المقدس کی تعمیر کی بڑی فکر تھی اور خدا
کے سامنے ھمیشہ التجا اور دعا کیا کرتے تھے، بلا شبہ اُن کے دل
میں یہ بات گزری ھوگی کہ اس شہر کے مر جانے یعنی ویران ھو
جانے کے بعد کس طرح اللہ تعالیٰ اس کو زندہ یعنی آباد
کرے گا انھیں تردّدات اور خدا سے التجا کرنے کے زمانہ
میں جیسا کہ مقتضائے فطرت انسانی ھے حضرت نحمیا نے
رویا میں دیکھا اور ان کو تسلی ھوئی کہ بیت المقدس آباد اور
تعمیر ھو جائے گا اسی رویا کا ذکر اس آیت میں ھے اور وہ رویا
یہ ھے کہ اُنھوں نے دیکھا کہ میں ایک قریہ میں گیا ھوں جو
بالکل ڈھے گیا ھوا اور ویران پڑا ھے رویا ھی میں اُنھوں نے کہا
کہ اس قریہ کے اس طرح مر جانے یعنی ویران ھو جانے کے
بعد کس طرح خدا اس کو زندہ کرے گا یعنی آباد کرے گا ۔
اسی حالت میں اُنھوں نے دیکھا کہ میں مر گیا ھوں اور پھر جی
اُٹھا ھوں رویا میں اُن سے کسی نے کہا کہ کتنی دیر تک تم
پڑے رھے اُنھوں نے کہا کہ ایک دن یا ایک دن سے کچھ کم
اُس نے کہا کہ تم سو برس تک پڑے رھے اپنے کھانے اور اپنے پینے
کی چیزوں کو دیکھو کہ وہ تو نہیں بگڑیں اور اپنے گدھے کو
دیکھ کہ اس کا کیا حال ھو گیا ھے اور دیکھ کہ پھر اصلی
ھڈیاں کس طرح ھلتی ھیں اور کس طرح اُن کے اُوپر گوشت چڑھتا

ہے اس عجیب رویا سے آن کو تسلی ہوئی کہ بیت المقدس ضرور تعمیر ہو جاوے گا - پس یہی قصہ جو خدا کی قدرت اور حکمت اور عظمت کو جتاتا ہے اس آیت میں بیان ہوا ہے -

ہمارے مفسروں کی عادت ہے کہ سیدھی بات کو بھی ایک عجوبہ بات بنا کر بیان کرتے ہیں اور سنی سنائی باتیں ناتحقیق اور قصے کہانیاں اس میں شامل کر دیتے ہیں اسی طرح اس میں بھی کیا ہے بایں ہمہ جب ان تمام باتوں پر غور کیا جاتا ہے تو جو اصل بات ہے وہ بھی اس میں سے نکل سکتی ہے چناں چہ اس مقام پر بھی جو روایت ابن عباس کے نام سے تفسیر کبیر میں بیان کی ہے آس سے پایا جاتا ہے کہ یہ تمام واقعہ جو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے وہ ایک رویا تھا - اس روایت میں بجائے حضرت نحمیا کے حضرت عزیز کا نام لکھا ہے - ممکن ہے کہ وہ خواب دیکھنے والے حضرت عزیز ہی ہوں مگر تاریخ سے مطابقت کرنے سے حضرت نحمیا کا ہونا زیادہ تر قرین قیاس معلوم ہوتا ہے اسی روایت میں لکھا ہے کہ جب وہ بیت المقدس میں پہونچے تو وہاں انگور اور انجیر پھل رہے تھے - اُنھوں نے انجیر اور انگور کھائے اور انگوروں کو نچوڑ کر شیرہ پیا اور سو رہے اور سونے ہی کی حالت میں خدا تعالیٰ نے ان کو مردہ کر دیا اور سو برس تک مردہ پڑے رہے ان لفظوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ علمائے متقدمین کی بھی یہ رائے تھی کہ یہ واقعہ حالت نوم میں گزرا تھا جس کو ہم نے سیدھی طرح رویا سے تعبیر کیا ہے باقی حصہ جو اس روایت میں لکھا ہے محض بے اصل ہے جس کے لیے کوئی سند نہیں ہے -

قرآن مجید کا سیاق کلام اس طرح پر واقع ہوا ہے کہ جو قصے اس میں بیان کئے گیے ہیں آن کا مقصد بیان کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے - چناں چہ حضرت یوسف کے خواب کا جہاں ذکر ہے

وھاں بھی اسی طرح بیان ھے کہ حضرت یوسف نے اپنے باپ سے کہا کہ میں نے گیارہ ستاروں اور چاند و سورج کو اپنے تئیں سجدہ کرتے دیکھا اور یوں نہین بیان کیا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ چاند اور سورج مجھ کو سجدہ کرتے ھیں - کیوں کہ خواب میں دیکھنا قرینہ مقام علانیہ روشن تھا - اسی طرح اس مقام پر بھی حضرت نحمیا کے خواب کا مقصد بیان کیا گیا ھے اور ''فلما تبین'' کے لفظ سے صاف پایا جاتا ھے کہ وہ تمام واقعات جو اس آیت مین بیان ھوئے ھیں رویا میں واقع ھوئے تھے -

---

حضرت عزیر

(اُن کے ابن اللہ ہونے پر بحث)

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے او قالت الیہود عزیر ن ابن اللہ ، یعنی یہودیوں کا قول ہے کہ ''عزیر خدا کا بیٹا ہے'' ہمارے علمائے مفسرین اس آیت کی تفسیر میں یہ لکھتے ہیں کہ یہودیوں نے توریت مقدس کو ضائع کر دیا تھا یعنی بخت نصر نے جب بیت المقدس کو ویران کیا ہے اور جلایا ہے ۔ اُس وقت ضائع ہو گئی تھی مگر حضرت عزیر کے دعا مانگنے پر اللہ تعالیٰ نے توریت اُن کو یاد کروا دی اور اُنھوں نے اُس کو لکھ دیا ۔ اُس وقت یہودیوں نے کہا کہ یہ بات جو عزیر کو حاصل ہوئی تو بے شک وہ ابن اللہ ہے ۔

اس کے بعد علمائے مفسرین نے یہ بحث کی ہے کہ حضرت عزیر کو ابن اللہ کس نے کہا (۱) عبید ابن عمیر کا یہ قول ہے کہ صرف ایک یہودی نے یہ بات کہی تھی جس کا نام فنحاص بن عازورا تھا اور (۲) سعید بن جبیر اور عکرمہ کا یہ قول ہے کہ ایک جماعت یہودیوں کی تھی جنھوں نے یہ کہا تھا (۳) بعض کا یہ قول ہے کہ یہ مذہب یہودیوں میں رائج تھا مگر پھر اُنھوں نے اُس کو چھوڑ دیا تھا ۔ (۴) تفسیر کشاف میں لکھا ہے کہ جو یہود مدینہ میں رہتے تھے اُن میں سے چند آدمیوں کا یہ مذہب تھا ۔ کل یہودیوں کا یہ مذہب نہیں تھا ۔

یہ سب اقوال ہمارے علمائے مفسرین کے ہیں مگر یہودی

اس سے انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہودی عزیر کو کبھی ابن اللہ نہیں کہتے تھے ۔

علمائے مفسرین نے جو کچھ اس کی نسبت بیان کیا مؤرخانہ طریقہ پر اس کا ماخذ تلاش نہیں کیا اور نہ یہودی مذہب کی کسی کتاب کا حوالہ دیا ۔ پس ہم کو علمائے مفسرین کے اقوال کا ماخذ تلاش کرنا ہے اور وہ صرف دو قول ہیں ۔

اول یہ کہ بعد ضائع ہو جانے توریت کے حضرت عزیر پیغمبر نے از سر نو توریت کو لکھا ۔

دوم یہ کہ یہودیوں کے کسی فرقہ نے حضرت عزیر کو ابن اللہ کہا ۔

پہلے قول کی سند ہم یہودی کتابوں سے بیان کرتے ہیں ۔ واضح ہو کہ تین کتابیں ہیں جو حضرت عزیر کی طرف منسوب ہیں ۔ ایک کتاب موسوم یہ کتاب ''عزرا'' ہے جو موجودہ عہد عتیق کی کتابوں میں شامل ہے اور سب لوگ اُس کو صحیح اور معتبر مانتے ہیں ۔ علاوہ اس کے دو کتابیں اور ہیں جو کتاب اول ''عیز ڈراس'' اور کتاب دوم ''عیز ڈراس'' کے نام سے موسوم ہیں ۔ عزرا کا نام یونانی زبان میں ''عیز ڈراس'' کہا جاتا ہے اور جو کہ ان دونوں کتابوں کی نسبت خیال کیا گیا ہے کہ یونانی زبان میں لکھی گئی تھیں اس لیے اُن دونوں کتابوں کو اُسی نام سے موسوم کیا گیا ہے ۔

اُن کتابوں میں سے دوسری کتاب کے چودھویں باب میں یہ ورس ہیں ۔ ''دیکھ اے خدا میں جاؤں گا جیسا کہ تو نے مجھ کو حکم دیا ہے اور جو لوگ موجود ہیں میں اُن کو فہمائش کروں گا لیکن جو لوگ کہ بعد کو پیدا ہوں گے اُن کو کون فہمایش کرے گا ۔ اس طرح دنیا تاریکی مین ہے اور جو لوگ اس میں رہتے ہیں بغیر

روشنی کے ہیں" (ورس ۲۰)

"کیوں کہ تیرا قانون جل گیا ہے۔ پس کوئی نہیں جانتا اُن چیزوں کو جو تو کرتا ہے اور اُن کاموں کو جو شروع ہونے والے ہیں"۔ (ورس ۲۱)

" لیکن اگر مجھ پر تیری مہربانی ہے تو روح القدس کو مجھ میں بھیج اور میں لکھوں گا تمام جو کچھ کہ دنیا میں ابتدا سے ہوا ہے اور جو کچھ تیرے قانون میں لکھا تھا تاکہ لوگ تیری راہ کو پاویں اور وہ لوگ جو اخیر زمانہ میں ہوں گے زندہ رہیں"۔ (ورس ۲۲)

" اور اُس نے مجھ کو یہ جواب دیا کہ جا اپنے راستہ سے لوگوں کو اکٹھا جمع کر اور اُن سے کہہ کہ وہ چالیس دن تک تجھ کو نہ ڈھونڈیں"۔ (ورس ۲۳)

" لیکن دیکھ تو بہت سے صندوق کے تختے تیار کر اور اپنے ساتھ " ساریا" و "دبریا" " سلیمیا" ۔ " اکینیسن" اور " ایشیل" کو لے ۔ ان پانچوں کو جو بہت تیزی سے لکھنے کو تیار ہیں"۔ (ورس ۲۴)

" اور یہاں آ اور میں تیرے دل میں سمجھ کی شمع روشن کروں گا جو کہ نہ بجھے گی تا وقتیکہ وہ چیزیں پوری نہ ہوں جو تو لکھنی شروع کرے گا" (ورس ۲۵)

" اور جب کہ تو پورا کر چکے گا تو بعض چیزوں کو تو مشتہر کرے گا اور بعض چیزوں کو تو خفیہ عقلمندوں کو دکھاوے گا کل اسی وقت تو لکھنا شروع کرے گا"۔ (ورس ۲۶)

" پس میں نے اُن پانچ آدمیوں کو لیا جیسا کہ اُس نے حکم دیا تھا اور میدان میں گئے اور وہاں رہے"۔ (ورس ۳۷)

" اور دوسرے دن دیکھو ایک آواز نے مجھ کو پکارا اور کہا

اے ” عیز ڈراس“ اپنا منہ کھول اور میں جو کچھ پینے کو دیتا ہوں اُس کو پی“۔ (ورس ۳۸)

” تب میں نے اپنا منہ کھولا اور دیکھو اُس نے ایک بھرا ہوا پیالہ میرے منہ تک پہنچایا اور جو کہ مثل پانی کے ایک چیز سے بھرا ہوا تھا لیکن اُس کا رنگ مثل آگ کے تھا“۔ (ورس ۳۹)

” اور میں نے اُس کو لیا اور پیا اور جب میں پی چکا میرے دل میں سمجھ آئی اور میرے سینہ میں عقل پیدا ہوئی کیوں کہ میری روح نے میرے ذہن کی قوت بخشی“۔ (ورس ۴۰)

” اور میرا منہ کھلا اور پھر بند نہ ہوا“۔ (ورس ۴۱)

” خدا اُن پانچ آدمیوں کو بھی سمجھ دی اور اُنھوں نے رات کے عجیب خوابوں کو جو بیان کیے گئے لکھا اور جو اُن کو معلوم نہ تھے اور وہ چالیس دن تک بیٹھے اور اُنھوں نے دن میں لکھا اور رات کو روٹی کھائی“۔ (ورس ۴۲)

” لیکن میں دن کو بولتا تھا اور رات کو اپنی زبان بند نہیں کرتا تھا“۔ (ورس ۴۳)

” چالیس دن میں اُنھوں نے دو سو چار (یا نو سو چار) کتابیں لکھیں“۔ (ورس ۴۴)

” اور ایسا ہوا کہ جب چالیس دن پورے ہو گئے تو خدا بولا اور اُس نے کہا کہ جو تو نے پہلے لکھا ہے اُس کو عام طور سے مشتہر کر ۔ تا کہ لائق اور نالائق سب پڑھیں“ (ورس ۴۵)

لیکن پچھلی ستر جو ہیں اُن کو پوشیدہ رکھ تا کہ تو صرف اُن کو دے سکے جو تیرے لوگوں میں عقل مند ہوں“۔ (ورس ۴۶)

” کیوں کہ اُن میں سمجھ کا چشمہ ہے اور عقل کا ذخیرہ ہے اور علم کی روشنی ہے“۔ (ورس ۴۷)

”اور میں نے ایسا ھی کیا“۔ (ورس ۴۸)

کتاب عزرا جو عہد عتیق میں داخل ھے اور جس کو سب معتبر مانتے ھیں اُس میں لکھا ھے کہ ”این عزرا از بابل بر آمد که او در شریعت موسیٰ که خداوند که خداے اسرائیل داده بود کاتب ماھر بود“۔ (باب ۷ ورس ۶)

”زاں رو که عزرا قلب خود را به خصوص طلبیدن و بجا آوردن شریعت خداوند و به خصوص تعلیم نمودن فرائض و احکام به اسرائیل حاضر کرد“۔ (باب ۷، ورس ۱۰)

جارج سیل صاحب اپنے ترجمہ قرآن کے حاشیہ میں لکھتے ھیں کہ ”یہ رائے کہ عزرا نے نہ صرف کتب خمسہ موسیٰ کو بلکہ عہد عتیق کی اور کتابوں کو بھی خدا کی وحی سے دوبارہ تیار کیا۔ متعدد عیسائی فادرز کی بھی یہی رائے ھے جن کا ذکر ڈاکٹر پریڈیوز نے کیا ھے اور مصنفوں کی بھی یہ رائے ھے۔ لیکن معلوم ھوتا ھے کہ اُن کی اس رائے کی اصل بنا ”عیز ڈراس“ کے باب دوسرے کے ایک حصہ پر ھے۔ ڈاکٹر پریڈیوز نے بیان کیا ھے کہ اُس باب میں عیسائیوں نے عزرا کی طرف به نسبت یہودیوں کے بہت زیادہ باتیں منسوب کی ھیں کیونکہ یہودیوں کا یقین ھے کہ عزرا نے صرف موسیٰ کی کتابوں کا ایک صحیح نسخہ تیار کیا تھا اور اُس پر بہت محنت کرکے اُس کو بہت مکمل کیا تھا۔ اس میں بہت کم شبہ ھے کہ یہ خیال ابتداءً یہودیوں سے شروع ھوا گو اب اُن کی رائے اور ھو“ ھمارے نزدیک یہ سندیں جو ھم نے بیان کیں اُن سے ھمارے مفسرین کے پہلے قول کی تصدیق ھوتی ھے۔

دوسرے قول کی تصدیق کے لیے ھم ”عیز ڈراس“ کی اُس دوسری کتاب سے استدلال کرتے ھیں۔ اُس کے چودھویں باب میں یہ ورس ھیں۔

"اور اب میں (خدا) تجھ سے کہتا ہوں"۔ (ورس ۷)

"کہ تو اپنے دل میں وہ نشانیاں جمع رکھ جو میں نے دکھائی ہیں اور اُن خوابوں کو جو تو نے دیکھے ہیں اور اُن تعبیروں کو جو تو نے سنی ہیں"۔ (ورس ۸)

"کیونکہ تو سب سے علیحدہ کر دیا جاوے گا اور اب سے تو میرے بیٹے کے ساتھ رہے گا اور ایسے لوگوں کے ساتھ جو تیری ہی مانند ہیں یہاں تک کہ زمانہ کا خاتمہ ہو جاوے"۔ (ورس ۹)

یہ ترجمہ جو ہم نے لکھا ہے انگریزی زبان کے ترجمہ کا اُردو ترجمہ ہے ۔ اصل کتاب "عیز ڈراس" موجود نہیں ہے ۔ اگر بیٹے کی ساتھ رہنے سے حضرت عیسیٰ مراد ہوں تو یہ ورس محض مہمل و بے معنی ہو جاتا ہے بلکہ سیاق کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کلمہ کا اطلاق خود حضرت عزرا کی طرف ہے کہ اب سے تو میرا بیٹا رہے گا یعنی مقبول و مقرب ۔

اس کتاب کا عربی زبان میں بھی ترجمہ موجود تھا اور کچھ شبہ نہیں ہو سکتا کہ وہی عربی ترجمہ عرب میں اور بالتخصیص مدینہ میں جہاں کثرت سے یہودی رہتے تھے مروج ہوگا اور نہایت قرین قیاس ہے کہ وہ ترجمہ ایسے لفظوں میں ہوگا جس سے لوگ حضرت عزرا کو ابن اللہ تعبیر کرتے ہوں گے جس طرح کہ عیسائی اسی قسم کے لفظوں کے سبب سے حضرت مسیح کو ابن اللہ تعبیر کرتے ہیں ۔ پس یہ قول ہمارے علماء کا کہ مدینہ کے یہودیوں کا یہ خیال تھا نہایت صحیح اور قرین قیاس معلوم ہوتا ہے ۔

اب ہم کو "عیز ڈراس" کی دوسری کتاب پر جس کے حوالے ہم نے دیے ہیں بحث کرنی باقی ہے ۔ یہ کتاب مجموعہ کتب عہد عتیق میں شامل نہیں ہے اور اُس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ یہ ایک جھوٹی یا نامعتبر کتاب ہے گو کہ اس میں بہت سی باتیں عمدہ اور

صحیح بھی موجود ھیں۔

اس کتاب کے نامعتبر ھونے کی یہ دلیلیں پیش ھوتی ھیں۔
اول : یہ کہ اس کتاب کا کوئی عبری یا یونانی نسخہ نہیں پایا جاتا صرف لیٹن زبان کے چند نسخے اور ایک عبری زبان کا نسخہ ھے۔ مگر ھم نہیں سمجھ سکتے کہ عبری یا یونانی نسخہ کا نہ پایا جانا خصوصاً ایسی حالت میں کہ سب لوگ اُس کا یونانی میں لکھا جانا تسلیم کرتے ھیں اُس کے نـا معتبر ھـونے کی کیوں کر دلیل ھو سکتی ھے۔

دوسری دلیل یہ پیش ھوتی ھے کہ ایسا خیال کیا جاتا ھے کہ ابتدا ھی میں یہ کتاب یونانی زبان میں لکھی گئی تھی جس کا یہ مفاد ھے کہ حضرت عزرا نے نہیں لکھی کیوں کہ اگر وہ لکھتے تو عبری زبان میں لکھتے مگر اُس کا یونانی زبان میں ابتداءً لکھا جانا صرف خیال کیا گیا ھے اور اس کا کچھ ثبوت نہیں ھے۔ علاوہ اس کے بالاتفاق تسلیم کیا گیا ھے کہ حضرت متی کی انجیل در اصل عبری زبان میں لکھی گئی تھی جو اب دنیا میں موجود نہیں ھے اور موجودہ انجیل یونانی زبان کی اُس کا تـرجمہ ھے۔ پس کیا وجہ ھے کہ ''عیز ڈراس'' کی کتاب کے اُس نسخہ کو جس کا یونانی میں لکھا جانا خیال کیا گیا ھے عبری کا ترجمہ نہ تصور کیا جاوے۔

تیسری سب سے بڑی دلیل اس کتاب کی عزرا کی لکھی ھوئی نہ ھونے کی ڈاکٹر گرے کا قول ھے وہ کہتے ھیں کہ ''اس کتاب کے مختلف مقامات کی عبـارت سے معلوم ھوتا ھے کہ وہ اُن مسئلوں اور خیالات اور فقروں کی طرح ھے جو عہد جدید میں پائے جاتے ھیں اور یہ بات کہ ھمارے سیویر یعنی حضرت مسیح کا ذکر اُن کا نام لے کر اس میں بہت صاف الفاظ میں کیا ھے۔ ان سب باتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ھے کہ اگر کل نہیں تو اکثر حصہ اُس کا انجیل کے بعد

لکھا ہوا ہے ۔

جن ورسوں میں ایسے الفاظ ہونے کا خیال کیا گیا ہے وہ مندرجہ ذیل ورسوں میں مذکور ہیں ۔

"اور اس لیے میں تم سے کہتا ہوں اے کفار تم میں سے جو سنتے اور سمجھتے ہیں کہ تم ڈھونڈو اپنے گڈریا کو کہ وہ تم کو ہمیشہ کا آرام دے گا کیوں کہ اب وہ قریب ہے اور دنیا کے آخیر میں آنے والا ہے"۔ (باب ۲ ، ورس ۳۴)

"بادشاہت کے انعام کے لیے تیار رہو کیوں کہ ہمیشہ کی روشنی تم پر چمکنے والی ہے" (باب ۲ ، ورس ۳۵)

"اس دنیا کے سایہ سے بھاگو اور اپنے جلال کی خوشی کو حاصل کرو میں اپنے سیویر کی تصدیق صاف طور سے کرتا ہوں"۔ (باب ۲ ، ورس ۳۶)

عیسائی حضرت عیسیٰ پر سیویر کا لفظ اطلاق کرتے ہیں اور اسی خیال سے ڈاکٹر گرے نے خیال کیا ہے کہ اس سے حضرت عیسیٰ مراد ہیں اور یہ کتاب انجیل کے بعد لکھی گئی ہے ۔ مگر وہ عبری لفظ جس کا ترجمہ سیویر یعنی نجات دھندہ کیا جاتا ہے وہ عہد عتیق میں اشعیاہ نبی کی کتاب باب ۴۳ ورس ۳ و ۱۱ و باب ۴۵ ورس ۲۱ و باب ۴۹ ورس ۲۶ و باب ۶۰ ورس ۱۶ میں آیا ہے اور خدا کی طرف اُس کا اطلاق کیا گیا ہے ۔ پھر یہاں بھی سیویر سے خدا کیوں سمجھا نہیں جاتا ۔

"تب میں نے فرشتہ سے پوچھا کہ یہ جوان شخص کون ہے جو اُن لوگوں کے سروں پر تاج رکھتا ہے اور اُن کے ہاتھ میں شاخیں دیتا ہے"۔ (باب ۲ ، ورس ۴۶)

"پس اُس نے جواب دیا کہ یہ خدا کا بیٹا ہے جس کو اُنھوں نے دنیا میں قبول کیا ہے"۔ (باب ۲ ، ورس ۴۷)

مگر بزرگ اور مقدس آدمی کو خدا کا بیٹا کہنا ایک عام محاورہ کتب عہد عتیق کا ہے - حضرت موسیٰ کی دوسری کتاب یعنی سفر خروج کے چوتھے باب کی بائیسویں آیت میں خدا نے حضرت یعقوب کو اپنا پہلا بیٹا کہا ہے اور وہ آیت یہ ہے : '' و بہ فرعون بگوئے کہ خداوند چنیں می فرماید کہ اسرائیل پسر اول زادۂ من است'' زادہ کا لفظ اصل عبری میں نہیں ہے -

ہوشیع نبی کی کتاب کے پہلے باب کی دسویں آیت میں بنی اسرائیل پر خدا کے بیٹوں کا اطلاق ہوا ہے اور وہ آیت یہ ہے : '' معہذا تعداد بنی اسرائیل مثل ریگ دریا کہ پیمودنی و شمودنی نیست خواهد بود بلکہ واقع می شود در تمامی مقامے کہ بایشاں گفتہ شد کہ شما قوم من نیستید بایشاں گفتہ خواهد شد کہ پسران خدا می آید''۔

'' اور جو شخص کہ مندرجہ بالا برائیوں سے بچے گا وہ میرے عجائبات کو دیکھے گا''۔ (باب ۷ ، ورس ۲۷)

'' کیوں کہ میرا بیٹا جیسس اُن لوگوں کے ساتھ ظاہر ہوگا جو اس کے ساتھ ہوں گے اور جو لوگ باقی رہیں گے وہ چار سو برس کے اندر خوش ہوں گے''۔ (باب ۷ ، ورس ۲۸)

بعد ان برسوں کے میرا بیٹا کرائسٹ مر جاوے گا اور تمام لوگ جو جان رکھتے ہیں وہ بھی''۔ (باب ۷ ، ورس ۲۹)

جیسس اور جیسو اور جوشیو یہ تینوں صورتیں یونانی نام جوشوا اور جیشوا کی ہیں جو مخفف ہے جیہوشوا کا ، مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ اس مقام میں جو جیسس نام ہے ڈاکٹر گرے نے کس دلیل پر اُس کو حضرت مسیح کا نام سمجھا ہے - کیوں کہ اسی عیزڈراس کی پہلی کتاب کے پانچویں باب ورس ۵ میں یہی نام آیا ہے اور یہ وہ شخص ہے جو قید بابل سے چھوٹ کر بنی اسرائیل کے ساتھ

بیت المقدس میں آیا تھا - مذکورہ بالا ورس میں اسی شخص کا نام معلوم ہوتا ہے کیوں کہ لکھا ہے کہ جیسس آن لوگوں کے ساتھ ظاہر ہوگا جو اس کے ساتھ ہوں گے اور اس سے صاف اشارہ آنھیں لوگوں کی طرف ہے جو قید بابل سے چھوٹ کر بیت‌المقدس میں آئے تھے -

اس شخص نے بہت سی نیکی اور خدا پرستی کے کام کیے ہیں جن کا ذکر عیز ڈراس کی پہلی کتاب کے باب ۵ ورس ۸ و ۲۴ و ۴۸ و ۵۶ و ۶۸ و ۷۰ و باب ۶ ورس ۲ و باب ۹ ورس ۱۹ میں مندرج ہے اور آنھیں نیک کاموں کے سبب سے آس کو خدا نے اپنا بیٹا کہا ہے -

مسیح اور کرائسٹ کے ایک ھی معنی ھیں - یہ لفظ ھر ایک کے لیے استعمال ھوتا تھا جس پر ایک خاص رسم میں تیل ملا جاتا تھا (دیکھو سفر لویان باب ۴ ورس ۳ و ۵ و ۱۶) ان ورسوں میں مسیح یا کرائسٹ کا لفظ ھائی پریسٹ کے لیے استعمال ھوا ہے اور بنی اسرائیل کے بادشاھوں کو بھی تیل ملا جاتا تھا اور وہ بھی اس لقب سے بولے جاتے تھے (دیکھو پہلا سموئل باب ۲ ورس ۱۰ و ۳۵ و باب ۱۲ ورس ۳ و ۵ و باب ۱۶ ورس ۶ و باب ۲۴ ورس ۶ و ۱۰ و باب ۲۶ ورس ۹ و ۱۱ و ۲۳ - دوسرا سموئل باب ۱ ورس ۱۴ و ۱۶ و باب ۱۹ ورس ۲۱ و باب ۲۳ ورس ۱) -

یہودیوں میں پریسٹ کو بھی تیل ملا جاتا تھا جس وقت کہ وہ اپنے کام پر مقرر ھوتے تھے (دیکھو پہلی کتاب تواریخ الایام باب ۱۶ ورس ۲۲ و زبور ۱۰۵ ورس ۱۵) پس اس مقام پر کرائسٹ سے وھی جیسس مراد ہے جو قید بابل سے چھوٹ کر بیت‌المقدس میں آیا تھا اور بطور پریسٹ کے آس نے بہت سے کام کیے ھیں -

مسٹر آرنلڈان اخیر دو ورسوں کی نسبت جن میں جیسس

اور کرائسٹ کا لفظ آیا ہے یہ لکھتے ہیں کہ ”اس ورس اور اس کتاب کے اور چند فقروں سے جیسس کرائسٹ کا نام اور اُن کے کام اور موت وغیرہ کا حال صاف صاف معلوم ہوتا ہے اور یہ بات ناممکن ہے کہ کسی یہودی نے جس نے اس کتاب کو تسلیم کر لیا ہو وہ عیسائی نہ ہو گیا ہو“ مگر میں کہتا ہوں کہ یہ بات نا ممکن ہے کہ کسی یہودی نے جس نے اس کتاب کو تسلیم کر لیا ہو اُن لفظوں کے وہ معنی سمجھے ہوں جو مسٹر آرنلڈ نے سمجھے ہیں۔

اُس کے بعد مسٹر آرنلڈ لکھتے ہیں ”کہ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ کتاب ہمارے سیویر یعنی حضرت مسیح کے تھوڑے زمانہ بعد لکھی گئی ہو گی اور جس کے حالات اور جس کے حواریوں کی تحریرات سے مصنف نے چند فقرے لکھے ہیں“ اگرچہ ہم نے تشریح کر دی ہے کہ اُن ورسوں کے وہ معنی نہیں ہو سکتے جو عیسائی مصنف سمجھتے ہیں لیکن اگر ہم اُن کے اس قول کو تسلیم کر لیں کہ یہ کتاب حضرت مسیح کے تھوڑے زمانہ بعد لکھی گئی تھی تو بھی یہ بات تسلیم کرنی ضرور ہوگی کہ قبل نزول قران مجید کے یہ کتاب تحریر ہو چکی تھی اور جو کہ اُس میں متعدد جگہ انسانوں کو ابن اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے ، اس واسطے یہودیوں کا بعضا فرقہ حضرت عزیر کو ابن اللہ کہتا ہوگا جیسا کہ ہمارے مفسروں نے لکھا ہے کہ مدینہ کے یہودیوں کا یہ اعتقاد تھا چناں چہ سعید ابن جبیر اور عکرمہ نے روایت کی ہے کہ سلام بن مشکم اور نعمان بن ادنی اور مالک ابن صیف جو مدینہ کے یہودی تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے کہ ہم کیوں کر تمھاری تابعداری کریں تم نے تو ہمارا قبلہ چھوڑ دیا ہے اور عزیر کو ابن اللہ بھی نہیں سمجھتے۔ اس میں

کچھ شک نہیں کہ شام کے یہودیوں کا یہ اعتقاد نہیں تھا اور اسی وجہ سے وہ لوگ اس بات سے کہ وہ عزیر کو ابن اللہ سمجھتے تھے ہمیشہ انکار کرتے رہے ہیں مگر اُن کے انکار کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ کوئی فرقہ بھی اس اعتقاد کا نہ تھا اگر اس وقت عیسائیوں سے پوچھو تو سب عیسائی اس بات سے کہ وہ حضرت مریم کو بھی خدا سمجھتے تھے انکار کریں گے حالاں کہ چوتھی صدی کے اخیر میں عیسائیوں میں ایک فرقہ پیدا ہوا تھا جو کولی ری ڈینس پکارا جاتا تھا - موشیم اکلیزیاسٹکل ہسٹری صفحہ ۱۰۰ میں لکھا ہے کہ اُن لوگوں نے باپ اور بیٹے (یعنی خدا اور حضرت مسیح) کے سوا حضرت مریم کو بھی خدا مانا تھا یہ فرقہ چند روز رہا اور مدت سے معدوم ہو گیا - اسی طرح یہودیوں کا بھی ایک خاص فرقہ تھا جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے اور اب وہ معدوم ہے -

مسلمان عالموں کی دلیل کہ قرآن مجید علانیہ مدنیہ میں پڑھا جاتا تھا اور آیت ''وقالت الیھود عزیر ن ابن اللہ'' سب یہودی سنتے تھے اگر اُن کا یہ اعتقاد نہ ہوتا تو ضرور الزام دیتے کچھ کم مضبوط نہیں ہے -

حضرت عیسیٰ کی پیدائش

اور

وفات کا مسئلہ

حضرت عیسیٰ کی نسبت جو امور قرآن مجید میں مذکور ہیں۔ وہ بلا شبہ نہایت غور کے لائق ہیں اُن میں سے ہم اس مقام پر صرف حضرت عیسیٰ کی ولادت اور وفات پر بحث کریں گے ۔ ان کے متعلق باقی باتیں دوسرے مضمون میں علیحدہ بیان کی جائیں گی ۔

عیسائی اور مسلمان دونوں خیال کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ صرف خدا کے حکم سے عام انسانی پیدائش کے برخلاف بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے ۔ اگر ایسا ہی ہونا فرض کیا جاوے تو اول اس بات پر غور کرنی ہوگی کہ بن باپ کے پیدا کرنے میں حکمت الٰہی کیا ہو سکتی ہے ۔ ایسے واقعات جو خلاف عادت یا مافوق الفطرت تسلیم کیے جاتے ہیں اُن سے یا تو قدرت کاملہ پروردگار کا اظہار مقصود ہونا چاہیے یا ان کا وقوع بطور معجزہ مانا جاوے جب کہ خداوند تعالیٰ اقسام حیوانات کو بغیر تولد و تناسل کے عادۃً پیدا پیدا کرتا رہتا ہے اور خود انسان کو بھی بلکہ تمام حیوانات کو ابتداءً اس نے اسی طرح پیدا کیا ہے ۔ یا یوں کہو کہ آدم کو بے ماں و بے باپ کے پیدا کیا تھا تو حضرت عیسیٰ کے صرف بے باپ کے پیدا کرنے میں اس زیادہ قدرت کاملہ کا اظہار نہ تھا ۔ اگر یہ خیال کیا جاوے کہ صرف ماں سے پیدا کرنا دوسری طرح پر اظہار قدرت کاملہ تھا تو یہ بھی صحیح نہیں ہوتا ۔ اس لیے کہ

اظہار قدرت کاملہ کے لیے ایک ابربین اور ایسا ظاہر ہونا چاہیے کہ جس میں کسی کو شبہ نہ رہے ۔ بن باپ کے مولود کا ہونا ایک ایسا امر مخفی ہے جس کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اظہار قدرت کاملہ کے لیے کیا گیا ہے ۔

بطریق اعجاز حضرت عیسیٰ کے بن باپ کے پیدا ہونے پر معجزہ کا بھی اطلاق نہیں ہو سکتا ۔ معجزہ بمقابلہ منکران نبوت صادر ہوتا ہے قبل ولادت حضرت مسیح بلکہ ادعائے نبوت یا الوہیت کوئی شخص منکر نہیں ہو سکتا تھا ۔ پھر معجزہ کیوں کر کہا جا سکتا ہے ۔ معہذا اگر وہ معجزہ ہوتا تو حضرت مریم کا معجزہ ہوتا نہ حضرت مسیح کا ۔ علاوہ اس کے جب کہ ان کی ولادت ٹھیک اسی طرح پر واقع ہوئی تھی جس طرح کہ عموماً بچوں کی ہوتی ہے کہ نو مہینے تک حمل میں رہے اور بر وقت ولادت حضرت مریم پر وہ تمام حالات طاری ہوئے ۔ جو عموماً عورتوں پر بچہ پیدا ہونے میں طاری ہوتے ہیں تو کسی طرح اعجازاً ان کے پیدا ہونے کا کسی کو احتمال بھی نہیں ہو سکتا تھا ۔

عیسائی حضرت مسیح کے بن باپ کے پیدا ہونے کو ایک اور حکمت الٰہی پر منسوب کر سکتے ہیں کہ وہ گنہگار انسان کی آمیزش سے پاک اور بے گناہ ہوں تا کہ گنہگار انسانوں کی طرف سے فدیہ کیے جاویں ۔ مگر جب ماں کی شرکت سے وہ بری نہ تھے تو انسانی آمیزش سے پاک نہیں ہو سکتے تھے ۔ لاطینی کلیسائی کونسل ٹرینٹ میں تسلیم کیا کہ حضرت مریم بھی بن باپ کے پیدا ہوئی تھیں ۔ اگر یہ بھی مانا جاوے تو وہ بھی ماں کی شرکت سے بری نہ تھیں ۔ انجام کار عیسائی کہہ سکتے ہیں کہ خدا نے حضرت مریم کو انسانی خاصیت یعنی گنہگار ہونے کی قابلیت سے اس لیے پاک کر دیا تھا کہ آن سے فدیہ ہونے کے لائق مولود پیدا ہو تو خدا اس طرح

حضرت عیسٰی کے باپ کو بھی پاک کر سکتا تھا اور بِن باپ کے پیدا کرنے میں کوئی خاص حکمت نہیں ہو سکتی تھی -

ابتداء میں عیسائیوں کو یہ خیال نہیں تھا کہ حضرت عیسٰی بِن باپ کے پیدا ہوئے ہیں یا بِن باپ کے پیدا ہوں گے - کیونکہ مسیح کی نسبت یقین کیا جاتا تھا کہ وہ داؤد کی نسل سے ہوں گے - یہودیوں نے حضرت عیسیٰ کو مسیح موعود نہیں مانا مگر جنھوں نے آن کو مسیح موعود مانا اور عیسائی یا نصاریٰ کہلائے ان سب کو کامل یقین تھا کہ وہ حضرّت داؤد کی اولاد میں ہیں - چنانچہ انجیل متی میں لکھا ہے ”یسوع مسیح ابن داؤد ابن ابراہیم“ اور لوک انجیل کے باب ۱ ورس ۲۷ اور متی کی انجیل باب ۱ ورس ۴۰ سے پایا جاتا ہے کہ یوسف حضرت مریم کا شوہر داؤد کی نسل سے تھا - مسلمان بھی قرآن کی رو سے جیسے کہ سورۃ انعام میں لکھا ہے حضرت عیسٰی کو حضرت ابراہیم کی ذریت یعنی اولاد سمجھتے ہیں - پس اگر حضرت عیسٰی بِن باپ کے پیدا ہوئے ہوں تو وہ نسل داؤد یا اولاد ابراہیم سے کیوں کر قرار پا سکتے ہیں -

اگر یہ کہا جاوے کہ ماں کے سبب سے ان کو داؤد کی نسل سے قرار دیا گیا ہے تو یہ بات دو وجہ سے غلط ہے اول اس لیے کہ یہودی شریعت میں عورت کی طرف سے نسب قائم نہیں ہو سکتا دوسرے یہ کہ حضرت مریم کا داؤد کی نسل سے ہونا ثابت نہیں کیتھو سیکلوپیڈیا میں لکھا ہے - ”یوسیبیس جو قدیمی مذہبی مؤرخ ہے گو حضرت عیسٰی کے نام پر اس نے طول طویل بحث کی ہے مگر اس کے بیان سے اور نیز متی اور لوک کی انجیلوں سے مریم کی پیدائش اور نسب پر کوئی نئی روشنی نہیں پڑتی - اپنی جو مریم کی ماں بیان کی گئی ہیں ان کی نسبت جس قدر قصے ہیں وہ محض افسانے ہیں اور ان کا کچھ ثبوت و شہادت نہیں ہے“ - انجیل لوک باب ۱ ورس ۲۶، ۲۷

سے پایا جاتا ہے کہ حضرت مریم حضرت زکریا کی بیوی الیشبع کی رشتہ دار تھیں اور الیشبع ہارون کی بیٹی تھیں - مگر یہ نہ معلوم ہے کہ مریم و الیشبع میں کیا رشتہ تھا اور نہ یہ معلوم ہے کہ ہارون کس کی اولاد میں تھے - قرآن مجید میں حضرت مریم کے باپ کا نام عمران لکھا ہے - اس پر استدلال کرنے سے بھی داؤد کی نسل سے حضرت مریم کا ہونا ثابت نہیں ہو سکتا -

عیسائی مفسر جب کہ حضرت عیسیٰ کے بغیر باپ کے پیدا ہونے کو تسلیم کر کر نسل داؤد سے ثابت کرنے میں عاجز ہوئے - تو اُنھوں نے کہا کہ سینٹ لوک کی انجیل میں جو نسب نامہ یوسف کا لکھا ہے در حقیقت وہ مریم کا نسب نامہ ہے تا کہ مریم کا داؤد کی نسل سے ہونا ثابت کریں - دو انجیلوں میں حضرت عیسیٰؑ کے نسب نامے ہیں - متی کی انجیل میں حضرت عیسیٰؑ کے باپ کا نام یوسفؑ اور اُن کے باپ کا نام یعقوبؑ لکھا ہے اور لوک کی انجیل میں یوسفؑ کے باپ کا نام ہیلی لکھا ہے - پہلا نسب نامہ بذریعہ سلیمان کے داؤد تک پہنچتا ہے اور دوسرا نسب نامہ بذریعہ ناثان کے - یہ دونوں نسب نامے بلا شبہ مختلف ہیں - مگر عیسائی مفسر کہتے ہیں جیسے کہ تفسیر ہنری اسکاٹ میں مندرج ہے کہ یوسف نے ہیلی کی دختر سے یعنی حضرت مریم سے شادی کی تھی اور شاید اس نے یوسف کو متبنیٰ بھی کیا تھا اور یوسف ہیلی کا بیٹا کہلاتا تھا اور یہودیوں میں رواج تھا کہ نسب ناموں میں صرف مردوں کا نام لکھتے تھے نہ عورتوں کا - اس لیے سینٹ لوک نے اس نسب نامہ میں جو در حقیقت مریم کا ہے بجائے مریم کے یوسف کا نام لکھ دیا ہے -

اس بیان پر بعض عیسائی علماء نے یہ اعتراض کیا ہے کہ یہ نسب نامہ داؤد تک بذریعہ ناثان کے پہنچتا ہے اور حضرت مسیح کا

بذریعہ سلیمان کے داؤد کی نسل میں ہونا چاہیے اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ کہیں نہیں لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ سلیمان کی اولاد میں ہونے والے تھے بلکہ صرف یہ بیان ہوا ہے کہ وہ داؤد کے بیٹے اوریشی کی نسل سے ہوں گے اور سلیمان بطور ایک عمدہ نمونہ حضرت مسیح کے بیان ہوئے ہیں۔

اگر یہ بات فرض بھی کر لی جائے کہ اس پچھلے نسب نامے میں بجائے حضرت مریم کے یوسف کا نام لکھا گیا ہے اور یہ بھی فرض کر لیا جاوے کہ یوسف ہیلی کے متبنیٰ اور داماد تھے اور یہ بھی فرض کیا جاوے کہ حضرت عیسیٰ کا سلیمان کے ذریعہ سے داؤد کی اولاد میں ہونا کچھ ضرور نہ تھا تو بھی اس بات کا جواب نہیں ہو سکتا کہ یہودی شریعت میں ماں کی طرف سے نسب نہ معتبر گنا جاتا تھا اور نہ بیان کیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ عورتوں کا نام بھی نسب ناموں میں داخل نہ ہوتا تھا۔ پس حضرت عیسیٰ مسیح کی نسبت جو جو پیشین گوئی تھی کہ وہ داؤد کی نسل میں سے ہوں گے کسی طرح ماں کی طرف منسوب نہیں ہو سکتی بلکہ بموجب اس پیشین گوئی کے ضرور ہے کہ حضرت عیسیٰ مسیح ایسے باپ کی اولاد ہوں جو داؤد کی نسل سے ہو۔

پادری رچارڈ واٹسن نے تفسیر انجیل لوک میں لکھا ہے کہ ”یہ عام یقین تھا کہ حضرت عیسیٰ یوسف کے بیٹے ہیں اور اُن کا معجزہ کے طور سے پیدا ہونا مشہور نہیں کیا گیا تھا بلکہ یوسف اور مریم کے دلوں ہی میں مخفی تھا۔ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ بات کب پہلے پہل ظاہر کی گئی۔ چوں کہ انجیل کے حالات میں اس پر کچھ اشارہ نہیں پایا جاتا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات حواریوں کو بھی ظاہر نہیں کی گئی تھی۔ اس لیے وہ اور نیز اور بھی اُن کو یوسف اور مریم کا بیٹا سمجھتے تھے اور یہ امر منجملہ ان امور کے

تھا جن کو مریم نے خدا کی ہدایت سے حضرت عیسیٰ کے مردوں سے جی اٹھنے کے بعد تک اپنے دل میں چھپا رکھا ۔ اگر پیش تر سے یہ بات مشہور ہو جاتی تو حضرت عیسیٰ کی تبلیغ رسالت کے بعد لوگ اکثر حضرت مریم کو تنگ کیا کرتے اور اہانت کی باتیں اُن سے پوچھا کرتے اور جب کہ اس قدر اختلاف رائے عیسیٰ کی نسبت اُن کے دشمنوں میں ہوتا تو مریم کو خطرہ پہنچنے کا اندیشہ تھا ۔ کم سے کم یہ ہوتا کہ وہ بہت دقت و تکلیف میں مبتلا ہو جاتیں ۔ ان امور کے لحاظ سے ظن قوی ہوتا ہے کہ یہ بات حضرت عیسیٰ کی زندگی بھر کسی کو معلوم نہیں ہوئی تھی مگر سینٹ لوک کے اس فقرہ سے کہ ، جیسا کہ وہ یوسف کا بیٹا خیال کیا جاتا تھا یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بعد عروج مسیح یہ امر منجملہ اُن باتوں کے تھا جو پہلے پہل معلوم ہو گئی تھیں اور بغیر کسی شبہ کے وہ مان لیا گیا تھا اور اسی وجہ سے یہ بات انجیل متی اور انجیل لوک میں داخل ہوئی ہے'' ۔

اس بات کو خود حواری حضرت عیسیٰ کے اور تمام عیسائی تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت مریم کا خطبہ یوسف سے ہوا تھا ۔ یہودیوں کے ہاں خطبہ کا یہ دستور تھا جیسے کہ کیٹو سیکلو پیڈیا میں لکھا ہے کہ شوہر اور زوجہ میں اقرار ہو جاتا تھا کہ اس قدر معیاد کے بعد شادی کریں گے ۔ یہ اقرار یا تو ایک باقاعدہ تحریر یا معاہدہ کے ذریعہ سے گواہوں کی موجودگی میں ہوتا تھا جس طرح کہ ہم مسلمانوں کے ہاں نکاح کا خط لکھا جاتا ہے یا بغیر تحریر کے اس طرح پر ہوتا تھا کہ مرد عورت کو گواہوں کے سامنے ایک ٹکڑا چاندی کا دے دیتا تھا اور یہ لفظ کہتا تھا کہ یہ چاندی کا ٹکڑا اس امر کی کفالت میں قبول کر کہ اتنے دنوں بعد تو میری زوجہ ہو جاوے گی ۔

یہ معاھدے حقیقت میں عقد نکاح تھے - صرف زوجہ کا گھر میں لانا باقی رہ جاتا تھا اور وہ اس میعاد پر ہوتا تھا جو اس معاھدہ میں قرار پاتی تھی - اس کی مثال بالکل ایسی ھے جیسی کہ مسلمانوں میں فاتحہ خیر ہوتی ھے جو در حقیقت ایک شرعی نکاح ھے لیکن زوجہ فی‌الفور گھر میں نہیں لائی جاتی یا جیسے کہ اب بھی بعض دفعہ مسلمانوں میں نکاح بہ تحریر نکاح خط عمل میں آتا ھے اور زوجہ کا شوھر کے گھر بھیجنا کسی آئندہ وقت پر ملتوی رھتا ھے -

یہودیوں کے ھاں اس رسم کے ادا ھونے کے بعد مرد اور عورت باھم شوھر اور زوجہ ھو جاتے تھے اور بجز اس کے کہ زوجہ اپنے شوھر کے گھر رھنے کو اس مدت کے بعد بھیج دی جاوے اور کوئی ایسی رسم جس پر جواز تزوج منحصر ھو عمل میں نہیں آتی تھی یہاں تک کہ اگر بعد اس رسم کے اور قبل رخصت کرنے کے اُن دونوں سے اولاد پیدا ھو تو وہ ناجائز اولاد تصور نہیں ھوتی تھی بلکہ بے گناہ شرعی اولاد جائز تصور ھوتی تھی - شاید خلاف رسم بات ھونے سے معیوب گنی جاتی ھوگی اور دونوں کو ایک شرم اور خجالت کا باعث ھوتی ھوگی -

امر مذکورہ کا ثبوت کیٹو سیکلوپیڈیا سے بھی ظاھر ھوتا ھے اس میں لکھا ھے کہ "جب یہ معاھدہ شادی کا یہودیوں میں ھو جاتا تھا تو زن و مرد ایک دوسرے کو دیکھنے کے مجاز ھوتے تھے - جس کی اُن کو پہلے اجازت نہیں ھوتی تھی - اُسی کتاب میں لکھا ھے کہ ایک نسبت شدہ باکرہ کے بطن سے خدا نے اپنے بیٹے کے پیدا ھونے میں یہ حکمتیں رکھی تھیں - اول - یہ کہ اُن پر غیر مشروع اولاد ھونے کا طعنہ عاید نہ ھو - دوم - یہ کہ ان کے والدین موافق یہودی شریعت کے سزا کے مستوجب نہ ھوں - سوم -

یہ کہ یوسف کے نسب نامہ سے جن کی رشتہ دار مریم تھیں۔ مریم کا نسب نامہ ظاہر ہو جاوے۔ چہارم۔ یہ کہ حضرت مسیح کا ایام طفولیت میں کوئی مربی اور سر پرست ہو۔ ان تمام بیانات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہودیوں میں اس طرح نسبت کے بعد اولاد کا پیدا ہونا شرعاً ناجائز نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہودیوں نے نعوذ باللہ حضرت مریم پر جو بہتان باندھا تھا وہ یوسف کے ساتھ نہیں باندھا تھا بلکہ پنتھرا تالی کے ساتھ منسوب کیا تھا۔ کیوں کہ یوسف ان کے شرعی شوہر ہو چکے تھے پس کوئی وجہ اس بات کے خیال کرنے کی نہیں ہے کہ یوسف فی‌الواقع مسیح کے باپ نہ تھے۔ متی کی انجیل میں جو یہ لکھا ہے کہ یوسف نے جب یہ دیکھا کہ مریم حاملہ ہیں تو اُن کے چھوڑ دینے کا ارادہ کیا۔ اگر یہ بیان تسلیم کیا جاوے تو اس کا سبب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ عام رسم کے بر خلاف حاملہ ہو جانے سے یوسف کو رنج و خجالت ہوئی ہوگی جس کے سبب سے ایسا خیال ہوا ہوگا، مگر جو کہ فی‌الحقیقت وہ پاک حمل تھا اور جو کچھ حضرت مریم کے پیٹ میں تھا وہ روح القدس اور کلمۃ اللہ تھا۔ یوسف نے خواہ خود ہی خواہ اپنے خواب کی تائید پر جس کا ذکر سینٹ متی کی انجیل میں ہے وہ خیال چھوڑ دیا۔

اگرچہ ان چاروں مروج انجیلوں کے زمانہ تالیف میں نہایت اختلاف ہے مگر جو زمانہ کہ علمائے عیسائی نے قریب صحت کے تسلیم کیا ہے اس کی رو سے پایا جاتا ہے کہ متی کی انجیل حضرت عیسیٰ کے بعد دوسرے یا تیسرے سال میں اور لوک کی انجیل اکتیسویں یا بتیسویں سال میں اور یوحنا کی انجیل تریسٹھویں یا چونسٹھویں سال اور مارک کی انجیل اس کے بھی بہت دنوں بعد تحریر ہوئی تھی۔ مگر متی کی نسبت بخوبی ثابت ہے کہ وہ دراصل

عبرانی میں لکھی گئی اور موجودہ یونانی انجیل اس کا ترجمہ ہے۔ جس کے مترجم کا نام اور زمانہ ترجمہ اب تک تحقیق نہیں ہوا۔ پس متی کی موجودہ یونانی انجیل بھی قدیم نہیں ہے بلکہ اخیر زمانہ کی لکھی ہوئی ہے۔

یہ تمام انجیلیں اور حواریوں کے نامے اور اعمال جو ان انجیلوں کے آخیر میں شامل ہیں یونانی زبان میں لکھے گئے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کتابیں عیسائی مذہب کو ان ملکوں میں رواج دینے کے لیے لکھی گئی تھیں جہاں یونانی زبان مروج تھی اور جہاں کے لوگ زیادہ تر یونانیوں کے سے خیالات رکھتے تھے۔

یونانیوں میں ایک عام خیال تھا کہ نہایت مقدس اور بزرگ شخص کو خدا کا بیٹا کہتے تھے۔ ھرکیولیس، ڈیاس کوری، رامیولس، فیثا غورث، افلاطون۔ ان سب کو یونانی خدا کا بیٹا کہتے تھے اور افلاطون کے حمل کے قصہ کو قصۂ حمل مثل حضرت عیسیٰ بیان کرتے تھے۔ غرض کہ جب حواریوں کو یونانی زبان کے ذریعے سے دین عیسوی کا پھیلانا مدنظر ہوا تو حضرت عیسیٰ کو ایسے بزرگ لقب سے ملقب کرنا پڑا ہوگا جو اُن لوگوں کے خیالات سے مناسب تھا۔ جن کے لیے وہ انجیلیں لکھی گئی تھیں۔ اس لیے ہمارے نزدیک وہ انجیلیں حضرت عیسیٰ کی ولادت کی نسبت اُن خالص خیالات کے ظاہر ہونے کا ذریعہ نہیں ہو سکتیں جو حضرت عیسیٰ کے زمانہ میں اور ان انجیلوں کے تحریر ہونے سے پیشتر تھا۔ بایں ھمہ ہم انھی انجیلوں میں متعدد جگہ پاتے ہیں کہ یوسف کو حضرت مریم کا شوھر اور حضرت مسیح کو ان کے باپ یوسف کا بیٹا تسلیم کیا ہے۔

انجیل متی باب ۱ ورس ۱۶ میں لکھا ہے کہ یوسف مریم کا شوھر تھا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ متی کی انجیل میں حضرت عیسیٰ

کے نسب نامہ میں اوروں کی نسبت یونانی لفظ 'اجن نسی' بیائے معروف استعمال ہوا ہے جس سے خاص باپ کا بیٹا ہونا پایا جاتا ہے اور حضرت عیسیٰ کی نسبت یونانی لفظ ''جناں'' آیا ہے۔ جس سے اس ورس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ''یعقوب سے پیدا ہوا یوسف شوہر مریم جس سے عیسیٰ پیدا ہوا مگر ویطسطین نے یونانی زبان کی سند پر ثابت کیا ہے'' کہ ''جناں'' کا لفظ بھی ماں اور باپ دونوں سے پیدا ہونے پر بولا جاتا ہے۔ معہذا اس تغیر کا سبب وہی خیالات ہیں جو یونانیوں میں مذہب عیسوی پھیلانے کی بناء پر پیدا ہوئے تھے۔

لوک کی انجیل باب ۲ ورس ۳۳ کے موجودہ نسخوں میں یہ لفظ ہیں ''تب یوسف اور اس کی ماں'' مگر اس مقام پر بھی اسی خیال سے تعبیر کیا ہے۔ ڈاکٹر کریسباخ کی صحیح اور مقابلہ کرکے چھاپی ہوئی انجیل مطبوعہ لیپسک ۱۸۰۵ء اور سنڈروف کی چھاپی ہوئی انجیل مطبوعہ ۱۸۴۹ء اور رومن ولگٹ کے ترجمہ انگریزی میں یوسف کا نام نہیں ہے بلکہ ''اس کا باپ اور اس کی ماں'' لکھا ہے اور ٹروٹوپ نے یونانی انجیل کی شرح میں اس کی تصیح کی ہے جس سے یوسف کا پدر مسیح ہونا تسلیم ہوتا ہے۔ لوک کی انجیل کے اسی باب کے ۴۳ ورس میں بھی قدیم نسخے الگزنڈر یانوس میں بھی 'گوینس' کا لفظ ہے جس کے معنی والدین کے ہیں۔

لوک کی انجیل باب ۲ ورس ۴۸ میں حضرت مریم نے حضرت عیسیٰ سے کہا کہ ''دیکھ تیرا باپ اور میں غگمین ہوکر تجھے ڈھونڈتے تھے''۔

لوک انجیل باب ۲ ورس ۲۷ و ۴۱ میں یوسف اور مریم کو حضرت عیسیٰ کا ماں باپ کہہ کر تعبیر کیا ہے۔

متی کی انجیل باب ۱۳ ورس ۵۵ میں لکھا ہے کہ لوگوں نے

حضرت عیسیٰ کی نسبت کہا کہ ”کیا یہ بڑھی کا بیٹا نہیں - کیا اس کی ماں مریم نہیں کہلاتی“۔

اور انجیل یوحنا باب ۶ ورس ۴۲ میں ہے کہ لوگوں نے حضرت مسیح کی نسبت یہ کہا کہ ”کیا یہ یسوع یوسف کا بیٹا جس کے ماں باپ کو ہم پہچانتے ہیں، نہیں ہے“۔

انجیل یوحنا باب ۱ ورس ۴۵ میں لکھا ہے کہ ”فلپ نے انتھنئیل کو کہا کہ جس کا ذکر موسیٰ نے توریت میں اور نبیوں نے کیا ہے ہم نے اسے پایا ہے وہ یوسف کا بیٹا یسوع ناصری ہے“۔

اعمال حوارئین باب ۲ ورس ۳۰ میں پطرس حواری نے حضرت عیسیٰ کے داؤد کی نسل میں ہونے کی نسبت کہا ہے کہ ”خدا نے اس سے (یعنی داؤد سے) قسم کرکے کہا کہ میں تیرے تخت پر بیٹھنے کے لیے جسم کے طور پر تیری کمر سے مسیح کو پیدا کروں گا“۔

سینٹ پال نے اپنے خط موسومہ رومیاں باب ۱ ورس ۴ میں لکھا ہے کہ ”وہ مسیح جسم کے حق میں داؤد کے تخم سے ہوا پر روح قدس کے حق میں جی اٹھنے کی قوی دلیل سے خدا کا بیٹا ثابت ہوا“۔

ان تمام سندوں سے ثابت ہے کہ حضرت مسیح کے زمانے کے سب لوگ اور خود حواری بھی جانتے تھے اور یقین کرتے تھے کہ حضرت عیسیٰ اپنے باپ یوسف کے تخم سے پیدا ہوئے ہیں نہ کہ بغیر باپ کے - مگر وہ حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا روحانی اعتبار سے کہتے تھے اسی خیال سے جس سے کہ یونانی اپنے ہاں کے بزرگوں کو خدا بیٹا کہتے تھے اور اس بات کو نہایت صفائی سے سینٹ پال نے اپنے خط کی مذکورہ آیت میں بیان کیا ہے - زمانہ کے گزرنے پر وہ خیال جس سے کہ حواریوں نے حضرت عیسیٰ کو خدا کا

بیٹا کہنا محو ہو گیا اور لوگ حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا سمجھنے لگے اور اسی کے ساتھ یہ قرار دیا کہ وہ بے باپ کے پیدا ہوئے تھے اور ان کی ضد سے یہودیوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ نعوذ باللہ وہ ناجائز طور پر پیدا ہوئے تھے ۔ اور یہ اتہام سلس نے جو تیسری صدی میں تھا ، کیا تھا اور ظاہراً یہ وہ زمانہ ہے کہ جب عیسائیوں کو اس بات میں کہ حضرت عیسیٰ خدا کے بیٹے ہیں اور بن باپ کے پیدا ہوئے ہیں زیادہ تر غلو ہو گیا تھا ۔

قرآن مجید نے اس بات میں کہ حضرت عیسیٰ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے کچھ بحث نہیں کی جب قرآن نازل ہوا اس وقت دو فرقے مخالف موجود تھے ۔ ایک فرقہ نہایت نالائقی اور بدی سے یہ کہتا تھا کہ حضرت مسیح بطور ناجائز مولود کے پیدا ہوئے ہیں ۔ دوسرا فرقہ یہ کہتا تھا کہ وہ خدا اور خدا کے بیٹے اور ثالث ثلاثہ ہیں ۔ قرآن مجید نے ان دونوں فرقوں کے اعتقاد کو رد کر دیا اور حضرت مسیح کے مقدس اور روح پاک ہونے پر اور حضرت مریم کی عصمت و طہارت پر گواہی دی اور اس بات کو کہ وہ خدا یا خدا کے بیٹے اور ثالث ثلاثہ میں جھٹلا دیا ۔ اور بتلا دیا کہ وہ مثل اور انسانوں کے خدا کے بندے ہیں ۔ قرآن مجید میں یہ کہیں نہیں بیان ہوا کہ وہ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے ۔ جہاں تک کہ اشارہ ہے حضرت عیسیٰ کے روح القدس اور کلمۃ اللہ ہونے کا اور حضرت مریم کی عصمت اور طہارت کا اشارہ ہے ۔ جیسا کہ ہم آگے بیان کرتے ہیں ۔ ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ جو شخص حضرت مریم کی نسبت تہمت بد لگاوے وہ مسلمان نہیں ہے ۔

سورہ آل عمران میں ہے کہ جب فرشتوں نے کہا کہ اے مریم بے شک اللہ تجھ کو خوش خبری دیتا ہے ایک کلمہ کی اپنی طرف سے اس کا نام (ہوگا) مسیح عیسیٰ مریم کا بیٹا رویت دار دنیا

میں اور آخرت میں اور (خدا کے) مقربوں سے اور کلام کرے گا لوگوں کے گہوارہ میں (یعنی بچپنے میں) اور بڑھاپے میں اور ہوگا نیکوں میں سے - مریم نے کہا اے پروردگار کہاں سے ہوگا میرے بیٹا اور نہیں چھوا ہے مجھ کو کسی آدمی نے - خدا نے ہی کہا ہوگا اللہ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے جب کہ کوئی کام کرنا ٹھہرا چکتا ہے تو اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اس کو کہتا ہے کہ ہو پھر ہو جاتا ہے - اور سورۃ مریم میں ہے کہ پھر ہم نے بھیجا اس کے (یعنی مریم کے پاس اپنی روح کو پھر وہ بن گئی اس کے لیے ٹھیک آدمی ، مریم نے کہا کہ بے شک میں تجھ سے خدا کی پناہ مانگتی ہوں اگر تو (خدا سے) ڈرتا ہے اس نے کہا کہ میں تو صرف تیرے خدا کا بھیجا ہوا ہوں تا کہ تجھ کو پاکیزہ لڑکا دوں - مریم نے کہا کہ کہاں سے ہوگا میرے لڑکا اور نہیں چھوا ہے مجھ کو کسی آدمی نے اور نہ میں بدکار ہوں - اس نے کہا یہی ہوگا تیرے پروردگار نے کہا ہے کہ وہ مجھ پر آسان ہے اور ہم اس کو لوگوں کے لیے نشانی اور اپنی رحمت کرنا چاہتے ہیں اور تھی یہ بات ٹھہر چکی -

فرشتہ کا حضرت مریم کو بیٹا ہونے کی بشارت دینا اور ان کا یہ کہنا کہ مجھے مرد نے نہیں چھوا ہے سینٹ لوک کی انجیل میں بھی مذکور ہے تمام یہودی یقین رکھتے تھے کہ ان میں ایک مسیح پیدا ہونے والا ہے جو یہودیوں کی بادشاہت کو پھر قائم کرے گا اس لیے یہودی اور یہودی عورتیں بیٹا ہونے کی نہایت آرزو رکھتی تھیں اور دعائیں مانگتی تھیں اور عبادتیں کرتی تھیں کہ وہ شخص ہمارا ہی بیٹا ہو - ایسی حالتوں میں ان کا اس قسم کی خوابوں کا دیکھنا یا بن بولنے والے کی آوازوں کا سننا یا متخیلہ میں کسی مجسم شے کا دکھلائی دینا ایسا امر ہے جو بمقتضائے فطرت انسانی واقع ہوتا ہے - بعض علماء کا یہ قول ہے کہ اس سورۃ میں جو خطاب فرشتوں کا

حضرت مریم سے ہے وہ بطریق الہام اور روع فی النفث اور القا فی القلب کے ہے مگر مجھ کو کچھ شبہ نہیں جیسے کہ سیاق کلام سے پایا جاتا ہے ۔ کہ امر بشارت جو اس صورت میں اور سورۂ مریم میں بیان ہوا ہے وہ ایک ہی واقعہ ہے ۔ اور رویا میں واقع ہوا تھا اور سینٹ متی کی انجیل سے بھی ایسا ہی مستنبط ہوتا ہے کیوں کہ بموجب اس انجیل کے یوسف کو بھی اس حمل کی خبر خواب میں بذریعہ فرشتہ دی گئی تھی ۔

بیٹا ہونے کی بشارت حضرت اسحاق کو اور ان کی بیوی کو اور حضرت زکریا کو بھی دی گئی تھی ۔ صرف بشارت سے تو بے باپ کے پیدا ہونا لازم نہیں آتا ہے ۔ ہاں ان بشارتوں پر غور کرنا چاہیے کہ ان میں کوئی ایسا لفظ تو نہیں ہے جس سے بن باپ کے پیدا ہونے کا اشارہ نکلے ، سو ایسا بھی کوئی لفظ ان بشارتوں میں نہیں ہے ۔

سب سے زیادہ غور کے لائق لفظ " لم یمسسنی بشر ولم اک بغیا " ہے ۔ بلا شبہ یہ دونوں کلمے نہایت صحیح ہیں اور جس زمانہ میں بشارت ہوئی اس زمانہ میں بلا شبہ حضرت مریم کو کسی مرد نے نہیں چھوا تھا ۔ بلکہ غالباً ان کا خطبہ بھی یوسف کے ساتھ نہ ہوا تھا مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کے بعد بھی یہ واقع نہیں ہوا ۔

جس طرح کہ حضرت مریم کو اس بشارت سے تعجب ہوا ۔ اسی طرح حضرت اسحاق اور ان کی بیوی اور حضرت زکریا کو بھی تعجب ہوا تھا ۔ جب کہ وہ فرمانے لگیں : "یا ویلتیٰ الد وانا عجوز و ھذا بعلی شیخا ان ھذا لشئی عجیب " اور دوسری جگہ فرمایا ہے ۔ " فاقبلت امرتہ فی صرۃ فصکت وجھھا و قالت عجوز عقیم " اور حضرت زکریا نے فرمایا ۔ " انی

یکون لی غلام و قد یلغنی الکبر و امراتی عاقر'' اور دوسری جگه فرمایا ہے ۔ ''وکانت امرتی عاقراً و قد بلغت من الکبر عتیا'' حضرت مریم کی حالت اولاد ہونے سے مایوسی کی نه تھی اور اسحاق اور ان کی بیوی اور زکریا اور ان کی بیوی کی حالت مایوسی کے قریب تھی ۔ مگر جب ان دونوں سے بیٹے کا پیدا ہونا بغیر باپ کے تسلیم نہیں کیا گیا تو حضرت مریم کے تعجب سے جو صرف اس وقت کی کیفیت پر تھا جب که بشارت ہوئی تھی ۔ نه آئنده کی ہونے والی حالت پر ، کیوں کر حضرت عیسیٰ کے بے باپ کے پیدا ہونے پر استدلال ہو سکتا ہے اور کیا عجب ہے که اس خواب کے بعد ہی حضرت مریم کو اور ان کے مربیوں کو حضرت مریم کی شادی کرنے کا خیال پیدا ہوا ہو جو آخرکار یوسف کے ساتھ عقد ہونے سے پورا ہوا ۔

اس تعجب کے بعد فرشتے نے حضرت مریم سے کہا که ''کذالک الله یخلق ما یشاء'' اسی طرح حضرت زکریا سے کہا تھا ''کذالک الله یفعل ما یشاء'' حضرت مریم سے کہا که '' قال کذالک قال ربک و ہو علی ہین'' اسی طرح حضرت زکریا سے کہا که ''قال کذالک قال ربک و ہو علی ہین '' لفظ جو سورۃ آل عمران میں ہے وہ کسی امر کے ہونے پر بلا اسباب '' کن فیکون'' قدرتی و فطرتی کے دلالت نہیں کرتا کیوں که ہر شے کے ہونے کو خدا اسی طرح فرماتا ہے ''اذا اراد شیئاً انما یقول له کن فیکون '' پس ہر شے ''کن'' کے حکم سے ہمیشه قانون قدرت اور قاعده فطرت کے مطابق ہوتی ہے ۔ پس یه الفاظ کسی طرح اس بات پر که حضرت مسیح کی ولادت فی الفور بلا قاعده فطرت اور بغیر باپ کے ہوئی تھی ، دلالت نہیں کرتے ۔

'' آیة للناس'' کے لفظ سے یه سمجھنا که حضرت مسیح

کو بغیر باپ کے بطور ایک نشانی معجزہ کے پیدا کیا تھا محض بے جا ہے ۔ اس لیے کہ بے باپ کے پیدا ہونا (اگر بالفرض ہوا بھی ہو) ایسا امر مخفی ہے جو کسی طرح ''آیۃ للناس'' نہیں ہو سکتا ۔ آیتہ کا لفظ قرآن مجید میں فرعون ، اصحاب کہف والرقیم ، قوم نوح، نوح اور اصحاب سفینہ پر بھی اطلاق ہوا ہے ۔ حضرت مریم بوجہ اپنی عبادت اور خدا پرستی اور نیکی کے اور حضرت عیسیٰ بہ سبب اس رحم دلی کے جو انجیل سے پائی جاتی ہے ، خدا کی عمدہ نشانی کے لقب کے مستحق تھے ۔

''بکلمۃ منه'' کے لفظ یا ''کلمۃ القاھا الی مریم'' کے الفاظ بھی کسی طرح بن باپ کے پیدا ہونے پر دلالت نہیں کرتے ۔ خدا تعالیٰ نے قرآن مجید میں متعدد جگہ لفظ ''کلمہ'' کو اپنی طرف منسوب کیا ہے ۔ سورۂ اعراف میں فرمایا ہے ''و تمت کلمۃ ربک الحسنی علی بنی اسرائیل'' اور سورۂ یونس میں فرمایا ہے ''و کذا لک حقت کلمۃ ربک علی الذین فسقوا'' اسی طرح اور بہت سی جگہ آیا ہے اور کلمۃاللہ سے وہ امور محققہ مراد ہیں جو ہونے والے تھے اور ہوئے اور ہوں گے ۔ حضرت مسیح کا حضرت مریم سے پیدا ہوناایک امر محقق اور معین تھا یا یوں کہو کہ موعود تھا پس اسی امر محقق یا موعود کو کلمہ کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے اور جس طرح تمام قرآن میں کلمہ کو اپنی طرف منسوب کیا ہے اسی طرح اس مقام پر بھی کیا ہے ان الفاظ سے بن باپ کے پیدا ہونے پر کچھ بھی اشارہ نہیں نکلتا ۔

سورۃ النساء میں جہاں خدا تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کی نسبت فرمایا ہے کہ ''کلمۃ القاھا الٰی مریم'' وہاں یہ بھی فرمایا ہے ''و روح منه'' اس لفظ سے بھی بن باپ کے پیدا ہونا نہیں ثابت ہوتا ۔ تمام جان داروں کی نسبت کیا حیوان اور کیا انسان ''روح منه'' کا لفظ اطلاق کیا جا سکتا ہے ۔ سوائے اس کے اور کسی معنی

میں حضرت عیسیٰ کی نسبت اس لفظ کا اطلاق نہیں ہو سکتا ۔ خصوصاً مسلمانوں کے مذہب کے مطابق جو خدا کے یا خدا کی روح کے یا خدا کے کلمہ کے مجسم ہونے کے قائل نہیں ہیں اور اس کو "لم یلد و لم یولد" جانتے ہیں معہذا چند علمائے مفسرین نے بھی جیسا کہ تفسیر کبیر میں لکھا ہے "روح منہ" قریباً قریباً ویسے ہی معنی مراد لیے ہیں جو ہم نے بیان کیے ہیں ۔

اس میں لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ لوگوں کے لیے دینی زندگی کا سبب تھے ۔ اس لیے ان کو روح سے تعبیر کیا ہے ۔ خدا نے قرآن کی صفت میں فرمایا ہے "کذالک او حینا الیک روحا من امرنا" اسی طرح حضرت عیسیٰ کو بھی روح کہا گیا ہے ۔ اور روح کے لفظ سے آن کی بزرگی بھی ظاہر ہوتی ہے جیسے کہ کہتے ہیں کہ یہ تو خدا کی نعمت ہے اور اس سے صرف اس نعمت کا بزرگ اور کامل ہونا مراد ہوتا ہے ۔

اور یہ بھی لکھا ہے کہ روح سے رحمت مراد ہے ۔ اس آیت کی تفسیر میں "و ایدھم بروح منہ" کہا ہے "ای برحمۃ منہ" اور جب کہ حضرت عیسیٰ خلق کے لیے رحمت تھے تو آن کی نسبت "روحا منہ" کا اطلاق کیا گیا ہے ۔ سورہ مجادلہ میں تمام ایمان والوں کی نسبت کہا گیا ہے "اولئک کتب فی قلوبھم الایمان و ایدھم بروح منہ" ۔ پھر حضرت عیسیٰ کی نسبت ایسے الفاظ کا استعمال کسی طرح اس بات کی طرف اشارہ نہیں کرتا کہ وہ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے ۔

سورۃ مریم میں جو الفاظ وارد ہوئے ہیں آن پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ آن سے بن باپ کے پیدا ہونے کا اشارہ پایا جاتا ہے ۔ مگر یہ بھی صحیح نہیں ہے ۔ سورۂ مریم میں حضرت مریم کے رویا کا واقعہ بیان ہوا ہے کہ انھوں نے انسان کی صورت

دیکھی جس نے کہا کہ " میں خدا کا بھیجا ہوا ہوں تا کہ تم کو بیٹا دوں ۔ اس کے بعد جو کچھ بیان ہوا ہے اس پر (ف) تعقیب کی آئی جیسے کہ " فحملته فا جاءها المخاض" مگر اس ف سے اتصال زمانی مستنبط نہیں ہو سکتا ۔ جیسے کہ مثال مذکورہ بالا سے ظاہر ہے ۔ کیوں کہ ان کے حاملہ ہونے اور دردزہ شروع ہونے میں اتصال زمانی نہ تھا ۔ لوک کی انجیل میں بھی لکھا ہے کہ " جب مریم کے جننے کے دن پورے ہوئے وہ اپنا پہلوتا بیٹا جنی" ۔ تفسیر کبیر میں بھی مدت حمل نو مہینے یا آٹھ مہینے یا سات مہینے لکھے ہیں ۔ ابن عباس کی روایت نو مہینے کی ہے جو صحیح معلوم ہوتی ہے ۔ غرض کہ اس مقام پر جہاں ف آئی ہے اس سے ہر جگہ خواہ نخواہ اتصال زمانی مستنبط نہیں ہو سکتا ہے ۔

اس بات کے سمجھنے کے بعد آیات سورۂ مریم پر غور کرنا چاہیے کہ جب حضرت مریم نے اپنے رویا میں انسان کو دیکھا تو انھوں نے کہا "انی اعوذ الرحمٰن منک ان کنت تقیا" اس نے کہا " انما انا رسول ربک لاھب لک غلاما زکیا" حضرت مریم نے کہا " ان یکون لی غلام و لم یمسنی بشر و لم اک بغیا" اس نے کہا "کذالک قال ربک ھو علی ھین و لنجعله آیة للناس و رحمة منا و کان امرا مقضیا" اس کے بعد ہے ۔ "فحملته" پس اس حرف ف سے جو فحملته پر ہے یہ لازم نہیں آتا کہ بمجرد اس گفتگو کے حضرت مریم حاملہ ہو گئی تھیں بلکہ پایا جاتا ہے کہ اس گفتگو کے کسی زمانہ ما بعد میں وہ حاملہ ہوئیں ۔ جس وقت کی یہ گفتگو ہے بلاشبہ حضرت مریم کو کسی بشر نے نہیں چھوا تھا ۔ لیکن اس کے بعد ان کا خطبہ یوسف سے ہوا اور وہ حسب قانون فطرت انسانی اپنے شوہر یوسف سے حاملہ ہوئیں ۔

اسی طرح ”فاتت بہ قومہا تحملہ“ کی فے کا حال ہے کہ وہ ولادت کے زمانے سے متصل نہیں ہے بلکہ امر مذکورہ ولادت کے بعد کسی زمانہ میں واقع ہوا ہے ۔ تفسیر ابن عباس میں لکھا ہے کہ ولادت کے چالیس دن بعد یہ واقع ہوا ہے اور تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ یہ واقعہ یعنی قوم کے پاس لانے کا اور حضرت عیسیٰ کے کلام کرنے کا ۔ حضرت عیسیٰ کی صغر سنی میں واقع ہوا تھا اور ابوالقاسم بلخی کا قول ہے کہ حضرت عیسیٰ جوان ہونے کے قریب تھے جب یہ واقعہ ہوا تھا چناں چہ تفسیر کبیر کی یہ عبارت ہے ”اختلف الناس فیہ فالجمہور علی انہ قال ہذا الکلام حال صغرہ، و قال ابوالقاسم البلخی انہ کما قال ذالک حین کان کالمراق الذی یفہم و ان لم یبلغ حدالتکلیف“ (تفسیر کبیر) غرض کہ علمائے مفسرین بھی تسلیم کرتے ہیں کہ تکلم حضرت عیسیٰ ولادت کے متصل نہ تھا ۔

قرآن مجید سے صاف پایا جاتا ہے کہ یہ واقعہ ایسے وقت میں واقع ہوا تھا جب حضرت عیسیٰ نبی ہو چکے تھے ۔ کیوں کہ آپ نے فرمایا ہے ۔ کہ ”انی عبداللہ اتانی الکتاب و جعلنی نبینا“ تاریخ پر اور انجیلوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کی بارہ برس کی عمر تھی (دیکھو انجیل لوک باب ۲) جب انھوں نے بیت المقدس میں یہودی عالموں سے گفتگو کی ۔ اسی بات پر یہودی عالم ناراض ہوئے اور انھوں نے آ کر حضرت مریم سے کہا کہ تیرے ماں باپ تو بڑے نیک تھے تو نے یہ کیسا عجیب یعنی بد مذہب لڑکا جنا ہے ۔ حضرت مریم نے خود اس کا جواب نہیں دیا اور حضرت عیسیٰ کو اٹھا لائیں ۔ اس وقت انھوں نے فرمایا کہ ”انی عبداللہ اتانی الکتاب وجعلنی نبینا“

اور ممکن ہے کہ یہ واقعہ اُس کے بھی بعد ہوا ہو - یعنی جب کہ حضرت یحیٰی شہید ہو چکے تھے اور حضرت عیسیٰ نے یہودیوں کو سمجھانا اور اور ان کی بدیوں کو وعظ میں برا کہنا شروع کر دیا تھا -

غرض کہ اس قدر تو جملہ علمائے مفسرین تسلیم کرتے ھیں کہ یہ واقعہ ولادت کے زمانہ کے متصل واقع نہیں ہوا تھا اس کے بعد ہوا - کوئی مدت ما بعد کے زمانہ کی چالیس دن اور کوئی قریب عمر مراھق یعنی بارہ برس کی قرار دیتا ہے اور ہم باستدلال قرآن مجید زمانہ نبوت قرار دیتے ھیں -

قرآن مجید سے ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت عیسیٰ نے ایسی عمر میں جس میں حسب فطرت انسانی کوئی بچہ کلام نہیں کرتا کلام کیا تھا - قرآن مجید کے یہ لفظ ھیں ''کیف نکلم من کان فی المھد صبیا'' اس میں لفظ ''کان'' کا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک ایسے سے ہم کیوں کر کلام کریں جو مہد میں تھا یعنی کم عمر لڑکا ہماری گفتگو کے لائق نہیں - یہ اسی طرح کا محاورہ ہے جیسے کہ ہمارے محاورہ میں ایک بڑا شخص ایک کم عمر لڑکے کی نسبت کہے کہ کہ ابھی ہونٹ پر سے تو اس کے دودھ بھی نہیں سوکھا کیا یہ ہم سے مباحثہ کے لائق ہے ''کان'' کا لفظ دلالت کرتا ہے کہ اُس وقت وہ نہ مہد میں تھے نہ مہد کے لائق تھے اور اس کے بعد کی آیت سے اس مراد کی اور بھی تائید ہوتی ہے اور بالفرض حضرت عیسیٰ نے اگر مہد میں کلام بھی کیا ہو تو اس سے ان کے بن باپ کے پیدا ہونے پر کیوں کر استدلال ہو سکتا ہے -

یہودیوں کے اس قول سے بھی کہ ''یا مریم لقد جئت شیاً'' فرمایا ''اخت ھارون ما کان ابوک امر سوء و ما کان امک بغیا'' حضرت عیسیٰ کے بن باپ کے پیدا ہونے پر استدلال نہیں

ھو سکتا ۔ اس لیے کہ اس زمانہ میں جب کہ یہودیوں نے حضرت مریم سے یہ بات کہی کوئی بھی حضرت مریم پر بدکاری کی تہمت نہیں کرتا تھا اور نہ اس آیت میں اس قسم کی تہمت کا اشارہ ھے ' فری' کے معنی بدیع و عجیب کے ھیں ۔ اس لفظ سے غالباً یہودیوں نے مراد لی ھوگی ''شیأ عظیما منکرا'' ۔ مگر اس سے یہ بات کہ انھوں نے اُس وقت حضرت عیسیٰ کی نسبت نا جائز مولود ھونے کی تہمت کی تھی لازم نہیں آتی ۔ بلکہ قرینہ اس کے بر خلاف ھے کیوں کہ حضرت عیسیٰ نے اس کے جواب میں اس تہمت سے بری ھونے کا کوئی لفظ بھی نہیں کہا ۔ اگر اس وقت یہودیوں کی مراد اُس سے تہمت بد نسبت حضرت مریم کے اور نا جائز مولود ھونے کی نسبت حضرت عیسیٰ کے ھوتی تو ضرور حضرت عیسیٰ اپنے جواب میں اپنی اور اپنی ماں کی بریت اُس تہمت سے ظاھر کرتے ۔

صاف ظاھر ھے کہ حضرت عیسیٰ کی تلقین سے جو خلاف عقائد یہود تھی علمائے یہود ناراض ھو کر حضرت مریم کے پاس آئے جس سے اُن کی غرض یہ ھوگی کہ وہ حضرت عیسیٰ کو اُن باتوں سے باز رکھیں اور کہا کہ تیرا باپ اور تیری ماں تو بڑے نیک تھے تو نے یہ کیسا عجیب بچہ جنا ھے جو تمام عقائد کے برخلاف باتیں کرتا ھے ۔ حضرت مریم نے کہا کہ اُسی سے پوچھو ۔ اس پر یہودیوں نے کہا کہ وہ کل کا بچہ ھمارے منہ لگنے کے لائق نہیں ۔ اُس پر حضرت مریم حضرت عیسیٰ کو اُٹھا لائیں اور انھوں نے کہا کہ میں خدا کا نبی ھوں ۔ یہ ایسا معاملہ ھے جو فطرت انسانی کے موافق واقع ھوا اور اب بھی واقع ھوتا ھے ۔ شوخ و شریر لڑکے کی ماں سے اُس کی شکایت کی جاتی ھے ۔ جو شوخی کہ اس نے کی ھو اس کی نسبت اس کی ماں کہتی ھے کہ

اسی سے پوچھو - پس ان الفاظ سے جو قرآن مجید میں ھیں حضرت عیسیٰ کے بن باپ کے پیدا ھونے پر کسی طرح استدلال نہیں ھو سکتا - آٹھا لانے کا لفظ اس مقام پر مجازاً بولا گیا ھے - اس سے خواہ نخواہ گود میں آٹھا لانا لازم نہیں آتا -

سورۃ انبیاء میں حضرت مریم کی نسبت خدا نے فرمایا ھے " والتی احصنت فرجھا فنفخنا فیھا من روحنا و جعلناھا وابنھا آیۃ للعالمین " اس سے بھی حضرت عیسیٰ کا بن باپ کے پیدا ھونا ثابت نہیں ھوتا - اول تو کوئی مسلمان خدا کی روح کے مجسم ھونے پر اعتقاد نہیں کر سکتا - " احصنت فرجھا " کے یہ معنی نہیں کہ "احصنت فرجھا من کل رجل" - بلکہ یہ معنی ھیں کہ " احصنت فرجھا من غیر زوجھا" - چناں چہ تفسیر کبیر میں لکھا ھے " احصنت اے عن الفواحش لانھا قذفت باالزنا " اس کی نظیر خود قرآن میں موجود ھے - تفسیر کبیر میں لکھا ھے کہ حصان کے معنی عفیفہ عورت کے ھیں اور اس کی مثال میں حضرت مریم کی نسبت جو لفظ " احصنت فرجھا " کا آیا ھے وھی لکھا ھے - پس صاف ظاھر ھے کہ اس لفظ سے حضرت مریم کا تہمت بد سے بری ھونا نکلتا ھے نہ حضرت عیسیٰ کا بن باپ کے پیدا ھونا محصنات کے معنی عفاف کے اور جگہ بھی قرآن میں آتے ھیں جیسے کہ "محصنات غیر مسافحات" "محصنین غیر مصافحین" اور شوھر دار عورت کے بھی آئے ھیں جیسے کہ " والمحصنات من النساء " تفسیر کبیر میں لکھا ھے "یقال امرۃ محصنۃ اذا کانت ذات زوج " پس حضرت مریم کی نسبت احصنت کا لفظ زیادہ تر صاحب زوج ھونے پر دلالت کرتا ھے -

نفخ روح حضرت عیسیٰ میں کچھ دلیل ان کے بن باپ ھونے نہیں ھو سکتی - تمام انسانوں کی نسبت خدا تعالیٰ نے نفخ روح

کہا ہے جیسے کہ سورۂ تنزیل میں فرمایا ہے - ''خلق الانسان من طین ثم جعل نسله من سلالة من ماء مهین ثم سواه و نفخ فیه من روحه'' پس جس طرح کہ اور انسانوں میں اللہ اپنی روح نفخ کرتا ہے اسی طرح حضرت عیسیٰ میں بھی کی تھی -

سورۃ آل عمران میں ہے '' ان مثل عیسیٰ عند اللہ کمثل آدم خلقه من تراب ثم قال له کن فیکون'' اس آیت سے بھی حضرت عیسیٰ کا بن باپ کے پیدا ہونا ثابت نہیں ہوتا ، مفسرین نے لکھا ہے کہ وفد نجران جب آنحضرت صلی اللہ علیه وسلم کے پاس آیا اور جو حضرت عیسیٰ کے ابن اللہ ہونے پر یہ دلیل لاتے تھے کہ وہ بن باپ کے پیدا ہوئے ہیں اس لیے خدا کے بیٹے ہیں ، اس دلیل کے رد کرنے کو یہ آیت نازل ہوئی - اگر یہ روایت صحیح مانی جاوے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیه وسلم نے حضرت عیسیٰ کا بن باپ کے پیدا ہونا تسلیم کر لیا ہو کیوں کہ یہ دلیل بہ طور دلیل الزامی کے ہے - دلیل الزامی میں اس سے بحث نہیں ہوتی کہ جو مقدمہ مخالف نے قائم کیا ہے وہ صحیح ہے یا غلط - بلکہ اس کے مقابلہ میں ایک اور مقدمہ مسلمہ پیش کیا جاتا ہے جس سے مخالف کی دلیل باطل ہو جاتی ہے - پس اس مقام پر دلیل الزامی اس طرح قائم ہوتی ہے کہ اگر بالفرض تم بوجه بن باپ کے پیدا ہونے کے حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا مانتے ہو تو حضرت آدم کو جو بن ماں باپ کے پیدا ہوئے ہیں بدرجه اولیٰ خدا کا بیٹا ماننا چاہیے اور جب کہ تم حضرت آدم کو خدا کا بیٹا نہیں مانتے تو حضرت عیسیٰ کو صرف بن باپ کے پیدا ہونے سے کیوں خدا کا بیٹا مانتے ہو -

معہذا اگر لفظ مثل سے حضرت آدم اور حضرت عیسیٰ میں مماثلت مراد ہے تو وہ مماثلت دونوں کی خلقت میں تو نہیں

ہو سکتی ۔ کیوں کہ حضرت آدم مٹی سے یا پانی سے پیدا ہوئے تھے اور نہ وہ نو مہینے کسی عورت کے پیٹ میں رہے اور نہ مثل ایسے انسانوں کے جو نطفہ سے پیدا ہوتے ہیں اُن کا حالت نطفہ سے جنین ہونے تک نشو و نما ہوا ۔ بر خلاف حضرت عیسیٰ کے ۔ پس حضرت عیسیٰ اور حضرت آدم کی پیدائش میں تو کسی طرح مماثلت نہیں ہو سکتی اور اگر یہ کہا جاوے کہ صرف باپ نہ ہونے میں مماثلت ہے تو یہ بھی نہیں ہو سکتا ۔ اس لیے کہ اول یہ بات ثابت ہونی چاہیے کہ حضرت عیسیٰ بِن باپ کے پیدا ہوئے تھے جب یہ بات ثابت ہو جاوے تو بِن باپ پیدا ہونے میں مماثلت کا دعویٰ ہو سکتا ہے ۔ حالاں کہ ان کا بے باپ کے پیدا ہونا ابھی تکِ ثابت نہیں ہے پس اگر مماثلت ہے تو یا تو نفخ روح میں ہے کہ حضرت آدم کی نسبت بھی کہا ہے کہ "نفخت فیہ من روحی" اور حضرت عیسیٰ کی نسبت کہا ہے "فنفخنا فیہ من روحنا" اور یا صرف مخلوق ہونے میں ہے کہ جس طرح حضرت آدم خدا کے بندے اور مخلوق تھے اسی طرح حضرت عیسیٰ بھی خدا کے بندے اور مخلوق ہیں اور اس کی تائید قرآن مجید سے ہوتی ہے جہاں خدا نے فرمایا ہے "لن یستنکف المسیح ان یکون عبد اللہ" پس کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس آیت سے حضرت مسیح کے بن باپ پیدا ہونے پر استدلال کیا جاوے ۔

بعضے لوگ کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں ہر جگہ حضرت عیسیٰ کو ابن مریم کہا گیا ہے ۔ اگر ان کے کوئی باپ ہوتا تو ان کی ابنیت باپ کی طرف منسوب کی جاتی نہ ماں کی طرف ۔ مگر یہ دلیل نہایت بودی ہے ۔ کیوں کہ جب قرآن نازل ہوا تو حضرت عیسیٰ یہود اور نصاریٰ دونوں میں ابن مریم کے لقب سے مشہور تھے ۔ وہی مشہور لقب اُن کا قرآن میں بھی

بیان کیا گیا ھے اس سے ان کا بے باپ کے پیدا ھونا ثابت نہیں ھوتا۔

حضرت مسیح کے واقعات میں جیسے کہ آپ کی ولادت کا مسئلہ بحث طلب ھے ویسا ھی آپ کی وفات کا مسئلہ بھی غور کے لائق ھے۔ یہودی یقین رکھتے ھیں کہ انھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب پر چڑھا کر قتل کر ڈالا۔ عیسائی یقین رکھتے ھیں کہ یہودیوں نے ان کو صلیب پر چڑھایا اور وہ صلیب ھی پر مر گئے پھر صلیب پر سے اُتار کر قبر میں دفن کیا پھر وہ جی اُٹھے۔۔ جمہور مسلمین کا یہ اعتقاد ھے کہ وہ صلیب پر چڑھائے ھی نہیں گئے۔ اصل بات یہ ھے کہ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ پر الحاد کا اور یہودی شریعت کے مسائل مقررہ سے پھر جانے کا الزام لگایا تھا۔ انجیل یوحنا کے ساتویں باب کی بارھویں آیت میں لکھا ھے کہ ”لوگوں میں اس کی (یعنی حضرت عیسیٰ کی) بابت بہت تکرار تھی۔ بعضے کہتے تھے کہ وہ نیک ھے اور کتنے کہتے تھے کہ نہیں بلکہ وہ لوگوں کو گمراہ کرتا ھے اور اسی انجیل کے باب ۲۶ آیت ۶۵ میں لکھا ھے کہ سردار امام نے اپنے کپڑے پھاڑ کر کہا کہ یہ (یعنی حضرت عیسیٰ) کفر کہہ چکا ھے اب ھم کو اور گواھوں کی کیا درکار ھے دیکھو اب تم نے اس کا کفر بکنا سنا“۔

یہودی شریعت میں جیسے کہ توریت کی کتاب احبار باب ۲۴ ورس ۱۴ و کتاب استثناء باب ۱۳ سے پایا جاتا ھے ارتداد یا الحاد کی سزا سنگسار کرنا تھا۔ مگر اُس زمانہ میں رومیوں کی سلطنت تھی اور وہ یہودی شریعت سے مرتد ھونے کے جرم میں کسی کو سنگسار نہیں کرتے تھے اس لیے یہودیوں نے حضرت عیسیٰ پر بادشاہ وقت سے باغی ھونے کی تہمت لگائی اور پلاط سے کہا کہ

وہ[1] اپنے تئیں یہودیوں کا بادشاہ کہتا ہے ، لوگوں کو ورغلاتا ہے اور قیصر کو خراج دینے سے منع کرتا ہے ، جرم بغاوت کی سزا صلیب پر چڑھا کر مار ڈالنا تھی ۔ اس لیے یہودیوں نے پلاط سے جو وہاں کا حاکم تھا درخواست کی کہ وہ صلیب پر چڑھا دیا جاوے ۔

واقعہ صلیب کے بعد مختلف فرقوں نے مختلف رائیں اس کی نسبت قائم کیں ۔ یہودی اپنی شیخی سے یہ دعویٰ کرتے تھے کہ ہم نے حضرت عیسیٰ کو شریعت کے بموجب پہلے سنگسار کر کے قتل کر ڈالا اور پھر صلیب پر لٹکا دیا ۔ عیسائی سنگسار کر کے مار ڈالنا تو تسلیم نہیں کرتے جو درحقیقت غلط بھی ہے مگر صلیب پر چڑھا کر مار ڈالنا تسلیم کرتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ بعد اس کے حضرت عیسیٰ قبر میں دفن کیے گئے اور پھر مردوں میں سے جی اٹھے اور حواریوں سے ملے اور پھر زندہ آسمان پر چلے گئے اور اپنے باپ یعنی خدا کے دائیں ہاتھ پر جا بیٹھے ۔ بعض قدیم عیسائی فرقے جن کو حضرت عیسیٰ کا صلیب پر چڑھایا جانا بہت ناگوار تھا ۔ حضرت عیسیٰ کے صلیب پر چڑھائے جانے سے قطعاً منکر تھے بعضے کہتے تھے کہ شمعون قرینی صلیب پر چڑھایا گیا اور بعض کہتے تھے کہ یہودائے اسخریوطی ۔ شمعون وہ شخص ہے جو صلیب لے کر چلنے کو بیگار میں پکڑا گیا تھا اور یہودا وہ شخص ہے جس نے مخبری کر کے حضرت عیسیٰ کو پکڑوایا تھا ۔

مسلمان مفسروں کی عادت ہے کہ پرانے قصوں میں بغیر تحقیقات اصلیت کے اور بلاغور کرنے کے مقصد قرآن مجید پر جہاں تک ہو سکتا ہے یہودیوں اور عیسائیوں کی روایتوں کو لے لیتے ہیں ۔ انھوں نے پچھلی روایت کو زیادہ مؤدب سمجھا اور ظاہری الفاظ قرآن مجید

---

۱ ۔ دیکھو انجیل متی باب ۲۲ ورس ۱۶ و باب ۲۷ ورس ۱۱ و ۲۷ و انجیل لوک باب ۱۵ ورس ۲ و ۲۶ و باب ۲۳ ورس ۲ و انجیل یوحنا باب ۱۹ ورس ۱۹ ۔

کو اس کے مناسب پایا - اس لیے انھوں نے پچھلی روایت کو اختیار کیا اور قرآن مجید کے ایک لفظ کی بناء پر جس کو ہم آگے بیان کریں گے یہ قرار دیا کہ شمعون یا یہودا کی صورت بدل کر بعینہ حضرت عیسیٰ کی سی صورت ہو گئی تھی اور یہودیوں نے اس کو حضرت عیسیٰ جان کر صلیب پر چڑھا دیا تھا اور وہ زندہ آسمان پر چلے گئے تھے -

ظاہرا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کے آسمان پر جانے میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے اعتقاد میں چنداں تفاوت نہیں ہے کیونکہ دونوں حضرت عیسیٰ کے زندہ آسمان پر چلے جانے کا اعتقاد رکھتے ہیں ، مگر درحقیقت یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو دونوں مذہبوں میں نہایت مختلف ہے - عیسائی مذہب میں حضرت عیسیٰ کے صلیب پر چڑھائے جانے اور صلیب ہی پر جان دینے کا اعتقاد رکن اعظم ایمان ہے - کیوں کہ ان کے اعتقاد میں انسانوں کی نجات صرف حضرت عیسیٰ کے فدیہ ہونے یعنی صلیب پر جان دینے میں منحصر ہے - جو کوئی اس امر کا اعتقاد نہ کرے وہ موجودہ عیسائی مذہب کے مطابق عیسائی نہیں ہے اور نہ نجات کا مستحق ہے - پس مسلمانوں کا یہ اعتقاد کہ حضرت عیسیٰ بغیر صلیب پر چڑھائے زندہ آسمان پر چلے گئے موجودہ عیسائی مذہب کے بالکل برخلاف ہے -

اس واقعہ پر بحث کرنے سے پہلے ہم کو مناسب ہے کہ صلیب دینے کی نسبت کچھ بیان کریں کہ وہ کیوں کر دی جاتی تھی اور کس طرح اس پر جان نکلتی تھی - جاننا چاہیے کہ صلیب بطور چلیپا کے اس صورت کی ہوتی تھی اس پر چڑھانے کا طریقہ یہ تھا کہ انسان کے دونوں ہاتھ ان لکڑیوں پر جو یمین ویسار

میں ہیں پھیلاتے تھے اور اس کی ہتھیلیوں کو ان لکڑیوں سے ملا کر

آهنی کیلیں ٹھوک دیتے تھے جہاں گول نشان ہے وہاں ایک مضبوط
لکڑی لگی ہوتی تھی جو دونوں ٹانگوں کے بیچ میں رہتی تھی اور
انسان اُس پر لٹک جاتا تھا اس سے یہ غرض تھی کہ انسان بدن
کے بوجھ سے نہ کھسکنے پاوے - پھر دونوں پاؤں کو اُوپر تلے کر
کے اور نیچے کی لمبی لکڑی پر رکھ کر ایک لوہے کی میخ اس
طرح ٹھوکتے تھے کہ دونوں پاؤں کو توڑ کر لکڑی میں نکل جاتی
تھی اور کبھی پاؤں میں میخ نہیں ٹھوکتے تھے بلکہ رسی سے خوب
جکڑ کر باندھ دیتے تھے -

صلیب پر چڑھا دینے سے انسان مر نہیں جاتا کیوں کہ
اس کی صرف هتھیلیاں اور کبھی هتھیلیاں اور پاؤں زخمی ہوتے تھے
اس کے مرنے کا سبب یہ ہوتا تھا کہ چار چار ، پانچ پانچ دن تک
اس کو صلیب پر لٹکائے رکھتے تھے اور ھاتھ پاؤں کے چھیدوں
اور بھوک اور پیاس اور دھوپ کا صدمہ اُٹھاتے اُٹھاتے کئی دن
میں مرتا تھا - چنانچہ اس کی سند طیطوس کی شہادت سے جو کتاب
میطری کان صفحہ ۱۱ میں اور ازیجرس کی شہادت سے جو تفسیر
انجیل متی مطبوعہ گریگارئن صفہ ۶۳ میں مندرج ہے اور ازلسطرینان
کی کتاب صفحہ ۲۹۰ سے جو حضرت مسیح کے حالات میں لکھی ہے
ارر یوسی بیس کی تاریخ کلیسا صفحہ ۲۹۱ سے بخوبی پائی جاتی ہے -

اب اس بات پر غور کرنی چاهئے کہ حضرت عیسیٰ کو کس
طرح صلیب پر چڑھایا تھا - جس دن حضرت عیسیٰ صلیب پر
چڑھائے گئے وہ جمعہ کا دن تھا اور یہودیوں کی عید فصح کا
تہوار تھا - دوپہر کا وقت تھا جب اُن کو صلیب پر چڑھایا گیا -
اس میں کچھ شبہ نہیں کہ ان کی هتھیلیوں میں کیلیں ٹھونکی
گئیں مگر یہ امر مشتبہ ہے کہ پاؤں میں بھی کیلیں ٹھوکی گئیں
یا نہیں - کیوں کہ انجیل یوحنا میں صرف هتھیلیوں کے چھید دیکھنے
کا ذکر ہے اور لوقا کی انجیل میں ھاتھ پاؤں دونوں کا مگر اس

اختلاف سے جو اصل امر ہے اس میں کچھ اثر پیدا نہیں ہوتا ۔

عید فصح کے دن ختم ہونے پر یہودیوں کا سبت شروع ہونے والا تھا اور یہودی مذہب کی رو سے ضرور تھا کہ مقتول یا مصلوب کی لاش قبل ختم ہونے دن کے یعنی قبل شروع ہونے سبت کے دفن کر دی جاوے مگر صلیب پر انسان اس قدر جلدی نہیں مر سکتا تھا ۔ اس لیے یہودیوں نے درخواست کی کہ حضرت مسیح کی ٹانگیں توڑ دی جاویں تاکہ فی‌الفور مر جاویں ۔ مگر حضرت عیسیٰ کی ٹانگیں توڑی نہیں گئیں اور لوگوں نے جانا کہ وہ اتنی دیر میں مر گئے ۔ برچھی کا حضرت عیسیٰ کے پہلو میں اُن کے زندہ یا مردہ ہونے کی شناخت کے لیے چبھونا صرف یوحنا کی انجیل میں ہے اور کسی انجیل میں نہیں ہے اور نہ اُس وقت جب کہ حضرت عیسیٰ نے اپنے ہاتھوں کے چھید حواریوں کو دکھلائے ۔ پسلی کے چھید کا دکھانا کسی انجیل میں لکھا ہے اس برچھی کا چبھونا نہایت مشتبہ ہے معہذا بھی اگر وہ صحیح ہو تو وہ بھی کوئی ایسا زخم جس سے فی‌الفور ہلاکت ہو متصور نہیں ہو سکتا ۔ جس طرح اُن کے ہاتھ پاؤں زخمی تھے اُسی طرح پسلی کے نیچے بھی ایک زخم تسلیم کیا جاوے ۔

جب کہ لوگوں نے غلطی سے جانا کہ حضرت در حقیقت مر گئے ہیں تو یوسف نے حاکم سے اُن کے دفن کر دینے کی درخواست کی ۔ وہ نہایت متعجب ہوا کہ ایسے جلد مر گئے ۔ اس قدر جلدی مر جانے کی خبر سے کچھ حاکم ہی متعجب نہیں ہوا بلکہ عیسائی بھی اس کو ناممکن سمجھتے تھے اور اس لیے تیسری صدی عیسوی میں جو عیسائی علماء تھے اُنھوں نے حضرت عیسیٰ کا اس قدر جلد صلیب پر مرنا آخر کار ایک معجزہ قرار دیا ۔

غرضکہ یوسف کو دفن کرنے کی اجازت مل گئی اور

حضرت عیسٰی صرف تین چار گھنٹے صلیب پر رہے کسی کتاب سے نہیں معلوم ہوتا کہ کوئی رسم تجہیز و تکفین کی حضرت عیسٰی کے ساتھ عمل میں آئی تھی بلکہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ یوسف نے ان کو ایک لحد میں رکھا اور اس پر ایک پتھر ڈھانک دیا ۔

اس بات کا تصفیہ نہیں ہو سکتا کہ یوسف نے یہ کام اس لیے کیا تھا تاکہ حضرت عیسٰی کے دشمن یقین کر لیں کہ در حقیقت عیسٰی مر گئے اور وہ جانتا تھا کہ وہ مرے نہیں ہیں یا آنکہ در حقیقت ان کو مردہ سمجھ کر اس نے لحد میں رکھ دیا تھا ۔ بہر حال رات کو وہ اس لحد میں نہ تھے اور اس سے پہلی بات کی تائید ہوتی ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ خود یہودیوں کو بھی شبہہ تھا کہ وہ مر گئے ہیں یا نہیں ۔ اس لیے صبح کو بروز شنبہ انھوں نے حاکم کی اجازت سے وہاں پر پہرہ متعین کر دیا مگر اب کیا فائدہ تھا جو کچھ ہونا تھا وہ اس سے پہلے ہو چکا تھا ۔

جب اس تمام واقعہ پر مؤرخانہ طور پر نظر ڈالی جاوے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عیسٰی صلیب پر مرے نہ تھے بلکہ اُن پر ایسی حالت طاری ہو گئی تھی کہ لوگوں نے اُن کو مردہ سمجھا تھا اس امر کی نظیریں کہ صلیب پر سے لوگ زندہ اُترے ہیں تاریخ میں موجود ہیں ۔ ڈاکٹر کلارک نے متی کی انجیل کی تفسیر میں لکھا ہے کہ ایسی کئی ایک مثالیں موجود ہیں کہ شخص مصلوب کئی دن تک زندہ رہا ہے ۔ ہیروڈوٹس رومی مؤرخ نے لکھا ہے کہ سندوکیس دارا کے حکم سے صلیب پر چڑھایا گیا ۔ اور پھر اُس کے حکم سے اُتارا گیا وہ زندہ رہا اور رہا کر دیا گیا ۔ یوسی سیس مؤرخ نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ طیطوس بادشاہ کے حکم سے بہت سے قیدی صلیب پر چڑھائے گئے اُن میں سے تین آدمی اُس کے ملاقاتی تھے ۔ اُس نے بادشاہ سے اُن کی سفارش

کی اور وہ صلیب پر سے آتارے گئے اور آن کا معالجہ کیا گیا ۔ مگر آن میں سے دو آدمی مر گئے اور ایک شخص اچھا ہو گیا ۔ حضرت عیسیٰ تین چار گھنٹے بعد صلیب سے آتار لیے گئے تھے اور ہر طرح پر یقین ہو سکتا ہے ۔ کہ وہ زندہ ہی رات کو وہ لحد سے نکال لیے گئے اور وہ مخفی اپنے مریدوں کی حفاظت میں رہے ۔ حواریوں نے ان کو دیکھا اور ملے اور پھر کسی وقت اپنی موت سے مر گئے ۔ بلا شبہ ان کو یہودیوں کی عداوت کے خوف سے نہایت مخفی طور پر کسی نا معلوم مقام میں دفن کر دیا ہوگا جو اب تک نا معلوم ہے اور یہ مشہور کیا گیا ہوگا کہ وہ آسمان پر چلے گئے ۔ حضرت موسیٰ کی وفات کے وقت بھی نہایت شبہ تھا کہ بنی اسرائیل جو پہاڑوں اور جنگلوں میں پھرتے پھرتے اور دشمنوں سے لڑتے لڑتے حضرت موسیٰ کے ھاتھ سے نہایت تنگ ہو گئے تھے حضرت موسیٰ کی تلاش کے ساتھ کیا کریں گے اس لیے کہ ان کو بھی ایک پہاڑ کی کھوہ میں ایسے نامعلوم مقام میں دفن کیا گیا تھا کہ آج تک کسی کو اس کا پتہ معلوم نہیں ہوا ۔ چنانچہ توریت کی پانچویں کتاب میں لکھا ہے ، کہ ”پس موسیٰ بندہ خداوند در آنجا بزمین معہ آب موافق قول خداوند وفات کرد او را در درۂ زمین معہ آب برابربیت یعور دفن کرد ھیچ کس از مقبرہ او تا بہ امروز واقف نیست“ ۔ حضرت علی مرتضیٰ کا جنازہ بھی خوارج کے خوف سے اسی طرح مخفی طور پر دفن کیا گیا تھا ۔ حالاں کہ خوارج کا خوف بہ نسبت یہودیوں کے بہت کم تھا اور اسی طرح بعض لوگوں نے حضرت علی مرتضیٰ کی نسبت بھی کہا تھا کہ وہ آسمان پر چلے گئے ۔

اب ہم کو قرآن پر غور کرنا چاہیے کہ اس میں کیا لکھا ہے ۔ قرآن مجید میں حضرت عیسیٰ کی وفات کے متعلق چار جگہ

ذکر آیا ھے ۔

اول ۔ تو سورۂ آل عمران میں اور وہ یہی آیت ھے جس کی ہم تفسیر لکھتے ھیں کہ جب ''اذ قال اللہ یا عیسیٰ انی متوفیک و رافعک الیَّ'' (آل عمران آیت ۵۶) اللہ نے عیسیٰ سے کہا کہ ''بے شک میں تجھ کو وفات دینے والا ھوں اور تجھ کو اپنی طرف رفع کرنے والا ھوں'' ۔

دوم ۔ سورۂ مائدہ میں جہاں فرمایا ھے کہ ''جب اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ سے کہے گا کہ کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھ کو اور میری ماں کو خدا بناؤ تو حضرت عیسیٰ کہیں گے کہ میں نے اُن سے نہیں کہا بجز اس کے جس کا تو نے مجھ کو حکم دیا تھا کہ خدا کی عبادت کرو جو میرا اور تمہارا پروردگار ھے اور جب تک میں اُن میں رہا اُن پر شاھد تھا ۔ پھر جب تو نے مجھ کو وفات دی تو تو اُن پر نگہبان تھا اور تو ھر چیز پر گواہ ھے'' ۔

سوم ۔ سورۂ مریم میں جہاں فرمایا ھے کہ ''جب حضرت مریم حضرت عیسیٰ کو علماء یہود سے کلام کرنے کو لے آئیں تو حضرت عیسیٰ نے کہا کہ '' میں خدا کا بندہ اور نبی ھوں مجھ کو کتاب ملی ھے اور مجھ کو حکم دیا ھے نماز کا اور زکواۃ کا جب تک کہ مین زندہ رھوں اور اپنی ماں کے ساتھ نیکی کرنے کا اور مجھ کو جبار و شقی نہیں بنایا ھے اور مجھ پر سلامتی ھے جس دن کہ مین پیدا ھوا اور جس دن کہ مروں گا اور جس دن کہ پھر زندہ ھو کر اُٹھوں گا'' ۔

چہارم ۔ سورۂ نساء میں جہاں یہودیوں کے کفر کے اقوال بیان کیے ھیں وھاں اُن کا یہ قول نقل کیا ھے کہ ''یہودی کہتے تھے ہم نے عیسیٰ بن مریم رسول خدا کو قتل کر ڈالا حالاں کہ

نہ اُنھوں نے اُن کو قتل کیا اور نہ صلیب پر مارا ، لیکن ان پر (صلیب پر مار ڈالنے کی) شبیہہ کر دی گئی اور جو لوگ کہ اس میں اختلاف کرتے ھیں البتہ وہ اس بات میں شک میں پڑے ھیں ۔ اُن کو اس کا یقین نہیں ھے بجز گمان کی پیروی کے ۔ اُنھوں نے ان کو یقیناً قتل نہیں کیا بلکہ خدا نے اپنے پاس ان کو اُٹھا لیا '' ۔

پہلی تین آیتوں سے حضرت عیسیٰ کا اپنی موت سے وفات پانا علانیہ ظاھر ھے مگر جو کہ علمائے اسلام نے بہ تقلید بعض فرق نصاریٰ نے قبل اس کے کہ مطلب قرآن مجید پر غور کریں یہ تسلیم کر لیا تھا کہ حضرت عیسیٰ زندہ آسمان پر چلے گئے ھیں ۔ اس لیے اُنھوں نے ان آیتوں کے بعض الفاظ کو اپنی غیر محقق تسلیم کے مطابق کرنے کو بے جا کوشش کی ھے ۔

پہلی آیت میں صاف لفظ ''متوفیک'' کا واقع ھے جس کے معنی عموماً ایسے مقام پر موت کے لیے جاتے ھیں ۔ خود قرآن مجید سے اس کی تفسیر پائی جاتی ھے جہاں خدا نے فرمایا ھے '' اللہ یتوفی الانفس حین موتھا '' ابن عباس اور محمد بن اسحاق نے بھی جیسے کہ تفسیر کبیر میں لکھا ھے '' متوفیک '' کے معنی '' ممیتک '' کے لیے ھیں ۔

یہی حال لفظ '' توفیتنی '' کا ھے جو دوسری آیت میں ھے اور جس کے صاف معنی یہ ھیں کہ جب تو نے مجھ کو موت دی یعنی جب میں مر گیا اور ان میں نہیں رھا تو تو اُن کا نگہبان تھا ۔

پہلی آیت میں اور چوتھی آیت میں لفظ '' رفع '' کا بھی آیا ھے جس سے حضرت عیسیٰ کی قدر و منزلت کا اظہار مقصود ھے نہ یہ کہ ان کے جسم کو اُٹھا لینے کا ۔ تفسیر کبیر میں بھی

بعض علماء کا قول لکھا ہے کہ لفظ ''رفع'' کا تعظیماً اور تفخیماً بولا گیا ہے ۔

جن علماء نے ''متوفیک'' کے معنی ''ممیتک'' کے قرار دیے تھے انھوں نے قرآن مجید کے ٹھیک ٹھیک معنی سمجھے تھے ۔ ان کا خیال تھا کہ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ کو قتل نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنی موت سے مرے ۔ مگر انھوں نے ''رافعک'' کے معنوں میں غلطی کی جو یہ خیال کیا کہ پھر زندہ ہو کر آسمان پر چلے گئے ۔ کیوں کہ ''رافعک'' کے لفظ سے جیسا ہم نے اوپر بیان کیا ۔ آسمان پر جانا لازم نہیں آتا ۔ تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ پر موت طبعی طاری کرنے سے مقصود یہ تھا کہ ان کے دشمن ان کو قتل نہ کر سکیں ۔ وہب کا یہ قول ہے کہ وہ تین گھنٹہ تک مردہ رہے اور محمد بن اسحاق کا قول ہے کہ سات گھنٹہ ، تک پھر زندہ ہوئے اور آسمان پر چلے گئے اور ربیع ابن انس کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان پر اٹھاتے وقت موت دی ۔

بہر حال ان اقوال سے اس قدر ثابت ہوا کہ بعض علماء اس بات کے قائل ہوئے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کو موت طبعی طاری ہوئی اور بعض علماء نے 'رفع' کے لفظ سے حضرت عیسیٰ کے جسم کا آسمان پر اٹھا لینا مراد نہیں لیا ، بلکہ اس سے ان کی قدر و منزلت مراد لی ہے ۔ پس جب ان دونوں قولوں کو تسلیم کیا جاوے تو جو ہم بیان کرتے ہیں وہی پایا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کو یہودیوں نے نہ سنگسار کرکے قتل کیا نہ صلیب پر قتل کیا بلکہ وہ اپنی موت سے مرے اور خدا نے ان کے درجہ اور مرتبہ کو مرتفع کیا ۔

ان آیتوں میں ایک اور لفظ بھی غور کے قابل ہے یعنی

" مادمت فیہم " اس کے صاف معنی ہیں کہ جب تک میں زندہ تھا اور اس کی سند خود قرآن مجید کی دوسری آیت میں موجود ہے جہاں فرمایا ہے " مادمت حیا " پس صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جو معنی 'حیا' کے ہیں وہی معنی " فیہم " کے ہیں ، اس کے بعد ہے " فلما توفیتنی " تو اس سے اور بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس لفظ سے " حیا " ہی مراد تھی اور مطلب بالکل صاف ہو جاتا ہے کہ جب تک میں ان میں تھا یعنی زندہ تھا تو میں اس پر شاہد تھا اور جب تو نے مجھے موت دی تو تو ان کا نگہبان رہا ۔ پس ان دونوں آیتوں میں اس دنیا ہی میں حضرت عیسیٰ کا زندہ رہنا اور اس دنیا ہی میں اپنی موت سے مرنا بخوبی ظاہر ہوتا ہے ۔

اب باقی رہی چوتھی آیت ، مگر جب یہ تحقیق ہو گیا کہ یہودی یہ دعویٰ کرتے تھے کہ ہم نے حضرت عیسیٰ کو سنگسار کر کے قتل کیا تھا اور عیسائی یہ یقین کرتے تھے کہ یہودیوں نے صلیب پر حضرت عیسیٰ کو قتل کیا تھا حالاں کہ یہ دونوں باتیں غلط تھیں ۔ وہ سنگسار تو ہرگز نہیں ہوئے ، صلیب پر البتہ لٹکائے گئے مگر صلیب پر مرے نہیں ۔ ان دونوں اعتقادوں کے رد کرنے کو خدا نے فرمایا کہ " ما قتلوہ و ما صلبوہ " پہلے " ما " قافیہ سے نفس قتل کا سلب ہوتا ہے اور دوسرے سے کمال صلیب کا ۔ کیوں کہ صلیب پر چڑھانے کی تکمیل اسی وقت تھی جب صلیب کے سبب موت واقع ہوئی ، حالاں کہ صلیب پر موت واقع نہیں ہوئی ۔ "و لکن شبہ لہم" سے اور زیادہ تشریح اس مطلب کی ہوتی ہے ۔ تشبیہ میں چار چیزیں ہوتی ہیں : ایک مشبہ اور ایک مشبہ بہ ، ایک وجہ تشبیہ ایک مشبہ لہ ۔ اس آیت میں صرف دو چیزیں بیان ہوئی ہیں : ایک مشبہ

جو حضرت عیسیٰ علیه السلام تھے ، دوسری مشبه لهم جو یهودی تھے اور جو درپے قتل حضرت مسیح تھے ۔ مشبه به قرآن میں مذکور نہیں ھے ۔ علمائے اسلام نے بعض عیسائی فرقوں کا یه قول پایا که شمعون یا یهودا صلیب پر چڑھایا گیا تھا انھوں نے جھٹ قرآن کے معنی بدل دیے اور یهودا یا شمعون کو مشبه اور حضرت عیسیٰ کو مشبه به اور یهودا یا شمعون کی تبدیل صورت کو وجه تشبیه قرار دے دیا ، حالاں که یہاں حرف مشبه به محذوف ھے اور وہ " موتی " ھے اور وجه تشبیه وہ حالت ھے جو حضرت عیسیٰ پر طاری ھوئی تھی جس کے سبب وہ مردہ تصور ھوئے تھے ۔ پس تقدیر آیت کی یه ھے که " و ما صلبوہ و لکن شبه لهم بالموتی " اس کی زیادہ تصریح اسی آیت کے اگلے لفظوں سے ھوتی ھے جہاں خدا نے فرمایا ھے که " جو لوگ اس میں اختلاف کرتے ھیں وہ شک میں ھیں ۔ ان کو کچھ علم نہیں ھے بجز گمان کی پیروی کے " اور پھر اس کے بعد تاکیداً اور یقیناً فرمایا که " انھوں نے عیسیٰ کو قتل نہیں کیا اور اس مقام پر صلیب کا کچھ ذکر نہیں کیا بلکه صرف قتل کی نفی کی اور اس سے بخوبی ثابت ھوتا ھے که اوپر جو صلیب کی نفی کی تھی اس سے نفی قتل بالصلیب مراد تھی نه مطلق صلیب ۔ "ثم اماته با جل مسمی و رفعه الیه کما قال الله تعالیٰ بل رفعه الله الیه ۔

انھی باتوں پر آنحضرت صلی الله علیه وسلم نے عیسائی عالموں سے مباھله چاھا جس سے ایک نہایت عمدہ طور پر فطرت انسانی ظاھر ھوتی ھے ۔ تمام اھل مذاھب خواہ صحیح مذھب رکھتے ھوں یا غلط دو قسم کے ھوتے ھیں ۔ جہلا اور علماء ، جہلا کا یقین مذھبی باتوں پر نہایت پخته اور مستحکم ھوتا ھے اور جو کچھ انھوں نے

سمجھا ہے یا سیکھا ہے اس کے سوا وہ اور کچھ نہیں جانتے اور کوئی شبہ ان کے دل میں نہیں ہوتا ۔ ان کی مثال اندھے آدمی کی سی ہے کہ وہ اُس رستہ پر جو اُس کو کسی نے بتلا دیا ہے چلا جاتا ہے اور اس کے ٹھیک ہونے پر یقین رکھتا ہے اور خود نہیں جانتا کہ درحقیقت یہ رستہ اُسی جگہ جاتا ہے جہاں اُس کو جانا ہے یا نہیں۔ پھر اگر کسی نے کہہ دیا کہ میاں اندھے آگے گڑھا ہے یا دیوار ہے تو وہ بغیر کسی شک کے اُس پر یقین کر لیتا ہے اور ٹھہر جاتا ہے۔ پھر جس نے جو راہ بتائی اُس طرف ہو لیا ۔ یہی جہلائے اہل مذہب کا حال ہے جس مذہب میں وہ ہیں اُن کو اُس پر ذرا بھی شبہ نہیں ۔ مگر علماء کا حال اس کے برخلاف ہوتا ہے گو وہ بھی مذہب کی پیروی کرتے ہیں اور جس مذہب میں وہ ہیں اس کو سچ کہتے ہیں اور دل میں بھی اُس پر یقین رکھتے ہیں مگر اُن کا دل شبہ سے خالی نہیں ہوتا ۔ وہ مذہب کے ہزاروں مسئلوں کو سچ کہتے ہیں مگر ان کی عقل ان کو قبول نہیں کرتی اُن کا علم اُن کے ویسے ہی ہونے پر اُن کی تصدیق نہیں کرتا اور جب وہ اس پر سچا یقین نہیں کر سکتے تو اپنے دل کو سمجھاتے ہیں کہ گو یہ بات عقل سے اور سمجھ سے دور ہو مگر مذہب کی رو سے ہم کو یونہی ماننا اور اس پر یقین کرنا ضرور ہے ۔ پس درحقیقت اُن پر اُن کو سچا یقین نہیں ہوتا ۔ دل میں ایک کانٹا سا کھٹکتا رہتا ہے اور جس پر اُن کو حقیقی یقین نہیں ہوتا اُس پر یقین بٹھلانا چاہتے ہیں ۔ علمائے عیسائی جو حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا کہتے تھے اور مرنے کے بعد جی اٹھنے کا اعتقاد رکھتے تھے یہ بھی ایسی ہی باتیں ہوتی تھیں جن کو وہ مذہباً مانتے تھے اور مذہباً اُس پر اعتقاد رکھتے تھے ۔ مگر سچائی سے دل نہیں مانتا تھا ۔ فطرت انسانی میں یہ بات ہے کہ جو سچا شبہ اُس کے دل میں ہوتا ہے وہ دور کرنے سے دور نہیں ہوتا

اور یقین بٹھلانے سے یقین نہیں بیٹھتا - بلکه وہ شبه جب ہی دور ہوتا ہے جب حقیقتاً شبه دور ہو جاوےاور یقین جب ہی آتا ہے جب که حقیقتاً یقین آ جاوے - ایسی حالت میں کوئی شخص ایسی بات کرنے پر فطرتاً آمادہ نہیں ہو سکتا جو اس کے دل میں کھٹکنے والے شبه کے برخلاف ہو - اسی لیے علمائے عیسائی سے نه جہلائے عیسائی سے کہا گیا که اگر تم اس پر یقین رکھتے ہو تو مباہله کرو اور ظاہر ہو گیا که وہی دل میں کھٹکنے والا شبه اس پر آمادہ نہیں کر سکتا اور ثابت ہو گیا که خود علمائے عیسائی کو حضرت عیسیٰ کے ابن اللہ ہونے اور مر کے جی اٹھنے پر سچا یقین نہیں تھا اور میں کہہ سکتا ہوں که اب بھی بجز ایسے یقین کے جو مذہباً ہوتا ہے سچا یقین نہیں ہے -

ہم اہل اسلام کو بھی ان باتوں سے بری نہیں سمجھتے - ہزاروں مسلمان اس وقت موجود ہیں جو بہت سے مسئلوں پر صرف اس وجه سے یقین رکھتے ہیں که مذہباً ان پر یقین رکھنا چاہئے مگر وہ دل میں کھٹکنے والا شبه ان کے دل میں موجود ہے - البته اسلام میں ایسے علماء اور اہل اللہ بھی گذرے ہیں جنھوں نے درحقیقت مذہب اسلام پر غور و فکر کی ہے اور حقیقتاً تمام شبہات ان کے دل سے دور ہوئے ہیں اور حقیقتاً ان کے دل میں یقین آیا ہے - ایسے محققین کو ہمیشه لوگوں نے کافر کہا ہے اور اب بھی کہتے ہیں - مگر کچھ شبه نہیں که خدا کے سامنے ان کے کفر کے مقابله میں دوسرون کا ایمان بجوے ہم نمی آزرد -

حضرت عیسٰی کے معجزات

سورۂ مائدہ کے آخر میں اللہ تعالٰی نے اُن واقعات میں سے جو حضرت عیسٰی پر بچپنے اور جوانی کے زمانہ میں گزرے تھے چند واقعات کا جن کا بیان سورۂ آل عمران میں بھی ہو چکا ہے بطور اپنے احسان اور اپنی نعمت کے بیان کرنا شروع کیا ہے۔ بچپنے کی حالت کو یاد دلایا ہے پھر نوعمری کے زمانہ کو یاد دلایا ہے پھر نبوت کے زمانہ کو یاد دلایا ہے اس میں کچھ شک نہیں کہ اس طرح کا طرز کلام نہایت دلچسپ اور محبت سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ ایک اعلٰی درجہ کے شخص کو اس کے بچپنے کی بھولی بھولی باتیں یاد دلائی جاتی ہیں اور پھر اُن کمالوں کا ذکر کیا جاتا ہے جن کو اس نے حاصل کیا ہے ان دونوں زمانہ کی باتیں مل کر نہایت دلچسپ اور پر اثر ہو جاتی ہیں اسی طرح خدا تعالٰی نے حضرت عیسٰی کو دونوں زمانوں کی باتوں کو یاد دلایا ہے اور یوں فرمایا ہے کہ تو اس بات کو یاد کر جب کہ میں نے روح القدس سے تیری مدد کی۔ تو اس بات کو یاد کر جب کہ تو نے بچپنے میں گفتگو کی۔ تو اس بات کو یاد کر جب کہ میں نے تجھ کو کتاب اور حکمت سکھائی۔ تو اس وقت کو یاد کر جب کہ تو مٹی سے جانوروں کی مورتیں بناتا تھا اور اُن میں پھونکتا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ وہ اللہ کے حکم سے زندہ ہو جاویں گی۔ تو اُس وقت کو یاد کر جب کہ تو اندھوں اور کوڑھیوں کو اچھا کرتا تھا۔ تو اُس وقت کو یاد کر جب کہ تو موتے کو زندہ کرتا تھا

تو اُس وقت کو یاد کر جب کہ میں نے تجھ کو بنی اسرائیل سے بچایا ۔ اُس وقت کو یاد کر جب کہ میں نے حواریوں کے دل میں ڈالا کہ مجھ پر اور تجھ پر ایمان لاویں ۔ تو اُس وقت کو یاد کر جب کہ تجھ سے حواریوں نے آسمان پر سے رزق اُترنے کی درخواست کی ۔ تو اُس وقت کو بھی یاد رکھ جب کہ میں تجھ کو اُس شرک کے الزام سے جو تیری اُمت نے تجھ پر دھرا ہے بری کروں گا ۔ ان باتوں کے سوا سورۂ آل عمران میں ایک اور بات بھی بیان ہوئی ہے کہ حضرت عیسیٰ نے بنی اسرائیل سے کہا کہ میں تمھارے پاس تمھارے پروردگار کی نشانی (یعنی احکام) لے کر آیا ہوں اور یہ بھی کہا کہ میں تم کو بتلاؤں گا کہ تم کیا کھاتے ہو اور کیا اپنے گھروں میں جمع کرتے ہو ۔

یہ سب بارہ باتیں ہیں جن کو ہم ایک سلسلے میں جمع کر کے ہر ایک کا ترتیب سے جدا جدا بیان کریں گے ۔ اول تکلم فی المہد ۔ دوم خلق طیر ۔ سوم تائید روح القدس ۔ چہارم تعلیم کتاب و حکمت ۔ پنجم خدا کی نشانی لانا ۔ ششم حواریوں کے دل میں ایمان کا ڈالنا ۔ ہفتم اندھوں اور کوڑھیوں کو چنگا کرنا ۔ ہشتم موتےٰ کو زندہ کرنا ۔ نہم اخبار عن الغیب ۔ دہم مائدہ یازدہم بنی اسرائیل سے بچانا ۔ دوازدہم براءت عن المشرکین ۔

اول ۔ تکلم فی المہد

اس امر کی نسبت خدا تعالیٰ نے سورۂ آل عمران میں فرمایا ہے ”و یکلم الناس فی المہد و کہلا“ اور سورۂ مائدہ میں فرمایا ”تکلم الناس فی المہد و کہلا“ اور سورۂ مریم میں فرمایا ہے فاشارت الیہ قالوا کیف نکلم من کان فی المہد صبیا قال انی عبداللہ اتانی الکتاب وجعلنی نبیا“ ۔

ان آیتوں میں صرف لفظ مہد کا ہے جس پر بحث ہو سکتی ہے

مگر مہد سے صرف صغر سنی کا زمانہ مراد ہے نہ وہ زمانہ جس میں کوئی بچہ بمقتضائے قانون قدرت کلام نہیں کر سکتا اس مضمون پر ہم اس سے پہلے بحث کر چکے ہیں -

دوم - خلق طیر

یہ اس حالت کا ذکر ہے جب کہ حضرت عیسیٰ بچے تھے اور بچپنے کے زمانہ میں بچوں کے ساتھ کھیلتے تھے اس کی نسبت خدا نے سورۂ آل عمران میں حضرت عیسیٰ کی زبان سے یوں فرمایا ہے کہ " انی اخلق لکم من الطین کھیئة الطیر فیکون طیرا باذن اللہ" اور سورۂ مائدہ میں یوں فرمایا ہے و اذ تخلق من الطین کھیئة الطیر باذنی فتنفخ فیھا فتکون طیرا باذنی" -

سورۂ آل عمران میں یہ مضمون حضرت عیسیٰ کی زبان سے متکلم کے صیغوں میں بیان ہوا ہے اور سورۂ مائدہ میں خدا کی طرف سے مخاطب کے صیغوں میں - مگر سورۂ آل عمران میں اس آیت سے پہلے یہ آیت ہے کہ "انی قد جئتکم بایة من ربکم اور اس کی نسبت ہم نے ثابت کیا ہے کہ وہ سوال کے جواب میں ہے اسی سیاق پر یہ آیت ہے اور سوال کے جواب میں واقع ہوئی ہے تقدیر کلام کی یہ ہے کہ کسی شخص نے حضرت عیسیٰ کو مٹی سے جانورں کی مورتیں بناتے دیکھ کر پوچھا کہ 'ماتفعل' ؟ 'قال مجیباله یانی اخلق لکم من الطین کھیئة الطیر الخ"- تاریخ سے بھی پایا جاتا ہے کہ جانوروں کی مورتیں بنانے کی نسبت لوگوں نے حضرت عیسیٰ سے سوال بھی کیا تھا جیسا کہ ہم آگے بیان کریں گے -

اب اس پر بحث یہ ہے کہ کیا در حقیقت یہ کوئی معجزہ تھا اور کیا در حقیقت قرآن مجید سے ان مٹی کے جانوروں کا جاندار

ہو جانا اور اڑنے لگنا ثابت ہوتا ہے ۔ تمام مفسرین اور علمائے اسلام کا جواب یہ ہے کہ ہاں ۔ مگر ہمارا جواب ہے کہ نہیں ۔ بشرطیکہ دل و دماغ کو اُن خیالات سے جو قرآن مجید پر غور کرنے اور قرآن مجید کا مطلب سمجھنے سے پہلے عیسائیوں کی صیح و غلط روایات کی تقلید سے بیٹھا لیے ہیں خالی کرکے نفس قرآن مجید پر بنظر تحقیق غور کیا جاوے ۔

سورۂ آل عمران میں جو یہ الفاظ ہیں کہ انی اخلق لکم من الطین کھیئة الطیرا فانفخ فیه فیکون طیرا باذن‌الله ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مٹی سے پرندوں کی مورتیں بناتا ہوں پھر اُن میں پھونکوں گا تاکہ وہ اللہ کے حکم سے پرند ہو جاویں ۔ یہ بات حضرت عیسیٰ نے سوال کے جواب میں کہی تھی مگر اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ پھونکنے کے بعد در حقیقت وہ پرندوں کی مورتیں جو مٹی سے بناتے تھے جاندار ہو جاتی تھیں اور اڑنے بھی لگتی تھیں ۔

''فیکون'' پر جو (ف) ہے وہ عاطفه تو ہو نہیں سکتی کیوں کہ اگر وہ عاطفه ہو تو ''یکون طیرا اُن کی خبر ہوگی اور اس کا عطف'' 'اخلق' پر ہوگا اور 'یکون طیرا' میں یکون صیغه متکلم کا نہیں ہے اور نہ اُس کلام میں کوئی ضمیر اس طرح پر واقع ہوئی ہے کہ اسم انّ کی طرف راجع ہو سکے اس لیے ''یکون طیرا'' نحو کے قاعدہ کے مطابق یا یوں کہو کہ بموجب محاورہ زبان عرب کے کسی طرح انّ کی خبر نہیں ہو سکتا '' فیکون'' کی ف ، عاطفه قرار نہیں پا سکتی ، اب ضرور ہے کہ وہ 'ف' تفریع کی ہو اور پھونکنے میں اور اُن مورتوں کے پرند ہو جانے میں گو کہ در حقیقت کوئی سبب حقیقی یا مجازی یا ذہنی یا خارجی نہ ہو مگر ممکن ہے کہ متکلم نے اُن میں ایسا تعلق سمجھا ہو کہ اس کو متفرع اور متفرع علیه کی صورت میں یا سبب اور مسبب کی صورت میں بیان کرے جہاں کلم

مجازات کی بحث نحو کی کتابوں میں لکھی ہے اُس میں صاف بیان کیا ہے کہ کلام مجازات سے یہ مراد نہیں ہوتی کہ در حقیقت وہ ایک امر کو دوسرے امر کا حقیقی سبب کر دیتے ہیں بلکہ متکلم اس طرح پر خیال کرتا ہے اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ پہلا امر دوسرے امر کا حقیقی یا خارجی یا ذہنی سبب ہو - مگر صرف اس طرح کے بیان سے امر متفرع یا مسبب کا وقوع ثابت نہیں ہو سکتا جب تک کسی اور دلیل سے نہ ثابت ہو کہ وہ امر فی الحقیقت وقوع میں بھی آیا تھا - اور جس قدر الفاظ قرآن مجید کے ہیں اُن میں یہ بیان نہیں ہوا ہے کہ وہ پرندوں کی مورتیں در حقیقت جاندار اور پرند ہو بھی جاتی تھیں -

حضرت عیسیٰ کے زمانہ طفولیت کے حالات بہت کم لکھے گئے ہیں چاروں انجیلیں جو اس زمانے میں معتبر گنی جاتی ہیں اُن میں زمانہ طفولیت کے کچھ بھی حالات نہیں ہیں یہ بات تو ممکن نہیں ہے کہ ان کے زمانہ طفولیت کے کچھ حالات ہوں ہی نہیں مگر کسی کو اُن کے لکھنے پر رغبت ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی -

حضرت عیسیٰ کے انتقال کے بہت زمانہ بعد بعض قدیم عیسائی مؤرخوں نے اُن کے حالات زمانہ طفولیت کے لکھنے پر کوشش کی ہے اور اس وقت ہم کو دو کتابیں انجیل طفولیت کے نام سے دستیاب ہوئی ہیں جن کو حال کے عسیائیوں نے نا معتمد کتابوں میں داخل کیا ہے بہر حال اُن کتابوں کی روایتوں کو بھی بہت لوگ تسلیم کرتے تھے اور لوگوں میں مشہور تھیں اُن دونوں کتابوں میں خلق طیر کا قصہ اُن معمولی مبالغہ آمیز باتوں اور کراستوں کے ساتھ جو ایسے بزرگوں کی تاریخ لکھنے میں خواہ نخواہ ملا دی جاتی ہیں لکھا ہوا ہے - یہ دونوں کتابیں انجیل اول طفولیت اور انجیل دوم طفولیت کے نام سے مشہور ہیں -

انجیل اول طفولیت دوسری صدی عسیوی میں ناسنکس کے ہاں عسیائیوں کا ایک فرقہ ہے مروج اور مسلم تھی اور از منہ مابعد میں جو بھی اس کے اکثر بیانات پر اکثر مشہور عسیائی عالم یوسبیس واتھا ناسیس وایپی فینیس و کرائی ساسٹم وغیرہ اعتقار رکھتے تھے۔ کوبیس ڈی کیسٹرڈ ایک انجیل طامسن کا ذکر کرتا ہے کہ ایشیا و افریقہ کے اکثر گرجاؤں میں پڑھی جاتی تھی اور اسی پر لوگوں کے اعتقاد کا دار و مدار تھا فیبریشیس کے نزدیک وہ یہی انجیل ہے ۔

انجیل دوم طفولیت اصل یونانی قلمی نسخہ سے ترجمہ کی گئی ہے جو کتب خانہ شاہ فرانس میں دستیاب ہوا تھا ۔ یہ طامسن کی طرف منسوب ہے اور ابتداءً انجیل مریم کے شامل خیال کی گئی ہے ۔

انجیل اول میں یہ قصہ اس طرح پر لکھا ہے اور جب کہ حضرت عیسیٰ کی عمر سات برس کی تھی وہ ایک روز اپنے ہم عمر رفیقوں کے ساتھ کھیل رہے تھے اور مٹی کی مختلف صورتیں یعنی گدھے بیل ، چڑیاں اور اور مورتیں بنا رہے تھے ۔

ہر شخص اپنی کاریگری کی تعریف کرتا تھا اور اوروں پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتا تھا ۔

تب حضرت عیسیٰ نے لوگوں سے کہا کہ میں ان مورتوں کو جو میں نے بنائی ہیں چلنے کا حکم دوں گا اور وہ فی الفور حرکت کرنے لگیں اور جب انھوں نے ان کو واپس آنے کا حکم دیا تو وہ واپس آئیں ۔

انھوں نے پرندوں اور چڑیوں کی مورتیں بنائی تھیں اور جب ان کو اڑنے کا حکم دیا تو وہ اڑنے لگیں اور جب انھوں نے ان کو ٹھیر جانے کا حکم دیا تو وہ ٹھہر گئیں اور اگر وہ ان کو کھانا اور پانی دیتے تھے تو کھاتی پیتی تھیں ۔

جب آخر کار لڑکے چلے گئے اور ان باتوں کو اپنے والدین سے

بیان کیا تو اُن کے والدین نے کہا کہ بچوں آئندہ اُس کی صحبت سے احتراز کرو کیوں کے وہ جادوگر ھے اس سے بچو اور پرھیز کرو اور اب اس کے ساتھ کبھی نہ کھیلو -

اور انجیل دوم میں اس طرح پر ھے - جب حضرت عیسٰی کی عمر پانچ برس کی تھی اور مینہ برس کر کھل گیا تھا حضرت عیسٰی عبرانی لڑکوں کے ساتھ ایک ندی کے کنارے کھیل رہے تھے اور پانی کنارہ کے اُوپر بہہ کر چھوٹی چھوٹی جھیلوں میں ٹھہر رہا تھا -

مگر اُسی وقت پانی صاف اور استعمال کے لائق ھو گیا اور حضرت عیسٰی نے اپنے حکم سے جھیلوں کو صاف کر دیا اور انھوں نے اُن کا کہنا مانا - تب اُنھوں نے ندی کے کنارہ پر سے کچھ نرم مٹی لی اور اس کی بارہ چڑیاں بنائیں اور ان کے ساتھ اور لڑکے بھی کھیل رہے تھے -

مگر ایک یہودی نے ان کاموں کو دیکھ کر یعنی ان کا سبت کے دن چڑیوں کی مورتیں بنانا دیکھ کر بلا توقف اُن کے باپ یوسف سے جا کر اطلاع کی اور کہا کہ دیکھ تیرا لڑکا ندی کے کنارے کھیل رہا ھے اور مٹی لے کر اس کی بارہ چڑیاں بنائی ھیں اور سبت کے دن گناہ کر رہا ھے -

تب یوسف اُس جگہ جہاں حضرت عیسٰی تھے آیا اور ان کو دیکھا تب بلا کر کہا کیوں تم ایسی بات کرتے ھو جو سبت کے دن کرنا جائز نہیں ھے -

تب حضرت عیسٰی نے اپنے ھاتھوں کی ھتھیلیاں بجا کر چڑیوں کو بلایا اور کہا کہ جاؤ اُڑ جاؤ اور جب تک تم زندہ رھو مجھے یاد رکھو پس چڑیاں غل مچاتی ھوئی اُڑ گئیں -

یہودی اس کو دیکھ کر متعجب ھوئے اور چلے گئے اور اپنے ھاں کے بڑے بڑے آدمیوں سے جا کر وہ عجیب و غریب

معجزہ بیان کیا جو حضرت عیسیٰ سے اُن کے سامنے ظہور میں آیا تھا ۔

مگر جب تاریخانہ تحقیق کی نظر سے اس پر غور کی جاتی ہے تو اصل بات صرف اس قدر تحقیق ہوتی ہے کہ حضرت عیسیٰ بچپنے میں لڑکوں کے ساتھ کھیلنے میں مٹی کے جانور بناتے تھے اور جیسے کبھی کبھی اب بھی ایسے موقعوں پر بچے کھیلنے میں کہتے ہیں کہ خدا ان میں جان ڈال دے گا وہ بھی کہتے ہوں گے ۔ مگر ان دونوں کتابوں کے لکھنے والوں نے اُس کو کراماتی طور پر بیان کیا کہ فی الحقیقت اُن میں جان پڑ جاتی تھی ۔ قرآن مجید نے اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی امر وقوعی نہ تھا بلکہ صرف حضرت مسیح کا خیال زمانہ طفولیت میں بچوں کے ساتھ کھیلنے میں تھا ۔ علمائے اسلام ہمیشہ قرآن مجید کے معنی یہودیوں اور عیسائیوں کی روایتوں کے مطابق اخذ کرنے کے مشتاق تھے اور بلا تحقیق ان روایتوں کی تقلید کرتے تھے انھوں نے ان الفاظ کی اسی طرح تفسیر کی جس طرح غلط سلط عیسائیوں کی روایتوں میں مشہور تھی اور اس پر خیال نہیں کیا کہ خود قرآن مجید اُن روایتوں کی غلطی کی تصحیح کرتا ہے ۔

سورۂ مائدہ میں بھی یہی مضمون خدا تعالیٰ نے مخاطب کے صیغوں سے دوبارہ بیان فرمایا ہے ۔ مگر اس مقام پر ایسی عمدگی سے سیاق کلام واقع ہوا ہے کہ باوجود اس کے کہ اس قصہ کو بعض اوقات متحقق الوقوع کے ساتھ بیان کیا ہے اس پر بھی اس خاص قصہ کا وقوع کہ وہ مٹی کی مورتیں پرند ہو جاتی تھیں ثابت نہیں ہوتا ۔ اس سورہ میں خدا تعالیٰ نے تمام واقعات متحقق الوقوع کو ماضی کے صیغوں سے بیان فرمایا ہے جیسے کہ " اذ ایدتک بروح القدس" ۔ " اذ علمتک الکتاب و الحکمۃ"۔ اذ کففت بنی اسرائیل عنک

اذ او حیت الی الحوارلین''۔ مگر مٹی کی مورتوں کے پرند ھو جانے کے قصہ کو مستقبل کے صیغہ سے بیان فرمایا ھے جیسے کہ ''اذ تخلق''۔ ''فتنفخ''۔ ''فتکون''۔ اس سیاق کے بدلنے سے یہ نتیجہ نکلتا ھے کہ جس مضارع کے صیغہ پر 'اذا' کا اثر پہنچے گا وہ تو امر متحقق الوقوع ھو جاوے گا ۔ اور جس صیغہ تک اس کا اثر نہ پہنچے گا وہ امر غیر متحقق الوقوع رھے گا ۔ اس کلام میں اذ کا اثر ''تخلق ، اور ''تنفخ'' تک پہنچتا ھے اور '' تکون'' تک نہیں پھونچتا جیسا کہ ھم بیان کریں گے ۔ پس ان مٹی کی مورتوں کا جان دار ھو جانا غیر متحقق الوقوع باقی رھتا ھے یعنی قرآن مجید سے ثابت نہیں ھوتا کہ در حقیقت وہ مٹی کی مورتیں جاندار اور پرند ھو بھی جاتی تھیں ۔

اس آیت میں بھی '' فتکون '' پر کی (ف) عاطفہ نہیں ھو سکتی کیوں کہ اگر وہ عاطفہ ھو تو اس کا عطف '' تخلق '' پر ھوگا اور معطوف حکم معطوف علیہ ھوتا ھے اور معطوف علیہ کی جگہ قائم ھو سکتا ھے اور یہ بات ضرور ھوتی ھے کہ اگر معطوف علیہ کو حذف کر دیا جاوے اور معطوف کو اس کی جگہ رکھ دیا جاوے تو کوئی خرابی اور نقص کلام میں نہ ھونے پاوے اور اس مقام پر ایسا نہیں ھے کیوں کہ اگر معطوف علیہ کو حذف کر کے '' فیکون طیرا '' اس کی جگہ رکھ دیں تو کلام اس طرح پر ھوتا ھے کہ ''اذکر نعمتی علیک اذ تکون طیرا '' اور یہ کلام محض مہمل اور غیر مقصود ھے ۔ اب ضرور ھے کہ یہ (ف) بھی اسی طرح تفریع کی ھو جس طرح سورۂ آل عمران میں (ف) تفریع کی تھی اور اس (ف) کے ذریعہ سے ''تنفخ '' متفرع علیہ اور تکون متفرع دونوں مل کر تخلق پر معطوف ھوں گے اور تقدیر کلام یوں ھوگی '' اذ کر نعمتی علیک اذ تنفخ فیھا فتکون طیرا '' مگر اس صورت میں '' فتکون طیراً ''

حرف ”تنفخ“ پر تفریع ہوگی اور ”اذ“ کا اثر جو مضارع پر آنے سے تحقیق زمانہ ماضی کا ہے یا اُس امر کو متحقق الوقوع کر دینے کا ہے ”تکون“ تک نہیں پہونچتا کیوں کہ وہ اثر اُس وقت پہنچتا جب کہ ”تکون“ کی (ف) عاطفہ ہوتی اور اس کا عطف ”تخلق“ پر جائز ہوتا - اس صورت میں ”تکون“ کو محض تفریعی تعلق اپنے متفرع علیہ سے ہے اور محض تفریعی حالت اسی طرح باقی رہتی ہے جیسی کہ سورۂ آل عمران میں تھی اور اس لیے اس تفریع سے اُس امر کا متفرع کا وقوع ثابت نہیں ہوتا -

اس تمام بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ قرآن مجید سے یہ بات تو ثابت ہے کہ حضرت عیسٰی بچپنے کی حالت میں مٹی سے جانوروں کی مورتیں بناتے تھے اور پوچھنے والے سے کہتے تھے کہ میرے پھونکنے سے وہ پرند ہو جاویں گے مگر یہ بات کہ در حقیقت وہ پرند ہو بھی جاتی تھیں نہ قرآن مجید سے ثابت ہوتا ہے نہ قرآن مجید میں بیان ہوا ہے - پس حضرت عیسٰی کا یہ کہنا ایسا ہی تھا جیسا کہ بچے اپنے کھیلنے میں بمقتضائے عمر اس قسم کی باتیں کیا کرتے ہیں -

سوم - تائید روح القدس

اس امر کی نسبت خدا تعالٰی نے سورۂ بقر میں فرمایا ہے ”و ایدناہ بروح القدس“ اور سورۂ مائدہ میں فرمایا ہے ”اذ ایدتک بروح القدس“ یہ آیتیں کچھ زیادہ تفسیر کی محتاج نہیں ہیں - اس میں کچھ شک نہیں کہ تمام انبیاء علیہم السلام موئد بتائید روح القدس ہیں - اگر بحث ہو سکتی ہے تو حقیقت روح القدس میں ہو سکتی ہے - تمام علمائے اسلام اس کو ایک مخلوق جداگانہ خارج از خلقت انبیاء قرار دے کر اُس کو بطور ایلچی

کے خدا و نبی میں واسطه قرار دیتے هیں اور جبرئیل اس کا نام بتاتے هیں - هم بهی جبرئیل اور روح القدس کو شے واحد یقین کرتے هین مگر اس کو خارج از خلقت انبیاء مخلوق جداگانه تسلیم نهیں کرتے بلکه اس بات کے قائل هیں که خود انبیاء علیهم السلام کی ملکه خلقت مین جو نبوت هے اور جو ذریعه مبداء فیاض سے اُن امور کے اقتباس کا هے جو نبوت یعنی رسالت سے علاقه رکهتے هیں وهی روح القدس هے اور وهی جبرئیل -

چهارم - تعلیم کتاب و حکمت

اس امر کی نسبت خدا تعالی نے سورۂ آل عمران میں فرمایا هے '' و یعلمه الکتاب والحکمة والتوراة و الانجیل و رسولا الی بنی اسرائیل '' اور سوره مائده میں فرمایا هے '' و اذ علمتک الکتاب والحکمة والتوراة والانجیل '' یه دونوں مضمون واحد هیں اور ان میں کچھ مشکلات نهیں هیں کیوں که بلا شبه تمام انبیاء کو خدائے تعالی احکام و حکمت تلقین کرتا هے اور کتاب پڑهاتا هے اور اُن کے دل میں علم کا وه خزانه جمع کرتا هے جس کو وه تمام لوگوں میں تقسیم کرتے هیں -

پنجم - خدا کی نشانی لانا

اس امر کی نسبت سورۂ آل عمران میں خدا تعالی نے حضرت عیسیٰ کی زبان سے یوں فرمایا هے '' انی قد جئتکم بایة من ربکم '' - هم اس بات کی تحقیق سورۂ بقر میں لکھ چکے هیں که آیت اور آیات بینات سے

خدا تعالیٰ کے احکام مراد ہوتے ہیں جو انبیا کو وحی کیے جاتے ہیں ۔ پس اس مقام پر بھی ہم آیت کے لفظ کے یہی معنی قرار دیتے ہیں اور آیت سے جنس مراد لیتے ہیں نہ فرد ۔ صاحب تفسیر کبیر نے بھی اس سے جنس ہی مراد لی ہے اور کہا ہے کہ "المراد بالایۃ الجنس لا الفرد" ۔

مگر اس مقام کی تفسیر کرنے سے پیش تر ہم کو اس امر کا بیان کرنا چاہیے جو سورۂ آل عمران کی آیتوں کے ربط کی نسبت ہے ۔ یہ آیت اور اس کے بعد کی آیتیں سورۂ آل عمران میں ان آیتوں کے بعد واقع ہوئی ہیں جس میں حضرت عیسیٰ کے ہونے کی بشارت ہے ۔ وہ آیتیں رسولا "النی بنی اسرائیل" تک برابر مسلسل چلی آتی ہیں مگر اس کے بعد جو آیت ہے "انی قد جئتکم بایۃ من ربکم" اس کا اور نیز اس کے بعد کی آیتوں کا بشارت کی آیات سے جوڑ نہیں ملتا ۔ علمائے مفسرین نے اس آیت کو اور نیز اس کے بعد کی آیتوں کو شامل آیات بشارت کے کیا ہے اور جوڑ ملانے کو لفظ "قائلاً" محذوف مانا ہے یعنی "رسولا النی بنی اسرائیل قائلاً انی قد جئتکم بایۃ" ۔ مگر 'قال' کے بعد "آن" مفتوحہ آنا کسی قدر اعتراض کے لائق تھا اس لیے زجاج نے اس جگہ اوپر کی آیتوں سے جوڑ لگانے کو "و یکلم الناس رسولا" مقدر مانا ہے اور یہ معنی قرار دیے ہیں "و یکلمھم رسولا بانی قد جئتکم" ۔

مگر ہم کو مفسرین کے ان اقوال سے اختلاف ہے خود سیاق کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس قدر آیتیں بشارت سے متعلق تھیں وہ اس مقام پر ختم ہوگئیں جہاں فرمایا "و رسولا النی بنی اسرائیل" اور وہ کلام منقطع ہوگیا اور "انی قد جئتکم بایۃ" سے دوسرا کلام شروع ہوتا ہے اس لیے بشارت کی آیتوں میں تمام صیغے مستقبل

کے آئے ہیں جیسے ''یکلم الناس - ویعلمه الکتاب'' اور ان سب آیتوں میں حالات قبل ولادت حضرت عیسیٰ کے بیان ہوئے ہیں اور اس کے بعد صیغے متکلم کے ہیں جیسے کہ '' انی جئتکم - انی اخلق لکم - و ابری الاکمه و انبئکم'' اور ان میں وہ تمام حالات مذکور ہیں جو بعد ولادت حضرت عیسیٰ واقع ہوئے ہیں - پس ان پچھلی آیتوں کو آیات بشارات کے ساتھ شامل کر دینا بالکل سیاق کلام کے بر خلاف ہے -

صاحب تفسیر ابن عباس نے بھی ان آیتوں کو بشارت کی آیتوں سے منقطع کیا ہے اور تقدیر کلام کی یوں کی ہے - ''فلما جاء هم قال انی قد جئتکم بآیة'' - مگر اس تقدیر میں وہی نقص باقی رہتا ہے کہ 'قال' کے بعد ان 'مفتوحه' واقع ہوتا ہے -

مگر ہم تقدیر کلام کی اس طرح پر کرتے ہیں کہ فلما جاء هم قال مجیبالهم بانی قد جئتکم بایة''- - - - یعنی جب حضرت عیسیٰ لوگوں میں وعظ و نصیحت کرنے لگے اور خدا کے احکام سنانے لگے تو اُن کی قوم نے کہا کہ تم یہ کیوں کرتے ہو - اُس کے جواب میں حضرت عیسیٰ نے فرمایا - '' انی قد جئتکم بایة من ربکم'' - یہ تقریر ہم نے اس لئے کی ہے کہ یہ مضمون ''انی قد جئتکم بایة من ربکم'' اور وہ مضمون جو سورۂ مریم میں ہے ''قال انی عبدالله اتانی الکتاب وجعلنی نبیا'' بالکل متحد ہے اور یہ پچھلا مضمون جواب میں قوم کے سوال کے واقع ہوا ہے اور یہ قرینہ ہے کہ وہ پہلا مضمون بھی قوم کے جواب میں ہے -

متی کی انجیل میں لکھا ہے کہ جب حضرت مسیح معبد میں وعظ کر رہے تھے تو سردار امام مشائخ اُن کے پاس آئے اور پوچھا کہ تو کس حکم سے یہ کام کرتا ہے اور کس نے تجھے یہ حکم

دیا ہے ۔ حاصل جواب مسیح یہ ہے کہ جس کے حکم سے یحییٰ غوطہ دینے والا کرتا تھا (متی باب ۲۱ ورس ۴۳ ، ۴۷) ۔

اب کسی اور تفسیر کی اس مقام پر ضرورت نہیں رہی کیونکہ جس قدر انبیاء علیہ السلام قوم کی طرف مبعوث ہوتے ہیں وہ خدا کی طرف سے ان کے پاس احکام لاتے ہیں اسی طرح حضرت عیسیٰ بھی بنی اسرائیل کی قوم پر مبعوث ہوئے تھے اور خدا کی طرف سے ان کے لیے احکام لائے تھے ۔

ششم ۔ حواریوں کے دل میں ایمان کا ڈالنا

اس کی نسبت خدا تعالیٰ نے سورۂ مائدہ میں فرمایا ہے ۔ ” و اذا و حیت الی الحواریین ان آمنوا بی و برسولی قالوا آمنا و اشہد بانـنـا مسلمون“۔ تمام انبیاء پر خدا تعالیٰ کی بڑی رحمت اس کے حواریوں اور اصحابوں کا پیدا کر دینا ہے ۔ وہ اس کام مین مددگار ہوتے ہیں ۔ رنج و تکلیف کی حالت میں آن سے تسلی ہوتی ہے اسی سبب سے خدا نے حضرت عیسیٰ کو حواریوں کا جو بدل و جاں آن پر فدا تھے ایمان لانا یاد دلایا اور اپنی رحمت اور احسان کو زیادہ وضاحت سے بیان کرنے کے لیے کہا کہ ہم نے حواریوں کو کہا کہ میرے رسول پر ایمان لے آؤ یعنی میں نے ہدایت کی اور کچھ شبہ نہیں ہے کہ ایمان لانا خدا ہی کی ہدایت پر منحصر ہے ۔

ہفتم ۔ اندھوں اور کوڑھیوں کو چنگا کرنا

اس مضمون کو خدا تعالیٰ نے سورۂ آل عمراں مین حضرت عیسیٰ کی زبان سے اس طرح فرمایا ہے کہ ” و ابری الا کمہ و الا برص واحی الموتی باذن اللہ“ اور سورۂ مائدہ مین یوں فرمایا ہے ” و تبری الا کمہ و الابرص باذنی و اذ تخرج الموتی باذنی“ ۔

علمائے اسلام کی عادت ہے کہ قرآن مجید کے معنی یہودیوں اور عیسائیوں کی روایتوں کے مطابق بیان کرتے ہیں اس لیے انھوں نے ان آیتوں کے یہی معنی بیان کیے ہیں کہ حضرت عیسیٰ اندھوں کو آنکھوں والا اور کوڑھیوں کو چنگا کرتے تھے اور مردوں کو جلا دیتے تھے اور صرف تازہ مردوں ھی کو نہیں جلاتے تھے۔ بلکہ ہزاروں برس کے پرانے مردوں کو بھی جلا دیتے تھے چناں چہ تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ نے سام ابن نوح کو اُن کی قبر میں سے بلایا اور وہ زندہ ہو کر قبر میں سے نکل آئے اور اسی قسم کی اور بہت سی بیہودہ روایتیں لکھی ہیں۔

انجیلوں میں بھی اس قسم کے بہت سے معجزے حضرت مسیح کی نسبت بیان ہوئے ہیں مگر نہایت تعجب ہے کہ خود انجیلوں سے ثابت ہے کہ حضرت عیسیٰ نے جب اُن سے فروسیوں اور صدوقیوں نے آسمانی معجزہ طلب کیا تو انھوں نے معجزے کے ہونے سے انکار کیا (دیکھو انجیل متی باب ۱۲ ورس ۳۸ باب ۱٦ ورس ۴ انجیل مارک باب ۸ ورس ۱۲ - انجیل لوک باب ۱۱ ورس ۲۹) پھر کیوں کر اس قدر معجزے حضرت مسیح کی انجیلوں میں مذکور ہیں اور وہ معجزے بھی اس قسم کے ہیں کہ ان کو سن کر تعجب آتا ہے۔ کہیں دیوانے آدمیوں میں سے دیو نکلتے ہیں اور سوروں کے گلہ میں گھس کر اُن کو دریا میں ڈبوتے ہیں۔ کہیں گونگے آدمیوں سے گونگا دیو نکلتا ہے کہیں کپڑا چھونے سے بیمار اچھے ہوتے ہیں اور کہیں صرف یہ کہہ دینا کہ جا تیری مراد پوری ہوئی سخت سے سخت بیماریوں کو اچھا کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔

اگر موجودہ انجیلوں پر تاریخانہ تحقیق سے نظر ڈالی جاوے تو اس سے زیادہ سچ اور کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ یہودی ہمیشہ

جھاڑا پھونکی کی عادت رکھتے تھے - بیماروں کے لیے دعائیں پڑھ کر اُن کی صحت کے لیے اُن پر دم ڈالتے تھے - لوگوں کو برکت دیتے تھے لوگ کاھنوں اور اماموں اور مقدس لوگوں کے ھاتھ چومتے ، پاؤں کو ھاتھ لگانے ، کپڑے کو چھونے یا بوسہ دینے سے برکت لیتے تھے جیسے کہ اب بھی رومن کیتھولک فرقہ میں رواج ھے - انھی کی تقلید سے مسلمانوں میں بھی اس قسم کی بہت سی باتیں رائج ھو گئی ھیں - اسی دستور کے موافق حضرت عیسیٰ بھی بیماروں کو دعا دیتے تھے - اُن پر دم ڈالتے تھے برکت دیتے تھے - لوگ ان کے ھاتھوں کو برکت لینے کے لئے چومتے تھے - قدموں کو ھاتھ لگاتے ، کپڑے کو چھوتے تھے یا چومتے تھے - پس یہ ایک معمولی بات تھی - اس بیان کے ساتھ اس بات کو اضافہ کرنا کہ جو اس طرح کرتا تھا فی الفور چنگا ھو جاتا تھا - اندھے آنکھوں والے ھو جاتے تھے اور کوڑھی اچھے ھوتے تھے اسی قسم کی مبالغہ آمیز تحریریں ھین جیسے کہ ایسے بزرگوں کے حالات لکھنے والے لکھا کرتے ھیں - جب کہ ھم یقین کرتے ھین کہ حضرت عیسیٰ نے معجزہ دکھانے سے انکار کیا تو کہتے ھیں کہ ”صدق کلمۃ اللہ و روح اللہ“ اور جب اُن مبالغہ آمیز بندشوں کو پڑھتے ھیں تو کہتے ھیں کہ ”ھذا بھتان عظیم و روح اللہ و کلمۃ اللہ بری عن ذالک“۔

انجیلوں میں صرف دو جگہ مردوں کے زندہ ھونے کا ذکر ھے - حاکم کی بیٹی کے زندہ کرنے کے قصہ میں تو خود حضرت مسیح نے فرمایا تھا کہ وہ مری نہیں (متی باب ۹ ورس ۲۴) متی کی انجیل جو اور انجیلوں کی نسبت زیادہ معتبر تصور ھو سکتی ھے - اُس میں سوائے اس واقع کے اور کسی مردہ کے جلانے کا مذکور نہیں ھے -

اور انجیل لوک میں ایک بیوہ کے بیٹے کے زندہ کرنے کا ذکر ہے جس کا جنازہ لیے جاتے تھے (ورس ۱۱) مگر اس کا کچھ ثبوت نہیں کہ درحقیقت وہ مر گیا تھا - بہت سے واقع ایسے گذرے ہیں کہ لوگوں نے ایک شخص کو مردہ سمجھ کر اس کی تجہیز و تکفین کی ہے اور بعد کو معلوم ہوا ہے کہ وہ شخص درحقیقت مر نہیں گیا تھا تعجب ہے کہ تمام انجیلوں میں ان واقعوں کے سوا جو نہایت مشتبہ ہیں اور کوئی واقعہ مردوں کے زندہ کرنے کا بیان نہیں ہوا -

مسلمانوں کے حال پر اس سے بھی زیادہ افسوس ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام انبیائے سابقین سے افضل سمجھتے ہیں - انبیائے سابقین کے معجزے تو قرآن میں بتلاتے ہیں مگر افضل الانبیاء کے ایک معجزہ کا بھی ذکر قرآن مجید میں نہیں دکھاتے بلکہ برخلاف اس کے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے خدا نے فرمایا ہے کہ "انما انا بشر مثلکم یوحیٰ الی انما الھکم الہ واحد" اور معجزے ہونے سے بالکل انکار کیا ہے اور فرمایا ہے کہ "قالوا لولا انزل علیہ آیت من ربہ قل انما الایات عنداللہ و انما انا نذیر مبین اور ایک جگہ فرمایا "لا املک نفسی نفعا ولاضرا الا ماشاء اللہ ولو کنت اعلم الغیب لاستکثرت من الخیر وما مسنی السوء ان انا نذیر و بشیر لقوم یومنون اور اسی طرح کی بہت سی آیتیں ہیں - پس خود ہمارے سردار نے معجزوں کی نفی کی ہے - پھر کس طرح ہم معجزوں کو مان سکتے ہیں -

ہاں اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ خدا نے انسان میں ایک ایسی قوت رکھی ہے جو دوسرے انسان میں اور دوسرے

انسان کے خیال میں اثر کرتی ھے اور اس سے ایسے امور ظاھر ھوتے ھیں جو نہایت عجیب و غریب معلوم ھوتے ھیں اور جن میں سے بعض کی علت ھم جانتے ھیں اور بہت سوں کی علت نہیں جانتے بلکہ اس کے عامل بھی اس کی علت نہیں جانتے ھیں ۔ اسی قوت پر اس زمانہ میں ان علوم کی بنیاد قائم ھوئی ھے جو مسمریزم اور اسپریچو ایلزم کے نام سے مشہور اور سابقین بھی اُس کے عامل تھے مگر اس علم سے ناواقف تھے یا اس کو مخفی رکھتے تھے مگر جب کہ وہ ایک قوت ھے قوائے انسانی میں سے اور ھر ایک انسان میں بالقوہ موجود ھے جیسے قوت کتابت تو اُس کا کسی انسان سے ظاھر ھونا معجزہ میں داخل نہیں ھو سکتا کیونکہ وہ تو فطرت انسانی میں سے انسان کی ایک فطرت ھے فافہم و تدبر ۔

قرآن مجید میں لفظ ابری اور تبری کا ھے جس کے معنی اچھا کرنے کے بھی ھیں اور بری کرنے کے بھی ھیں ۔ یہودی شریعت میں برص دو قسم کی قرار پائی تھی ایک وہ قسم تھی جو اس مرض میں بیمار ھوتا تھا یہودی اس کو ناپاک سمجھتے تھے (سفو لیویان باب ۱۳ ورس ۳ ، ۸ ، ۱۲ ، ۱۵ ، ۱٦ ، ۲۰ ، ۲۵ ، ۲۷ ، ۳۱ ، ۳٦ ، ۴۴ ، ۵۲) اور ایک قسم وہ تھی جس کے مریض کو ناپاک نہیں ٹھہراتے تھے (سفر لیویان باب ۱۳ ورس ٦ ، ۱۴ ، ۱۷ ، ۲۳ ، ۲۸ ، ۳۵ ، ۳۷ ، ۳۹) اور جو لوگ برص سے ناپاک قرار پاتے تھے مطلقاً اور وہ لوگ جو اس مرض سے بری کیے جاتے تھے قربانی ھائے معینہ ادا کرنے کے بغیر معبد میں عبادت کے لیے داخل نہیں ھو سکتے تھے ۔

متی کی انجیل سے معلوم ھوتا ھے کہ حضرت عیسٰی سے ایک کوڑھی نے کہا کہ اگر تو چاھے تو مجھے پاک کر سکتا ھے ۔ حضرت عیسٰی نے اُس کو چھوا اُس کا کوڑھ جاتا رھا اور

حضرت عیسیٰ نے اُس کو کہا کہ اپنے تئیں امام کو دکھا اور جو نظر موسیٰ نے مقرر کی ہے اُسے دے (باب ۸ ورس ۲ ، ۴) پاک کرنے کے لفظ سے صاف پایا جاتا ہے کہ اس کا مقصد یہ تھا کہ حضرت عیسیٰ اس کو بتا دیں کہ اُن دونوں قسموں کی کوڑھ میں سے کون سی قسم کی کوڑھ اس کو ہے ۔

اندھے ، لنگڑے اور چوڑی ناک والے کو یا اس شخص کو جس میں کوئی عضو زائد ہو اور ہاتھ پاؤں ٹوٹے ہوئے اور کبڑے اور ٹھنگنے اور آنکھ میں پھلی والے کو معبد میں جانے اور معمولی طور پر قربانیاں کرنے کی اجازت نہ تھی (سفر لیویان باب ۲۱ ورس ۱٦ لغایت ۲۴) یہ سب ناپاک اور گنہگار سمجھے جاتے تھے اور عبادت کے لائق یا خدا کی بادشاہت میں داخل ہونے کے لائق متصور نہ ہوتے تھے ۔

حضرت عیسیٰ نے یہ تمام قیدیں توڑ دی تھیں اور تمام لوگوں کو کوڑھی ہوں یا اندھے ہوں یا لنگڑے چوڑی ناک والے ہوں یا پتلی ناک کے کبڑے ہوں یا سیدھے ۔ ٹھنگنے ہوں یا لمبی پھلی والے ہوں یا جالے والے سب کو خدا کی بادشاہت میں داخل ہونے کی منادی کی تھی ۔ کسی کو خدا کی رحمت سے محروم نہیں کیا ۔ اور کسی کو عبادت کے اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ سے نہیں روکا ۔ پس یہی ان کا کوڑھیوں اور اندھوں کو اچھا کرنا تھا یا ان کو ناپاکی سے بری کرنا ۔ جہاں جہاں انجیلوں میں بیماروں کے اچھا کرنے کا ذکر ہے ۔ اُس سے یہی مراد ہے اور قرآن مجید میں جو یہ آیتیں ہیں ان کے یہی معنی ہیں ۔

انسان کی روحانی موت اس کا کافر ہونا ہے ۔ حضرت عیسیٰ خدا کی وحدانیت قائم کرنے اور خدا کے احکام بتانے سے لوگوں کو اُس موت سے زندہ کرتے تھے اور کفر کی موت کے پنجے سے

نکالتے تھے جس کی نسبت خدا نے فرمایا ''و اذ تخرج الموتی باذنی''۔

مگر ہم نے جو اس مقام پر موت سے کفر اور حیات سے ایمان مراد لیا ہے اُس پر ہم کو کسی قدر بحث کرنی اور یہ ثابت کرنا کہ یہ مراد صحیح ہے ضرور ہے ۔

سورۂ نمل میں خدا تعالیٰ نے کافروں پر موت کا اطلاق کیا ہے جہاں فرمایا ہے کہ ''انک لا تسمع الموتی و لا تسمع الصم الدعا اذا ولو مدبرین و ما انت بهادی العمی عن ضلالتهم ان تسمع الا من یومن با یا تنا فهم مسلمون ، (سورہ نمل) ۔''

یعنی تو ہرگز سنا نہیں سکتا موتے کو اور نہیں سنا سکتا بہروں کو جب وہ پیٹھ پھیر کر پھریں اور تو اندھوں کو اُن کی گمراہی سے راہ پر لانے والا نہیں ہے تو نہیں سنا سکتا مگر اس کو جو ہماری نشانیوں پر ایمان لایا ہے پھر وہ مسلمان ہیں ''۔

موتے کے مقابلے میں ' الامن یومن' کا لفظ واقع ہوا ہے جو صاف اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ موتے کا لفظ کافروں پر اطلاق کیا گیا ہے ۔ مفسرین بھی اس مقام پر کافروں ہی سے مراد لیتے ہیں اور 'موتی' اور 'صم' اور 'اعمی' کے معنی 'کالموتے' 'کالصم' 'کالعمی' بیان کرتے ہیں ۔

سورۂ فاطر میں اس سے بھی صاف طرح پر احیاء و اموات کا لفظ مومن و کافر پر اطلاق ہوا ہے جہاں خدا نے فرمایا ہے کہ : ''و ما یستوی الا حیاء و لا الا موات ان اللہ یسمع من یشاء وما انت بمسمع من فی القبور (سورۂ فاطر) ''۔

یعنی برابر نہیں ہوتے احیاء یعنی زندے اور اموات یعنی مردے اللہ تعالیٰ سنا دیتا ہے ۔ جس کو چاہتا ہے اور تو نہیں سنانے والا ہے اُن کو جو قبروں میں ہیں ''۔

تمام مفسرین اس مقام پر بھی احیاء سے مومن اور اموات سے کافر مراد لیتے ھیں۔ تفسیر کبیر میں لکھا ھے۔ ''ثم قال و ما یستوی الاحیاء ولا الاموات مثلا آخر فی حق المومن و الکافر کانہ قال تعالیٰ حال المومن و الکافر فوق حال الاعمی و البصیر الخ''۔ پس آیت کے صاف معنی ھین کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے احسانوں میں حضرت عیسیٰ کے اُس وقت کو یاد دلایا جب کہ وہ خدا کے حکم سے کافروں کو ایمان والا کرتے تھے خصوصاً ایسی حالت میں کہ اگرچہ حضرت عیسیٰ بنی اسرائیل کے لیے نبی ھوئے تھے مگر وہ اور لوگوں کو بھی جو بنی اسرائیل نہ تھے ھدایت کرتے تھے اور ایمان مین لاتے تھے۔ اُسی حال کی نسبت خدا نے فرمایا۔ و اذ تخرج الموتی باذنی'' یعنی ''و اذ تخرج الکافر من کفرہ باذنی''

نہم اخبار عن الغیب

اس کی نسبت خدا تعالیٰ نے سورۂ آل عمران میں حضرت عیسیٰ کی زبان سے فرمایا ھے کہ ''و انبئکم بما تاکلون وما تدخرون فی بیوتکم ان فی ذالک لا یۃ لکم ان کنتم مومنین''۔

علمائے مفسرین نے جو اپنی تفسیر میں عجیب و لا یعنی باتوں کا لکھنا اپنا فخر سمجھتے ھیں اس آیت کی بھی تفسیر عجیب و غریب کی ھے وہ کہتے ھیں کہ حضرت عیسیٰ چھٹپنے ھی سے مخفی باتوں کی خبر دے دیا کرتے تھے لڑکوں کو جن کے ساتھ کھیلتے تھے بتا دیتے تھے کہ تم نے کیا کھایا ھے اور تمہارے ماں باپ نے فلاں چیز (مثلاً مٹھائی) تم سے چھپا کر رکھ چھوڑی ھے وہ لڑکے گھر میں آ کر ماں باپ سے ضد کرتے آخر کو وہ چیز نکلتی تھی اور وہ لے لیتے تھے۔ بعض مفسرین نے یہ کہا ھے کہ جب مائدہ نازل ھوا تو اُس مین کے کھانے کو جمع کرنے کا حکم نہ تھا مگر لوگ جن پر مائدہ اُترا تھا اُس کو جمع کر رکھتے تھے اور

حضرت عیسیٰ بتا دیتے تھے کہ تم نے کیا کھایا ہے اور کیا جمع کیا ہے۔

تعجب ہوتا ہے کہ ہمارے علما جو نہایت اعلیٰ درجہ کا علم و فضل رکھتے تھے کیوں کر ایسی بیہودہ باتیں لکھ گئے ہیں آیت نہایت صاف ہے اور اس کا مطلب نہایت روشن ہے یہود اور علمائے یہود طرح بہ طرح کے حیلوں اور فریبوں سے ناجائز طور پر لوگوں کا مال مارتے تھے، لوگوں کا مال کھاتے تھے اپنے گھروں میں مال مار مار کر روپیہ دولت جمع کرتے تھے جو بالکل حرام و ناواجب تھا خود خدا تعالیٰ نے سورۂ نساء میں یہودیوں کی نسبت فرمایا ہے۔ ''و اخذ ھم الربوا وقد نھو عنہ و اکلھم اموال الناس بالباطل و اعتدنا للکافرین عذاباً الیما'' (۱۵۹) اور سورۂ توبہ میں فرمایا ہے کہ ''یا ایھا الذین آمنوا ان کثیرا من الاحبار والرھبان لیاکلون اموال الناس بالباطل و یصدون عن سبیل اللہ والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیھم'' (۳۴) پس اسی حرام خوری اور حرام کا مال جمع کرنے کی نسبت حضرت عیسیٰ نے فرمایا ہے کہ میں تم کو بتاؤں گا کہ تم کیا کھاتے ہو۔ اور کیا اپنے گھروں میں جمع کرتے ہو یعنی بتا دوں گا کہ حرام کا مال مارتے ہو اور حرام کی دولت اپنے گھروں میں جمع کرتے ہو نہ کہ یہ بتا دوں گا کہ تم نے کیا کھایا ہے اور کیا گھر میں رکھا ہے۔

یہ ایسی صاف و صریح آیت ہے جس کی تفسیر خود قرآن مجید کی دوسری آیتوں میں موجود ہے مگر افسوس ہے کہ علمائے اسلام نے اس کو بھی ایک افسانہ اور خیالی معجزہ کر کے بیان کیا ہے مگر جس کو خدا نے بصیرت دی ہے وہ صاف سمجھتا ہے کہ نہایت صاف و صریح یہ آیت ہے اور اس کے معنی وہی ہیں جو ہم نے بیان کیے۔

دهم - نزول مائدہ

سورۂ مائدہ میں ذکر ہے کہ حواریوں نے حضرت عیسیٰ سے کہا کہ خدا سے دعا کریں کہ آسمان پر سے ان کے لیے کھانا اُترے - حضرت عیسیٰ نے دعا مانگی - خدا نے کہا کہ میں تم پر کھانا اُتاروں گا لیکن اگر اس کے بعد کسی نے کفر کیا تو میں اُس کو ایسا عذاب دوں گا کہ کسی کو نہ دیا ہوگا -

ہمارے مفسروں نے ان آیتوں کی تفسیر میں نزول مائدہ کی نسبت بہت سے بے سر و پا قصے اور کہانیاں لکھی ہیں جن میں ایک بھی اعتبار کے لائق نہیں ہے اور نہ قرآن مجید کے لفظوں سے اُن قصوں کی تائید ہوتی ہے اور نہ اُن کی نسبت کوئی اشارہ پایا جاتا ہے -

تفسیر کبیر اور تفسیر کشاف اور اسی طرح اور تفسیروں میں بھی یہ روایت لکھی ہے کہ جب حوایوں نے سنا کہ اگر مائدہ اُترنے کے بعد کوئی کفر کرے گا تو اُس کو سخت عذاب ہوگا تو اُنھوں نے کہا کہ ہم مائدہ کا اُترنا نہیں چاہتے - پس کوئی مائدہ نہیں اُترا - کشاف میں لکھا ہے کہ حضرت حسن بصری نے کہا کہ "واللہ ما نزلت" قرآن مجید میں بھی نہیں بیان کیا گیا ہے کہ بعد اس گفتگو کے مائدہ اُترا تھا بلکہ اُترنے کا ذکر نہ ہونا جس کے ذکر ہونے کا موقع تھا - کافی دلیل اس بات پر یقین کرنے کی ہے کہ نزول مائدہ ہرگز وقوع میں نہیں آیا -

حضرت عیسیٰ کا زمانہ ایک ایسا زمانہ تھا کہ بنی اسرائیل میں یہودیت شدت سے پھیلی ہوئی تھی - یہودیوں کی عادت تھی کہ انبیا سے اس قسم کی خواھشیں کیا کرتے تھے - اٹھترویں زبور سے پایا جاتا ہے کہ جب بنی اسرائیل جنگل میں تھے تو یہ لفظ اُنھوں نے بھی کہے تھے کہ " آیا می شود کہ خدا در بیابان سفر را آمادہ

گرداند'' (زبور ۷۸ ورس ۱۹) اس کے بعد خدا نے اُن پر من و سلویٰ نازل کیا تھا ۔ اسی طرح حواریوں نے بھی حضرت عیسٰی سے کہا ''ھل یستطیع ربک ان ینزل علینا مائدۃ من السماء'' اس سے ظاہر ھوتا ھے کہ مائدہ سے ان کی مراد پکا پکایا کھانے سے نہ تھی بلکہ کھانے کی چیزوں کے موجودہ ھونے سے تھی ۔

یہ سوال ایک ایسی طبیعت سے نکلا تھا جو یہودیوں کے خیالات سے بھری ھوئی تھی اس کا جواب بلحاظ ان کی طبیعت کے اس سے زیادہ عمدہ اور کوئی نہیں ھو سکتا تھا کہ خدا کہتا کہ میں تمھارا سوال پورا کروں گا ۔ مگر اس کے بعد جو کوئی گناہ کرے گا تو اس کو سخت عذاب دوں گا ۔ یہودی ان مصیبتوں سے واقف تھے جو بنی اسرائیل کو مصر سے نکلنے اور جنگلوں میں پھرنے کے وقت پڑی تھیں حوارین نے ضرور اس جواب سے خوف کیا ھوگا اور سوال سے باز آئے ھوں گے ۔ جیسا کہ مذکورہ بالا روایت سے پایا جاتا ھے ۔ مروجہ انجیلوں میں یہ قصہ مذکور نہیں ھے مگر کوئی شک کرنے کی جگہ نہیں ھے کہ حضرت عیسٰی کے تمام حالات اور واقعات ان انجیلوں میں مذکور نہیں ھیں ۔

یازدھم ۔ بنی اسرائیل سے بچانا

اس کا بیان خدا تعالیٰ نے سورۂ مائدہ میں اس طرح پر کیا ھے ۔ واذ کففت بنی اسرائیل عنک اذا جئتھم بالبینات فقال الذین کفروا منھم ان ھذا الا سحر مبین ۔

ھمارے مفسرین جو کففت سے یہ معنی نکالتے ھیں کہ خدا نے حضرت عیسٰی کو یہودیوں کے ھاتھ سے بچایا اور اُن کو زندہ آسمان پر اُٹھا لیا ۔ خود اسی آیت سے غلط ثابت ھوتے ھیں کیوں کہ کافر آسمان پر زندہ چلے جانے کو اُسی وقت کھلا ھوا جادو کہتے جب وہ یقین کرتے کہ وہ زندہ آسمان پر چلے گئے حالاں کہ وہ لوگ

اس بات کا یقین نہیں رکھتے بلکہ ان کو یقین ہے کہ انھوں نے حضرت عیسیٰ کو صلیب پر قتل کیا اور اس تفسیر پر کافروں کا یہ قول ''ان ھذا الا سحر مبین صحیح نہیں ہو سکتا اور اگر کافروں کے اس قول کو تبلیغ احکام سے منسوب کیا جائے اور یوں کہا جائے کہ حضرت مسیح کے پر اثر بیان کی نسبت کافروں نے یہ کہا تھا تو پھر ''کففت'' سے حضرت عیسیٰ کے آسمان پر اٹھا لینے سے مراد لینے کی جیسے کہ مفسرین نے لی ہے کوئی وجہ نہیں ہے۔

آیت کا صرف مطلب یہ ہے کہ جب حضرت عیسیٰ خدا کے احکام لے کر بنی اسرائیل کو سمجھانے کو گئے تو انھوں نے حضرت عیسیٰ کو مارنے یا تکلیف دینے کا ارادہ کیا خدا نے اُس سے اُن کو روکا اور حضرت عیسیٰ محفوظ رہے جس کو یا ان کے وعظ کو کافروں نے کہا کہ ''ان ھذا الا سحر مبین''۔

متی کی انجیل میں بھی اس واقعہ کا نشان پایا جاتا ہے جب کہ حضرت عیسیٰ گدھے پر سوار ہو کر بیت المقدس خدا کے احکام سنانے کو گئے اور بہت سے بدعت کے کاموں سے منع کیا اور وہاں کے عالموں کو لاجواب کیا اور متعدد تمثیلیں بیان کیں اور اخیر کو فرمایا کہ ''میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے چھن جائے گی اور ایک قوم کو جو اس کے میوؤں کو لادے دی جاوے گی (بے شک بنی اسماعیل کو) اور جو کوئی اس پتھر پر گرے گا کچل جائے گا اور جس پر یہ گرے گا اُسے پیس ڈالے گا۔ جب سردار اماموں اور فروسیوں نے اس کی تمثیلیں سنیں اُنھوں نے معلوم کیا کہ وہ انھی کے حق میں کہتا ہے تب انھوں نے چاہا کہ اُسے پکڑ لیں پر وے لوگوں سے ڈرے کیوں کہ وے اُسے نبی جانتے تھے (باب ۲۱) پس یہی واقعہ ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے اور اس آیت کو حضرت عیسیٰ کے زندہ آسمان پر چلے جانے سے کچھ بھی تعلق نہیں ہے۔

دواز دہم ـ برأت عن المشرکین

اس مضمون کی آیتیں سورہ مائدہ کے آخیر میں آئی ہیں اور نہایت عمدہ اور دلچسپ اور دل پر اثر کرنے والی ہیں اُن میں حضرت مسیح کے خدا نہ ہونے اور حضرت مسیح کا اپنے تئیں خدا نہ کہنے کا اور جو اُن کو خدا کہتے ہیں اُن سے بیزار ہونے کا بیان ہے مگر وہ مطلب نہایت فصاحت و بلاغت سے خود حضرت مسیح کی زبان سے ادا کیا گیا ہے اس کے ہر ہر لفظ سے اندرونی تہذیب اور اخلاق شائستگی اور خدائے واحد ذوالجلال کا ادب اور اُس کی اعلیٰ قدری اور اُس کے سامنے اپنا عجز و انکسار پایا جاتا ہے ـ یہ طرز کلام ایسا عمدہ ہے کہ پڑھنے والوں اور سننے والوں کے دلوں پر نہایت درجہ کا اثر کرتا ہے اور اس کی سچائی لفظوں کے ساتھ دل میں بیٹھتی جاتی ہے ـ

اس مقام پر اشارہ ہے کہ عیسائی حضرت عیسیٰ اور ان کی ماں حضرت مریم دونوں کو خدا مانتے تھے یہ عقیدہ رومن کیتھولک چرچ کے پیٹرنوں کا تھا انھوں نے ورجن میری حضرت مریم کو خدا کا درجہ دیا تھا اور خدا کی سی تعظیم و ادب کے قابل ٹھہرایا تھا اور حضرت مسیح سے برتر اُن کا رتبہ سمجھتے تھے اور دسویں صدی عیسوی میں حضرت مریم کی خاص پرستش شروع ہو گئی تھی اور روز و شنبہ حضرت مریم کی پرستش کا دن قرار پایا تھا اور اُسی کی نسبت خدا نے فرمایا ہے کہ ''یا عیسیٰ ابن مریم ءانت قلت للناس اتخذونی و امی الھین من دون اللہ'' ـ

پس اس سے یہ مطلب نہیں ہے کہ کل عیسائیوں کا حضرت مریم کی نسبت یہ عقیدہ ہے بلکہ حضرت مریم کی نسبت صرف انھی عیسائیوں کے عقیدہ کی طرف اشارہ ہے جن کا وہ عقیدہ تھا ـ

غزوۂ بدر کا واقعہ قرآن حکیم میں

جنگ بدر کے واقعہ پر مخالفین اسلام نے بہت کچھ الزام لگائے ھین جن کی نسبت بالتفصیل هم بحث کریں گے لیکن اول مختصراً اس واقعہ کو بلا کسی قابل بحث اشارہ کے لکھتے ھیں اور اس کے بعد اس کی بحث طلب جزئیات کو بیان کریں گے -

بدر کا محل وقوع : بدر ایک چشمہ کا نام ھے جو وادیٔ صفرا کے اخیر ینبوع کے قریب بحر احمر کے کنارے کے پاس مدینہ سے تین منزل پر واقع ھے - اس چشمہ کے سبب سے وہ مقام مشہور ھو گیا ھے[1] - عرب میں پانی کی نہایت قات ھے اور جہاں کہیں چشمہ ھوتا ھے وہ جگہ مشہور اور نہایت عزیز ھو جاتی ھے - آنحضرت کی جس لڑائی کا سورۂ انفال میں ذکر ھے وہ اسی مقام پر ھوئی تھی اور اسی لیے جنگ بدر کے نام سے مشہور ھے -

قافلہ قریش : شام کے ملک سے قریش کا ایک قافلہ جس میں تیس چالیس آدمی تھے ابی سفیان کے ساتھ بہت سا مال و اسباب لیے ھوئے مکہ کو آتا تھا - انھی دنوں مکہ کے قریش نے بہت سے آدمی لڑائی کے لیے جمع کیے اور مکہ سے کوچ کیا - انھی دنوں میں

۱- بدر بالفتح ثم السکون ماء مشهور بین مکة و المدینة اسفل وادی الصفراء بینیه و بین الجار و هو ساحل البحر لیلة به الواقعه المشهورة بین النبی صلعم و اهل مکة - (مرا صد الاطلاع) -

رسول خدا صلی الله علیه وسلم نے تین سو لڑنے والے لوگوں کے ساتھ مدینہ سے کوچ کیا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مقام بدر پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مکہ کے قریش سے لڑائی ہوئی ۔ یہ واقعہ ۲ ھجری میں واقع ہوا ۔

قریش کی پیش قدمی کا سبب : اب چند امور اس میں بحث طلب ھیں ۔ اول یہ کہ ۔ مکہ کے قریش نے کیوں لڑائی کے لیے لوگ جمع کیے تھے اور کیوں لڑنے کے ارادہ سے نکلے تھے ۔ تمام مسلمان مورخ لکھتے ھیں کہ قریش مکہ کو یہ خبر پہنچی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارادہ ابی سفیان والے قافلے کو لوٹنے کا ھے اس لیے انھوں نے اس قافلہ کے بچانے کو لوگ جمع کیے اور لڑئی کے ارادہ سے نکلے ۔

اگر یہ روایتیں صحیح مان لی جاویں تو بھی یہ بات لازم نہیں آتی کہ جو خبر اُن کو پہنچی تھی وہ صحیح تھی اور درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارادہ اُس قافلے کو لوٹنے کا تھا ۔ علاوہ اس کے جب کہ قریش مکہ نے بہت سے لڑنے والے آدمی جمع کر کے لڑائی کے ارادہ پر کوچ کیا تھا تو اس بات کا کسی طرح سے یقین نہیں ھو سکتا کہ اُن کا ارادہ صرف اُسی قافلہ ھی کی حفاظت کا تھا اور خاص مدینہ پر چڑھائی کرنے کا نہ تھا ۔ بلکہ دو دلیلیں ایسی صاف ھیں جن سے پایا جاتا ھے کہ ان کا ارادہ اس سے زیادہ تھا ۔ اس لیے کہ انھوں نے اس قدر آدمی جمع کیے تھے اور لڑائی کا سامان اور نفیر عام اس طرح پر کی تھی جو قافلہ کی حفاظت کی ضرورت سے بہت زیادہ تھی اور جب کہ وہ قافلہ خدشہ کے مقام سے بچ کر نکل گیا اُس وقت بھی انھوں نے کوچ کو اور لڑائی کے ارادہ کو موقوف نہیں کیا اور اگر فرض کیا جاوے کہ اُن کا ارادہ اُس قافلہ ھی کے بچانے کا تھا تب بھی اھل مدینہ کو کسی طرح

اس بات پر طمانیت نہیں ہو سکتی تھی کہ اُن کا ارادہ مدینہ پر حملہ کرنے کا نہیں ہے بلکہ جو عداوت اہل مکہ کو مہاجرین اور مدینہ کے انصار سے تھی اور جس پر حملہ کرنے اور غارت کرنے کی وہ ہمیشہ دھمکی دیتے تھے اور اُس کے خواہش مند بھی تھے وہ ایک قوی دلیل اس خیال بلکہ یقین کرنے کی تھی کہ وہ ضرور مدینہ پر بھی حملہ کریں گے ۔

دوسرے یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں مدینہ سے بقصد جنگ، کوچ کیا تھا ۔ تمام مسلمان مورخوں کا جن کی عادت میں داخل ہے کہ بلا سند روایتوں اور غلط و صحیح افواہوں کو بلا تصحیح و تنقید اپنی کتابوں میں لکھتے ہیں اور انھی پر بناء واقعات قائم کرتے ہیں یہ قول ہے کہ آنحضرت اور اُن کے صحابہ نے یہ بات خیال کر کے کہ ابی سفیان کے ساتھ کے قافلہ میں لوگ بہت تھوڑے ہیں اور مال بہت زیادہ ہے لوٹ لینے کا ارادہ کیا تھا اور اسی وجہ سے کوچ کیا تھا اُس کی خبر جب قریش مکہ کو پہنچی تو انھوں نے نفیر عام کی اور قافلہ کے بچانے کو نکلے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ قریش کے ساتھ لڑنے اور اُن کے قافلہ کو لوٹنے کا قصد اول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا اور اُس کے دفع کرنے کو قریش بقصد لڑائی نکلے ۔

کیا مسلمان قافلہ قریش کو لوٹنا چاہتے تھے : ان مسلمان مورخوں کی نادانی اور غلطی سے مخالفین مذہب اسلام کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کی نسبت قافلوں کے لوٹنے کا جو پیغمبر کی شان کے شایاں نہیں ہے اور بلا سبب لڑائی کی ابتداء کرنے کے الزام لگانے کا موقع ہاتھ آیا ہے اور بہت زور شور سے اُن الزاموں کو قائم کیا ہے لیکن اُس زمانہ کی حالت پر اور جو طریقہ دشمنوں کے ساتھ پیش آنے کا اُس زمانہ میں بلا اعتراض کے

مروج تھا اگر اُس پر لحاظ کیا جاوے تو ایسا کرنے مین بھی اگر کیا گیا ھو کوئی مقام اعتراض کا نہیں ھو سکتا اور اگر ھم اس طریقہ تعجب انگیز کا جو حضرت موسیٰ نے اپنے دشمنوں کے ساتھ اختیار کیا تھا اس کے ساتھ مقابلہ کریں تو معلوم ھوگا کہ اگر ایسا کیا گیا بھی ھو تو حضرت موسیٰ کے برتاؤ سے بہت ھی خفیف درجہ رکھتا ھے -

مگر درحقیقت یہ الزام محض غلط اور بے بنیاد ھیں اور وہ حدیثیں اور روایتیں جن کی بناء پر وہ الزام قائم کیے ھین از سر تا پا غلط اور غیر مستند ھیں - قرآن مجید میں یہ واقعہ نہایت صفائی سے مندرج ھے اور اُس میں صاف بیان ھوا ھے کہ کس گروہ کے مقابلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقابلہ کے قصد سے کوچ فرمایا تھا آیا قافلہ لوٹنے کے ارادہ سے یا اُس گروہ کے مقابلہ کے لیے جس کو قریش مکہ نے لڑنے کے ارادے سے جمع کر کے کوچ کیا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوچ فرمانا قریش مکہ کے کوچ کرنے کے بعد ھوا تھا یا اُس کے قبل ھوا تھا -

یہ الزام محض غلط ھے - ھم قرآن مجید کی آیتوں سے ثابت کریں گے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال بھی اُس قافلہ کے لوٹنے کا نہ تھا اور قریش مکہ کے بقصد جنگ فوج کثیر کے ساتھ کوچ کرنے کے بعد جس سے ھر طرح مدینہ پر اُن کا ارادہ حملہ کرنے کا پایا جاتا تھا اور ادنیٰ درجہ یہ کہ بوجہ قوی احتمال ھوتا تھا مدینہ کی حفاظت کی غرض سے کوچ کیا تھا اور جب کہ قرآن مجید کی آیتوں سے یہ امر ثابت ھوتا ھے تو کوئی روایت یا کوئی حدیث جو اس کے برخلاف ھو اور کسی کتاب میں مندرج ھو اور کسی نے روایت کی ھو عقلاً و نقلاً مردود ھے - عقلاً میں نے اس لیے کہا کہ جو لوگ مسلمان نہیں ھیں اگر صرف

تاریخانہ اصول پر نظر رکھیں تو بھی وہ اس بات کو تسلیم کریں گے
یہ زبانی روایتیں جو ایک زمانہ بعد تحریر میں آئیں قرآن مجید کے
مقابلہ میں جب کہ آن دونوں میں اختلاف ہو قابل قبول اور
لائق وثوق نہیں ہو سکتیں ۔

سورۂ انفال کی پانچویں آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر یعنی مدینہ ہی میں تھے
اور وہاں سے کوچ بھی نہیں کیا تھا کہ آپس میں صحابہ کے اختلاف
تھا ۔ بعض تو لڑنے کے لیے نکلنا پسند کرتے تھے اور بعضے
ناپسند کرتے تھے جو لوگ لڑنے کے لیے نکلنا نا پستد کرتے تھے
آس کی وجہ چھٹی آیت میں بیان ہوئی ہے کہ ''گویا وہ موت کی
طرف ہانکے جاتے ہیں اور وہ اپنے مارے جانے کو دیکھتے ہیں''۔

ادنیٰ تامل سے معلوم ہوتا ہے کہ ابی سفیان کا قافلہ جو
شام سے آتا تھا آس میں نہایت قلیل آدمی تھے ان سے لڑنے کے لیے
کوچ کرنے میں اور آس کے لوٹنے میں ایسی کوئی خوف کی بات
نہ تھی ، بلکہ یہ خوف قریش مکہ کی آس فوج سے تھا جو آنھوں
نے نفیر عام کے بعد جمع کی تھی اس سے لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے
کہ قبل اس کے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہٗ وسلم مدینہ سے کوچ
فرماویں قریش مکہ لڑنے کو نکل چکے تھے یا آمادہ جنگ
ہو چکے تھے ۔

اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ اس آمادگی جنگ کے بعد اور
مدینہ سے کوچ کرنے سے قبل بعض صحابہ کی یہ رائے ہوئی کہ
شام کے قافلہ کو لوٹ لیا جاوے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان
مؤرخوں اور راویوں نے آس رائے کو جو بعض صحابہ نے دی تھی
غلطی سے اس طرح پر بیان کیا ہے کہ گویا پیغمبر خدا صلی اللہ
علیہ وسلم کا ارادہ قافلہ کو لوٹنے ہی کا تھا اور جو آمادگی جنگ

مدینه میں ھوئی تھی وہ قافلہ کے لوٹنے کے لیے ھوئی تھی - زمانۂ دراز کے بعد کسی واقعہ کے بیان میں جو افواھی چلا آتا ھو اس قسم کی غلطی کا واقعہ ھونا کوئی تعجب کی بات نہیں ھے مگر قرآن مجید سے صاف ظاھر ھے کہ وہ زبانی روایتیں غلط ھیں بلکہ جو آمادگی جنگ کی مدینہ میں ھوئی تھی وہ بمقابلہ قریش مکہ کے ھوئی تھی نہ واسطے لوٹنے قافلہ کے -

اسی سورہ کی چھٹی آیت میں جو جملہ ''بعد ما تبین'' آیا ھے وہ اس پر دلالت کرتا ھے کہ خدا تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر منکشف کر دیا تھا کہ اس لڑائی میں مسلمانوں کو فتح ھوگی - اس کے بعد ساتویں آیت میں دو گروھوں کا ذکر ھے - ایک وہ گروہ جس کے ساتھ کچھ شان و شوکت یعنی لڑائی کا سامان نہ تھا ، اس گروہ سے وہ قافلہ مراد ھے جو شام سے آتا تھا اور جس کے ساتھ صرف تیس چالیس آدمی تھے اور دوسرا گروہ قریش مکہ کا تھا جس کے ساتھ بہت سا لشکر اور بہت کچھ شان و شوکت تھی - خدا نے کہا کہ ان دونوں گروھوں میں سے ایک گروہ تمھارے لیے ھے تم اس بے شان و شوکت گروہ کو لینا چاھتے ھو مگر خدا چاھتا ھے کہ جو حق بات ھے یعنی دین اسلام وہ ثابت ھو جاوے اور کافروں کی جڑ کٹ جاوے پس اس آیت سے بخوبی ثابت ھوتا ھے کہ لڑنے کا حکم قریش مکہ کے مقابلہ کے لیے تھا نہ اُس قافلہ کے لوٹنے کے لیے -

ساتویں آیت سے چھٹی آیت کے مضمون کی بھی زیادہ تشریح ھوتی ھے کہ بعض صحابہ جو لڑائی کے لیے نکلنے کو ناپسند کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ گویا اُن کو موت کی طرف ھانکا جاتا ھے اور وہ اپنے مارے جانے کو دیکھ رھے ھیں اُس خوف کا سبب یہی تھا کہ ان کو قریش مکہ کے مقابلہ میں نکلنے کا حکم

هوا تھا جو لشکر کثیر کے ساتھ لڑائی کو نکلا تھا اور جس سے یقین یا احتمال قوی مدینہ پر اور مہاجرین اور انصار پر حملہ کرنے کا تھا نہ اُس قافلہ پر حملہ کرنے کا جس کے ساتھ کچھ شان و شوکت یعنی سامان جنگ نہ تھا ۔

بیان مذکورہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ خود قرآن مجید سے مندرجہ ذیل امر ثابت ہوتے ہیں ۔

اول یہ کہ مدینہ ھی میں اور مدینہ سے کوچ کرنے سے پہلے یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ قریش مکہ لشکر کثیر کے ساتھ جنگ کے ارادہ سے نکلے ہیں ۔

دوسرے یہ کہ مدینہ ھی میں خدا نے حکم دے دیا تھا کہ قریش مکہ کے مقابلہ میں لڑنے کو جاؤ اور جن صحابہ نے اس درمیان میں قافلہ لوٹنے کی رائے دی تھی خود خدا تعالیٰ نے مدینہ ھی میں اس کو نامنظور کیا تھا ۔

اب ھم اگر اُن روایتوں پر جو قرآن مجید کے برخلاف نہیں اعتبار کریں تو معلوم ہوتا ہے اور جو واقعات پیش آئے اُن سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ مدینہ سے جو لوگ لڑنے کو نکلے وہ قریش مکہ کے مقابلہ اُن کے حملہ کے دفع کرنے کے لیے نکلے تھے نہ قافلہ لوٹنے کے لیے ۔

سیرت ھشامی میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے مکہ کی طرف کوچ فرمایا اور اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ کوچ قریش مکہ کے مقابلہ میں تھا نہ شام کے قافلہ پر کیوں کہ وہ قافلہ شام سے آتا تھا جو مدینہ سے جانب شمال واقع ہے اور مکہ جانب جنوب اور شام سے قافلہ کے مکہ میں آنے کا رستہ مدینہ سے جانب غرب پڑتا ہے ۔ پس اگر قافلہ پر حملہ کرنے کے لیے کوچ کیا جاتا تو مدینہ سے غرب کی جانب کا راستہ اختیار

کیا جاتا نہ جنوب کا ۔ '' قال ابن اسحاق فسلک طریقة من المدینة الی مکة''۔ (صفحہ ۳۳۴)

سیرت ہشامی میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے نکل کر نقب المدینہ میں تشریف لائے پھر وہاں سے عقیق میں ، وہاں سے ذوالحلیفہ میں ، وہاں سے اولات الجیش میں یا ذات الجیش میں وہاں سے تربان میں وہاں سے ملل میں وہاں سے غمیس الحمام میں ، وہاں سے صخیرات الیمام میں ، وہاں سے سیالہ میں ، وہاں سے فج الرجاء میں وہاں سے شتوکہ میں اور جب عرق الظبیہ میں پہنچے تو وہاں ایک عرب ملا (غالباً مکہ سے آنے والا تھا) اس سے لوگوں کا حال پوچھا مگر اس نے کچھ نہیں بتلایا پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے چل کر سجسج میں ٹھہرے پھر وہاں سے چلے اور جب منصرف میں پہنچے تو بائیں طرف مکہ کا راستہ چھوڑ دیا اور دائیں طرف پھرے اور نازیہ ہو کر بدر جانے کا ارادہ کیا اور رحقان اور وہاں سے مضیق الصفرا میں پہنچے اور بسبس بن عمرالجہنی اور عدی بن الرغباء الجہنی کو ابو سفیان کی اور اور لوگوں کی (یعنی قریش مکہ کی) خبر دریافت کرنے کو روانہ کیا اور مضیق الصفرا کو بائیں طرف چھوڑ کر دائیں طرف چلے اور وادی ذفران میں پہنچے وہاں قریش کے آنے کی خبر ملی ۔

ذفران کے مقام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام لوگوں سے جن میں انصار بھی شامل تھے قریش کے بڑھے چلے آنے کی خبر کی اور سب کو لڑنے مرنے پر مستعد پایاتب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے ثنایا یعنی اصافر پر گئے اور وہاں سے دبہ میں اترے اور وہاں سے قریب بدر پہنچ کر مقام کیا اور تحقیق خبر ملی کہ قریش مکہ کا لشکر یہاں سے بہت قریب پڑا ہوا ہے انجام کار دونوں لشکروں میں لڑائی ہوئی ۔

تمام مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ اس سے پہلے شام کا قافلہ جس کے ساتھ ابی سفیان ابن حرب تھا سمندر کے کنارے کنارے ہو کر نکل گیا تھا اور بدر میں نہیں آیا تھا ۔ چناں چہ تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ :

فخرج ابوجهل بجميع اهل مكة و هم النفير فى المثل السايرلا فى العير و لا فى النفيز فقيل له، العير اخذت طريق الساحل و نجت فارجع الى مكة بالناس فقال لا و الله لايكون ذالك ابدا ۔ (تفسیر کبیر جلد ۳ صفحه ۳٦۴) ۔

یعنی جب ابوجہل مکہ سے لوگوں کو لے کر نکلا تو اس سے کہا گیا کہ قافلہ نے سمندر کے کنارہ کا رستہ لیا اور بسلامت چلا گیا ۔ اب مکہ کو پھر چلو اس نے کہا کہ خدا کی قسم ایسا نہ ہوگا ۔

پس یہ تمام واقعات ثابت کرتے ہیں کہ مدینہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا لڑائی کے لیے نکلنا صرف قریش مکہ کے مقابلہ میں اور ان کے حملہ کے دفع کرنے کی غرض سے اور مدینہ کو جہاں مہاجرین نے پناہ لی تھی اور مہاجرین اور انصار کو قریش کے حملہ سے بچانے کے لیے تھا ۔ ہر ایک لائق شخص جس کو خدا نے معاملات جنگ کے سمجھنے کی لیاقت دی ہو بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ اگر حملہ آور قریش مدینہ کی دیواروں تک پہنچ جاتے تو ان کا روکنا اور ان کے حملہ کو دفع کرنا ناممکن تھا ۔ مہاجرین کو وہاں گئے ہوئے پورے دو برس بھی نہیں ہوئے تھے مدینہ میں جن لوگوں نے ان کو پناہ دی تھی اور دل و جان سے مہاجرین کے مدد گار تھے اور جو انصار کہلاتے تھے ان کی تعداد بھی بمقابلہ آبادی مدینہ اور اس کے گرد و نواح کے کچھ زیادہ نہ تھی پس

جب کہ اہل مدینہ یہ حالت دیکھتے کہ ان لوگوں کے سبب سے مدینہ پر کیا آفت آئی ہے اور غنیم نے اُن کو گھیر لیا ہے تو ان سب کی حالت بالکل بدل جاتی اور حملہ آوروں کا حملہ دفع کرنا غیر ممکن ہو جاتا اور اس لیے ضرور تھا کہ مدینہ سے آگے بڑھ کر ان کا مقابلہ کیا جاوے اور جو کچھ خدا کو کرنا منظور ہو وہ مدینہ سے باہر ہو جاوے - اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے مقابلہ کے لیے مدینہ سے باہر نکلنا اور آگے بڑھ کر اُن کو روکنا ضرور سمجھا تھا اب کون شخص ہے جو ان واقعات کو انصاف کی نظر سے دیکھ کر اُن کو کسی الزام کی بنیاد قرار دے سکتا ہے -

بدر کی لڑائی میں خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح دی اور دشمنوں کا مال و اسباب ان کے ھاتھ آیا زمانہ جاھلیت میں غنیمت کے مال کا یہ دستور تھا کہ تقسیم ہونے سے پہلے سردار لشکر جو چاھتا تھا پسند کرتا تھا اور بر وقت تقسیم چوتھ یعنی چہارم حصہ سردار لشکر کو دیا جاتا تھا اور باقی لڑنے والوں اور فتح کرنے والوں میں تقسیم ھوتا تھا اور خاص کسی شخص کے ھاتھ جو مال آتا تھا وہ اس کو اپنی ملکیت سمجھتا تھا - غالباً فتح کرنے والوں میں نسبت کسی مال غنیمت کے اس قسم کا جھگڑا پیدا ھوا کہ کوئی اس کو اپنی خاص ملکیت قرار دیتا تھا اور کوئی اپنی ملکیت اور کوئی مشترک ہونے کا دعویٰ کرتا تھا اور اُس وقت تک مسلمانوں کے غنیمت کے مال کی نسبت کوئی حکم نازل نہیں ھوا تھا اس لیے لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے غنیمت کے مال کی نسبت پوچھا - اُس پر یہ حکم ملا کہ مال غنیمت کسی کی ملکیت نہیں ہے - بلکہ خدا اور خدا کے رسول کی ملکیت ہے - رسول کا نام لینے سے یہ مدعا نہیں ہے کہ رسول کی ذاتی ملکیت ہے بلکہ اس

طرح کے کلام سے صرف خدا ہی کی ملکیت ہونا مراد ہے خدا کی ملکیت قرار دینے سے یہ مراد ہے کہ کوئی خاص شخص اس پر دعوی نہیں کرسکتا بلکہ خدا جس طرح پر حکم دے گا اس طرح پر کیا جاوے گا ۔

سورۂ انفال کی بیالیسویں آیت میں یہ حکم آیا کہ مال غنیمت میں سے خمس خدا و خدا کے رسول کے لیے ہے یعنی خدا کے لیے ہے جو قرابت مندوں اور غریبوں اور یتیموں اور مسافروں کے فائدے کے لیے رہے گا اور چار خمس ان لوگوں میں جو لڑتے تھے یا لڑائی کے متعلق کاموں میں مصروف تھے تقسیم کیا جاوے گا ۔ جو رسم کہ زمانہ جاہلیت میں تھی اس سے یہ حکم تین باتوں میں مختلف تھا ۔

اول ۔ سردار کی چوتھ موقوف کرنے اور خدا کے لیے خمس نکالنے میں ۔

دوم ۔ عام طور پر کسی خاص مال پر کسی کا حق نہ ہونے میں ۔

سوم ۔ جو لوگ عین لڑائی میں موجود تھے اور جو لوگ لڑائی کے متعلق کسی کام پر متعین تھے ان کو بھی مال غنیمت میں سے حصہ ملنے میں ۔ یہ تمام احکام اور خصوصاً خمس کا نکالنا ایسے عمدہ احکام ہیں کہ ان سے بہتر اور مفید تر کوئی حکم بھی مال غنیمت کی نسبت نہیں ہو سکتا ۔

جنگ بدر میں فرشتوں کی آمد کی حقیقت :

لڑائی میں فرشتوں سے مدد کرنے کا مضمون سورۂ انفال میں اور آل عمران میں ور سورۂ توبہ میں آیا ہے[1] ان تینوں مقام کے طرز بیان میں کسی

---

[1] اذ تقول للمومنین الن یکفیکم ان یمدکم ربکم بثلاثة الاف من الملئکة منزلین ۔ (۱۲۵ سورۂ آل عمران)

بلیٰ ان تصبرو او تتقوا یاتوکم من فورھم ھذا یمدد کم ربکم بخمسة الاف من الملئکة مسومین ۔ (آیت ۱۲۶ سورہ ل عمران)

اذ ستغیثون ربکم فاستجاب لکم انی ممدکم بالف من الملئکة مردفین ۔ (آیت ۹ سورۂ انفال) ۔

قدر تفاوت ھے - سورۂ آل عمران میں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول استفہاماً ھے کہ کیا فرشتوں سے خدا کا مدد کرنا تم کو کافی نہیں ھے - اور سورۂ انفال میں خدا نے کہا ھے کہ میں فرشتوں سے مدد کروں گا - یہ دونوں آیتیں تو بدر کی لڑائی سے علاقہ رکھتی ھیں اور سورۂ توبہ میں جو آیت ھے وہ حنین کی لڑائی سے متعلق ھے اُس میں فرشتوں کا لفظ نہیں ھے بلکہ ایک ایسے لشکر کے بھیجنے کا ذکر ھے جو دکھائی نہیں دیتا تھا اب اس باب میں چند امور تحقیق طلب ھیں -

اول یہ کہ در حقیقت لڑنے کے لیے فرشتے آئے تھے یا نہیں فرشتوں کے لڑائی کے لیے آنے سے ابو بکر اصم نے انکار کیا ھے اور جو بحث کہ اُنھوں نے اس پر کی ھے وہ ھم نے سورۂ آل عمران کی تفسیر میں لکھی ھے اب اس جگہ اس امر کی تحقیق کرنی چاھتے ھیں جس کا وعدہ سورہ آل عمران کی تفسیر میں کیا تھا -

ھمارے نزدیک نہ اُن لڑائیوں میں ایسے فرشتے جن کو لوگ ایک مخلوق جداگانہ اور متحیز بالذات مانتے ھیں آئے تھے اور نہ خدا نے ایسے فرشتوں کے بھیجنے کا وعدہ کیا تھا اور نہ قرآن مجید سے ایسے فرشتوں کا آنا یا خدا تعالی کا ایسے فرشتوں کے بھیجنے کا وعدہ کرنا پایا جاتا ھے - اگر ھم حقیقت ملائکہ کی بحث کو الگ رکھیں اور فرشتوں کو ویسا ھی فرض کر لیں جیسا کہ لوگ مانتے ھیں تو بھی قرآن مجید سے اُن کا فی الواقع آنا یا لڑائی میں شریک ھونا ثابت نہیں ھے - سورۂ آل عمران کی پہلی آیت میں تو صرف استفہام ھے کہ اگر خدا تین ھزار فرشتوں سے مدد کرے تو کیا تم کو کافی نہ ھوگا - اور دوسری آیت میں ھے کہ اگر تم لڑائی میں صبر کرو گے تو خدا پانچ ھزار فرشتوں سے تمھاری مدد کرے گا مگر ان دونوں آیتوں سے اُس کا وقوع یعنی فرشتوں کا آنا کسی

طرح ظاہر نہیں ہوتا ۔ سورۂ انفال کی آیت میں خدا نے کہا
کہ میں تمھاری ہزار فرشتوں سے مدد کروں گا مگر اس سے بھی
فرشتوں کا فی الواقع آنا نہیں پایا جاتا ۔ اس پر یہ خیال کرنا کہ اگر
مدد موعودہ وقوع میں نہ آئی ہو تو خدا کی نسبت خلف وعدہ کا
الزام آتا ہے صیح نہیں ہے کیوں کہ مدد کی حاجت باقی نہ رہنے
سے مدد کا وقوع میں نہ آنا خلف وعدہ نہیں ہے ۔ مسلمانوں کی خدا
کی عنایت سے فتح ہو گئی تھی اور فرشتوں کو تکلیف دینے کی
ضرورت باقی نہیں رہی تھی ۔ یہ کہنا کہ وہ فتح فرشتوں کے آنے
کے سبب سے ہوئی تھی اس لئے صیح نہیں ہے کہ اس کے لیے اول
قرآن مجید سے فرشتوں کا آنا ثابت کرنا چاہئے اُس کے بعد کہا جا
سکتا ہے کہ فرشتوں کے آنے سے فتح ہوئی تھی ۔ روایتوں کو فرشتوں
کے آنے پر سند لانا کافی نہیں ہے اول تو وہ روایتیں ہی معتبر و
قابل اسناد نہیں ہیں ۔ دوسرے خود اُن کے مضمون ایسے
بے سر و پا خیالی ہیں جن سے کسی امر کا ثبوت حاصل نہیں ہو سکتا
خصوصاً اس وجہ سے کہ خود راوی فرشتوں کو دیکھتے نہیں تھے ۔

بر خلاف اس کے قرآن مجید سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی ایک
فرشتہ بھی نہیں آیا تھا دونوں صورتوں میں اُس آیت کے بعد جس
میں فرشتوں کے بھیجنے کو کہا ہے یہ آیت ہے "وما جعلہ اللہ
الا بشری لکم لتطمئن قلوبکم ما النصر الا من عنداللہ
العزیز الحکیم" یعنی اور نہیں کیا اُس کو اللہ نے مگر خوشبری
تمھارے لیے تا کہ مطمئن ہو جاویں اس سے تمھارے دل
اور فتح نہیں ہے مگر اللہ کے پاس سے بے شک اللہ غالب ہے
حکمت والا ۔ یہ بات غور کے لائق ہے کہ "ما جعلہ" میں جو
ضمیر ہے وہ کس کی طرف راجع ہے ۔ امام رازی صاحب فرماتے
ہیں کہ ضمیر راجع ہے طرف مصدر کے جو کہ گو صریحاً مذکور

نہیں ہے مگر لفظ ''یمدکم'' میں ضمناً داخل ہے یعنی ما جعله الله المدد والامداد الا بشریٰ اور زجاج کا قول ہے کہ ما جعله الله ای ذکر المدد الا بشریٰ - مگر امام رازی صاحب نے جو فرمایا ہے وہ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا اس لیے کہ خدا نے کہا تھا کہ میں تمہاری فرشتوں سے مدد کروں گا پھر فرمایا کہ وہ یعنی یہ کہنا کہ میں تمہاری فرشتوں سے مدد کروں گا صرف خوشخبری تھی پس اعلانیہ سیاق عبارت سے ظاہر ہے کہ ''ما جعله'' کی ضمیر قول امداد یا ذکر امداد کی طرف راجع ہے جیسا کہ زجاج کا قول ہے نہ بطرف مصدر کے جو مذکور بھی نہیں ہے - البتہ اس صریح و صاف مرجع ضمیر کو چھوڑ کر مصدر کی طرف اُس صورت میں ضمیر راجع ہو سکتی ہے کہ اول وقوع اُس مدد کا یعنی فرشتوں کا آنا ثابت ہو جاوے اور وہ ابھی تک ثابت نہیں ہوا اور اس لیے مصدر کی طرف ضمیر کا راجع کرنا ٹھیک نہیں ہے -

''ما جعله'' پر ''مانا فیه'' ہے جو عام طور پر نفی کرتا ہے اور اس لیے سورۂ آل عمران کی آیت کے صاف معنی یہ ہیں کہ نہیں کیا خدا نے پیغمبر کے اس قول کو کہ کیا تمہارے لئے کافی نہیں کہ تمہارا پروردگار فرشتوں سے تمہاری مدد کرے - کوئی چیز مگر بشارت یعنی صرف بشارت تا کہ تمہارے دل مطمئن ہو جاویں اور سورۂ انفال کی آیت کے صاف معنی یہ ہیں کہ جب تم نے خدا سے فریاد کی اور اُس نے تمہاری فریاد کو قبول کیا کہ میں فرشتوں سے تمہاری مدد کروں گا تو نہیں کیا خدا نے اس قبول کرنے کو جس کے ساتھ فرشتوں سے مدد دینے کو کہا تھا کوئی چیز مگر بشارت تا کہ تمہارے دل مطمئن ہو جاویں اور یہ طرز کلام قطعاً اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ کوئی ایسا فرشتہ جیسا کہ لوگ خیال کرتے ہیں لڑائی کے میدان میں نہیں آیا تھا -

یہ تمام تقریر اس صورت میں تھی جب کہ ملائکہ کو ایک ایسا وجود خارجی متحیز بالذات تسلیم کیا جاوے جیسے کہ عموماً تسلیم کیا جاتا ہے اور جو مشکلیں ان آیتوں کے معنوں کے حل کرنے میں پیش آتی ہیں اور موضوع روایتوں اور جھوٹے اور بے معنی قصوں سے استدلال کرنے کی احتیاج پڑتی ہے وہ اسی صورت میں ہے پڑتی اگر ٹھیک طور پر قرآن مجید کو سمجھا جاوے اور جو اس کا طرز کلام ہے اس کو ہمیشہ پیش نظر رکھا جاوے تو کوئی مشکل پیش نہیں آتی اور خدا اور اس کے کلام کی عظمت و شان اور خدا کی قدرت کاملہ کا سچا اثر انسان کے دل پر پڑتا ہے -

فتح کے اتفاقی اسباب سے جو بعض اوقات آفات ارضی و سماوی کے دفعةً ظہور میں آنے سے ہوتے ہیں قطع نظر کرکے دیکھا جاوے کہ ان لوگوں پر کیا کیفیت طاری ہوتی ہے جو فتح پاتے ہیں ان کے قوائے اندرونی جوش میں آتے ہیں - جرأت ، ہمت ، صبر ، شجاعت ، استقلال ، بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے اور یہی قویٰ خدا کے فرشتے ہیں جن سے خدا فتح مندوں کو فتح دیتا ہے اور اس کے برخلاف حالت یعنی بزدلی اور رعب ان لوگوں پر طاری ہوتا ہے جن کی شکست ہوتی ہے - پس ان آیتوں میں خدا تعالیٰ نے وعدہ کیا کہ میں فرشتوں سے تمہاری مدد کروں گا مگر وہ بجز خوشخبری فتح کے اور کچھ نہیں ہے جس کے سبب تم میں ایسے قویٰ بر انگیختہ ہوں گے جو فتح کے باعث ہوں گے - تمہارے دل قوی ہو جاویں گے لڑائی میں تم ثابت قدم رہو گے - جرأت ، ہمت شجاعت کا جوش تم میں پیدا ہوگا اور دشمنوں پر فتح پاؤ گے -

یہ معنی ان آیتوں کے ہم نے پیدا نہیں کیے ہیں بلکہ خود خدا نے یہی تفسیر اپنے کلام کی کی ہے جہاں اسی سورہ میں اور اسی واقعہ کی نسبت فرمایا ہے کہ "اذ یوحیٰ ربک الی الملائکۃ

انی معکم فثبتوا الذین امنوا سالقی فی قلوب الذین کفروا الرعب " یعنی جب تیرا پروردگار فرشتوں کو وحی بھیجتا تھا (یہ وھی فرشتے ھیں جن کے بھیجنے کا مدد کے لیے وعدہ کیا تھا) کہ میں تمھارے (یعنی مسلمانوں کے) ساتھ ھوں (تو اُن فرشتوں سے یہ کام لینے چاھئے تھے) کہ ثابت قدم رکھو اُن لوگوں کو جو ایمان لائے ھیں میں بہت جلد اُن لوگوں کے دلوں میں جو کافر ھیں رعب ڈالوں گا ۔

لڑائی میں ثابت قدم رکھنے والی کون چیز تھی وھی اُن کی جرأت و ھمت تھی کوئی اور شخص اُن کے پاس کھڑے ھوئے اُن کو شاباش شاباش نہیں کہہ رھے تھے پس صاف ظاھر ھے کہ فرشتوں سے مراد وھی قوائے انسانی تھے جن کے پاس وحی بھیجی تھی اور جو لڑنے والوں میں بھی موجود تھے اور فرشتوں سے اُن کی مدد کرنے سے اُن کو لڑائی میں ثابت قدم رکھنا شجاعت ، جرأت ، ھمت ، استقلال کو قائم رکھنا مراد تھا ۔ نہ خیالی فرشتوں کو سپاھی بنا کر اور ڈھال تلوار ، تیر کمان دے کر اور سفید سفید گھوڑوں پر سوار کر کے بھیجنا ۔

قرآن مجید کا سیاق کلام ھی یہ ھے کہ اُس میں ایسے مواقع میں جو خوف و خطر کے ھوتے ھیں انسانوں کے دلوں میں طمانیت اور قوت بخشنے کو فرشتوں سے مدد کرنے اور اپنے غیبی لشکروں سے امداد کرنے سے تعبیر کیا جاتا ھے اور اُس سے مقصود صرف دل میں طمانیت و سکینہ کا پیدا کرنا ھوتا ھے ۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے ھجرت فرمائی اور پہاڑ کے ایک غار میں جا کر چھپے جہاں نہ لشکر تھا نہ لڑائی ۔ خدا نے فرمایا "الا تنصروہ فقد نصرہ اللہ اذا خرجہ الذین کفروا ثانی اثنین اذ ھما فی الغار اذ یقول لصاحبہ لا تحزن ان اللہ معنا فانزل اللہ

السکینة علیه دایده بجنودلم تروها وجعل کلمة الذین کفروا السفلی و کلمة الله هی العلیا و الله عزیز حکیم ۔"۔

وهاں غار میں کونسی فوج تھی اور کون سی لڑائی تھی، جو خدا نے اپنا غیبی لشکر بھیجا تھا بلکه لشکر سے صرف سکینه مراد تھی ۔ اس آیت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا اور یه کہنا که پہلا حمله تو واقعه غار سے متعلق ہے اور دوسرا ٹکڑا جہاں لشکر کے آنے کا ذکر ہے جنگ احد یا جنگ بدر یا جنگ احزاب سے متعلق ہے جیسا که بعض مفسروں نے کہا ہے ایک ایسا لغو کلام ہے جو التفات کے قابل نہیں ہے اور خدا کے کلام کے ساتھ ایک قسم کی بے ادبی ہے که اپنی مرضی کے موافق جہاں سے چاہا توڑا اور جہاں چاہا جا جوڑا ۔

اسی طرح خدا تعالی نے سورۂ توبه میں فرمایا " ثم انزل الله سکینته علی رسوله و علی المومنین و انزل جنود الم تروها و عذب الذین کفروا ذالک جزاء الکافرین "۔ سکینه کی تفصیل " جنود الم تروها " واقع ہوئی ہے اور اُن دونوں سے مراد صرف سکینه ہے نه اور کچھ ۔

اسی مضمون کی آیت سورۂ احزاب میں ہے جہاں خدا نے فرمایا ہے ۔ یا ایها الذین امنوا ذکروا نعمة الله علیکم اذ جاءتکم جنودا فارسلنا علیهم ریحا و جنود الم تروها و کان الله بما تعملون بصیرا ۔"

اس سے بھی عمده طریقه پر اس مضمون کو سورۂ فتح میں بیان کیا ہے جہاں فرمایا ہے " هو الذی انزل السکینة فی قلوب المومنین لیزداد وا ایمانا مع ایمانهم و لله جنودالسموات والارض و کان الله عزیزا حکیما"۔ اسی انزال سکینه کو خدا نے

اپنے لشکروں سے تعبیر کیا ہے ۔ پس بدر کی لڑائی میں بھی نہ جنگ جو مجسم و متحیز بالذات فرشتوں کے بھیجنے کا وعدہ کیا تھا نہ ایسے فرشتے بھیجے تھے بلکہ صرف مسلمانوں کے دلوں کو اور ان کے قوائے جنگ کو صرف خوش خبری فتح سے تقویت دینے کا وعدہ تھا جس کو خدا نے پورا کیا اور قلیل جماعت کو کثیر جماعت پر فتح دی ۔

اهل عرب زمانہ جاهلیت میں بہت سے قوائے غیر مرئیہ کو مربی انسان اور دنیا میں کارکن سمجھتے تھے ملائکہ کو بھی وہ ایک قوت غیر مرئیہ جانتے تھے اور گو وہ اس بات کے قائل تھے کہ ان میں مجسم و مرئی ہو جانے کی بھی طاقت ہے مگر یہ نہیں تھا کہ ملائکہ کا مفهوم بغیر اس کے کہ وہ ان کو مجسم و مرئی سمجھیں ان کے ذہن میں نہیں آتا تھا ۔ انھی آیتوں میں جہاں خدا تعالی نے لفظ "جنود لم تروها" کا استعمال کیا ہے اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ اس زمانہ کے قوائے عرب غیر مرئیہ کو کارکن سمجھتے تھے پس یہ کہنا کہ جو معنی آیت کے ہم نے بیان کیے ہیں (اگرچہ ایسا کہنا ہم پر تہمت ہے کیوں کہ ہم نے نہیں بیان کیے بلکہ خود خدا نے بیان کیے ہیں) وہ معنی نہ اس زمانہ کے عرب جاهلیت سمجھتے تھے نہ صحابہ کرام محض غلط ہے اس زمانہ کے مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ بغیر کسی فرضی شکل و صورت کے ان کے ذہن میں فرشتوں کا خیال ہی نہیں آ سکتا ۔ مگر عرب جاهلیت کا ایسا خیال نہ تھا بے شک فرشتوں میں وہ مجسم ہونے و مختلف صورتوں میں ظاہر ہونے کی طاقت سمجھتے تھے مگر بلا خیال شکل و صورت و تحیز کے بھی ان کے ذہن میں فرشتوں کا خیال تھا جس کو ہم نے بلفظ قویٰ تعبیر کیا ہے ۔ گو اس زمانہ کے مسلمان آیت کے معنی سمجھنے کے قابل نہ ہوں مگر اس زمانہ کے عرب بلا شبہ اس قابل تھے ۔

جنگ بدر میں کتنے فرشتے آترے تھے : اب باقی رہی بحث نسبت عدد ملائکہ کے - یہ بات ظاہر ہے کہ ایسے مقامات میں عدد کے ذکر کرنے سے خاص عدد معین مقصود نہیں ہوتا بلکہ اس امر کا مکمل ہونا جس کی نسبت عدد کا بیان ہوا ہے مقصود ہوتا ہے علاوہ اس کے عددوں کا بیان مختلف مواقع پر ہوا ہے جس کے سبب کچھ اختلاف آیتوں میں نہیں ہے - اسی سورہ کی چوتھی آیت کی تفسیر میں ہم نے بیان کیا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تھے اور قریش مکہ کے مقابلہ میں نکلنے کا ارادہ تھا تو ایک گروہ مسلمانوں کا بسبب کثرت مخالفین کے خائف تھا اور وہ ان کے مقابلے میں لڑنے کو جانا ناپسند کرتا تھا - اس وقت مسلمانوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ”لن یکفیکم ان یمدکم ربکم بثلاثة الالف من الملائکة منزلین بلیٰ ان تصبروا و تتقوا و یاتوکم من فورهم هذا یمدد ربکم بخمسة الالف من الملائکه مسومین“ (سورہ اعراف آیت ، ۱۲۰ و ۱۲۱) یعنی کیا تم کو قریش مکہ کے مقابلہ کے لیے یہ بھی کافی نہ ہوگا کہ خدا تین ہزار فرشتوں سے تمھاری مدد کرے گا - بلکہ اگر تم لڑائی میں صبر کرو اور خدا سے ڈرو اور وہ ابھی تم پر آن پڑیں تو خدا پانچ ہزار فرشتوں سے تمھاری مدد کرے گا پس رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا صرف اُن لوگوں کی طمانیت اور جرأت بڑھانے کے لیے تھا اور اُس سے کسی عدد خاص کا تعین مقصود نہ تھا -

مگر جب مسلمان بمقابلہ قریش مکہ بدر میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ قریش مکہ کے لشکر میں ہزار آدمی لڑنے والے ہیں جن کے مقابلہ کے لیے ہزار فرشتوں سے مدد دینے کی بشارت دینا کافی تھا اس لیے پروردگار نے فرمایا ”انی ممدکم بالف من الملائکة مرد

فین،، اور اسی کے ساتھ بتلا دیا کہ یہ کہنا یا وعدہ کرنا صرف فتح کی خوش خبری ہے تا کہ تمھارے دل مطمئن ہو جاویں نہ یہ کہ ہزار فرشتے سپاہی بن کر تمھارے ساتھ لڑنے کو آویں گے ۔ نتیجہ اس سب کا یہ نکلا کہ میں تمھارے دلوں کو ہزار آدمی کے لشکر کے برابر تقویت اور جرأت دے دوں گا جس کے سبب تم آن کا مقابلہ کر سکو گے ۔

(اذا یغشیکم النعاس امنۃ منہ) ہم نے سورہ آل عمران کی تفسیر میں نسبت ''نعاس،، کی کافی بحث کی ہے یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے ۔ اس مقام پر باقی آیت کی نسبت ہم کو تفسیر لکھنی ہے ۔

جنگ بدر میں نزول ماء اور تطہیر کی بحث : خدا نے فرمایا ہے '' و ینزل علیکم من السماء ماء لیطہرکم بہ و یذھب عنکم رجز الشیطان،، ہمارے مفسروں نے ان سیدھے و صاف لفظوں کی ایسی ناپاک تفسیر کی ہے جس سے تعجب ہوتا ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ تمام لشکر سوگیا تھا اور شیطان سب کے پاس آیا اور سب کو احتلام ہو گیا ۔ اس لیے خدا نے مینہ برسایا تا کہ نہا دھو کر جنابت سے پاک ہو جاویں ۔

مگر یہ تمام باتیں محض لغو و خرافات ہیں اور قرآن مجید میں ایسا ناپاک مضمون نہیں ہے ۔ بات صرف اتنی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاً مدینہ سے مکہ کی طرف کوچ کیا اور اثنائے راہ میں سے جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں مکہ کے رستہ کو چھوڑ کر بدر کی جانب پھرے ۔ اس میں کچھ کلام نہیں ہو سکتا کہ اس قدر منزلیں طے کرنے میں تمام لوگ گرد آلودہ تھے آن کے کپڑے میلے کچیلے ہوگئے تھے اور رستہ میں پانی کی بے انتہا تکلیف آٹھائی تھی ۔ بدر میں آن کو کافی پانی کے ملنے کی توقع

تھی مگر جب وہ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ پانی کے چشمہ پر قریش مکہ نے قبضہ کر لیا ہے ایسی حالت میں جس قدر پریشانی اور ناامیدی مسلمانوں کو ہوئی ہوگی اس کا اندازہ ہر شخص جو کسی قدر سمجھ رکھتا ہے کر سکتا ہے ۔ بلا شبہ وہ نہایت مضطر ہوئے ہوں گے جیسے کہ ”اذ تستغیثون ربکم فاستجاب لکم“ سے ظاہر ہوتا ہے اور اگرچہ ان کو مدینہ سے کوچ کرتے وقت فتح کی بشارت مل چکی تھی مگر ان کے دل میں شیطانی وسوسہ آیا کہ ایسی حالت میں کہ پانی پینے کو بھی میسر نہیں اور دشمن کی تعداد بہت زیادہ ہے فتح ہونا ناممکن ہے ۔ ایسی تنگ حالت میں خدا نے مینہ برسایا تاکہ وہ نہا دھو کر میل کچیل سے پاک ہو جائیں اور جو وسوسہ فتح نہ ہونے کا پانی نہ ملنے کے سبب سے شیطان نے ان کے دلوں میں ڈالا تھا وہ دور ہو جاوے ۔ پانی پی پی کر تر و تازہ ہوں اُن کے دل مضبوط ہو جاویں اور لڑائی میں ثابت قدم رہیں ۔ ایسی سیدھی و صاف آیت کو جو بالکل واقعات کے مطابق ہے ہمارے مفسرین نے ایسے ناپاک طریقہ پر اُسے محمول کیا ہے کہ بجز اس کے کہ خدا اُن کو معاف کرے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا وہ بزرگ یہ بھی نہیں سمجھے کہ اگر طہارت سے طہارت شرعی مراد تھی تو اس کے لیے پانی ہی کی کیا ضرورت تھی ۔ اُس کے لیے تو تیمم ہی کافی تھا اور یہ کہنا کہ گو تیمم شرعی طہارت ہے مگر بغیر نہائے انسان کے دل میں نجاست کا خیال رہتا ہے اُن لوگوں کا کام ہے جن کو احکام شرعی پر پورا ایمان نہیں ہے نہ صحابہ کا ۔

معرکہ بدر میں ما رمیت اذ رمیت کی حقیقت : بدر کی لڑائی میں جب مسلمانوں کی باوجود جماعت قلیل ہونے کے فتح ہوئی اور دشمن مارے گئے تو اللہ تعالیٰ نے تمام مجاہدین کو

مخاطب کرکے فرمایا کہ تم نے ان کو قتل نہیں کیا بلکہ خدا نے اُن کو قتل کیا - پھر خاص پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے فرمایا کہ تو نے دشمنوں کو تیر نہیں مارے بلکہ خدا نے مارے جس طرح خدا تعالیٰ ہر ایک فعل کو جو کسی ظاہری سبب سے ہو یہ سبب علۃالعلل ہونے کے اپنی طرف منسوب کرتا ہے اسی طرح اس مقام پر بھی مجاہدین کے افعال اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کو اپنی طرف منسوب کیا ہے - جیسے کہ اس سے پہلے فرمایا تھا '' وما النصر الا من عنداللہ ''۔

اس آیت میں تمام مفسرین نے ''رمیا'' سے باوجودیکہ سیاق کلام اور مقتضائے مقام سے علانیہ تیر مارنا سمجھا جاتا ہے تیر مارنا مراد نہیں لیا ہے بلکہ ایک روایت کی بنیاد پر جس کو خود ''قیل'' کرکے بیان کیا ہے جو خود دلیل اس کے غیر معتبر یا ضعیف و غیر ثابت ہونے کی ہے یہ لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مٹھی خاک کی دشمنوں کے لشکر کی طرف پھینکی اور خدا کی قدرت سے اُس کو اس قدر وسعت ہوئی کہ دشمنوں کے اشکر کے ہر ایک شخص کی آنکھ تک جا پہنچی وہ تو آنکھیں ملنے لگے اور مسلمانوں نے ان کو مار کر قیمہ کر دیا اور مسلمانوں کو فتح ہو گئی -

یہ طریقہ تفسیر کا اُسی عجائب پسندی پر مبنی ہے جو ہمارے مفسرین نے بہ تقلید یہود مذہب اسلام میں جو نہایت سیدھا اور صاف ہے اختیار کیا ہے ہر ایک شخص سمجھ سکتا ہے کہ لڑائی کے موقع کا بیان ہے اُس زمانہ کے عرب تلوار و تیر کمان اور برچھی سے لڑتے تھے یہی اُن کے ہتھیار تھے پھر ''رمیٰ'' سے تیر اندازی کے معنی چھوڑ کر مٹھی بھر خاک پھینکنے کے معنی لینے کس طرح پر درست ہو سکتے ہیں - بعض مفسرین نے ''رمیا'' سے مٹھی بھر خاک پھینکنا مراد نہیں لیا بلکہ تیر کا ہی مارنا مراد لیا ہے مگر

کہتے ہیں کہ یہ آیت بدر کی لڑائی سے متعلق نہیں ہے بلکہ خیبر کی لڑائی سے متعلق ہے[1] اس لڑائی میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے کمان میں تیر جوڑ کر مارا تھا جو ابن ابی حقیق کو جا لگا اور وہ مر گیا اُس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ ''ما رمیت و اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ'' مگر اُن حضرات سے پوچھنا چاہیے کہ جو آیت خاص بدر کی لڑائی کے قصہ میں نازل ہوئی ہے اُس کو توڑ کر خیبر کی لڑائی کے قصہ میں لے جانے کی کیا ضرورت ہے اور بدر کی لڑائی میں ''رمیٰ'' سے ''رمی السھم'' مراد لینے کی کیا قباحت ہے -

بعض مفسرین نے اس آیت کو بدر ہی کی لڑائی سے متعلق رکھا ہے اور ''رمیٰ'' سے مٹھی بھر خاک پھینکنا مراد نہیں لیا بلکہ ہتھیار چلانا مراد لیا ہے اور ابی ابن خلف کے قتل سے متعلق کیا ہے اور کہا ہے کہ جب وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے قریب آیا تو ''رماہ بحرہ فکسر ضلعاعہ من اضلاعہ فحمل فمات ببعض الطریق فی ذالک نزلت الایۃ'' (تفسیر کبیر) -

غرض کہ مٹھی بھر خاک کی روایت غیر صحیح و موضوع ہے اور بعض مفسرین بھی اُس کو صحیح نہیں سمجھتے - صاف صاف معنی آیت کے یہی ہیں کہ اُس لڑائی میں مسلمان کافروں سے لڑ رہے تھے اور اُن کو قتل کیا تھا - آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم بھی بذات خاص لڑائی میں شریک تھے اور تیر و کمان سے کافروں کا مقابلہ فرماتے تھے جس سے سبب خدا نے فتح دی اور مسلمانوں سے فرمایا ''فلم تقتلوھم و لکن اللہ قتلھم'' اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے فرمایا ''وما رمیت اذ رمیت و لکن اللہ رمیٰ'' -

---

۱- قال بعضھم انھا نزلت یوم خیبر روی انہ علیہ السلام اخذ قوسا و ھو علی باب خیبر فرمی سھما فاقبل السھم حتی قتل ابن ابی الحقیق و ھو علی فرسہ فنزلت ''و ما رمیت اذ رمیت و لکن اللہ رمیٰ'' - (تفسیر کبیر جلد ۳ ص ۳۷۱)

جنگ بدر میں پتھروں کی بارش کا مطلب جنگ: بدر کے سلسے میں خدا نے جو یہ فرمایا ''فامطر علینا حجارۃ من السماء'' ان سے بالتخصص آسمان سے پتھر برسانا مراد نہیں ہے بلکہ عموماً عذاب آسمانی یا آفت و مصیبت مراد ہے ''امطر'' کا استعمال عذاب کے معنوں میں ہوتا ہے قال صاحب الکشاف ''وقد کثر الامطار فی معنی العذاب'' اور ''امطار الحجارۃ اور رمی بالحجارۃ'' دونوں کا ایک مقصد ہے اور اس سے واھیہ عظمیہ کا واقع ہونا مراد ہوتا ہے بس قریش مکہ کا جو قول اس آیت میں منقول ہے اس کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ اے خدا اگر قرآن سچ ہے اور تیرے پاس سے آیا ہے تو ہم پر کوئی آسمانی عذاب نازل کر یا کوئی اور سخت عذاب بھیج اور ان الفاظ سے ان کا مطلب قرآن کے حق ہونے سے انکار کرنے کا تھا۔

ما کان اللہ لیعذبہم کی تفسیر: جنگ بدر کے سلسلے میں سورہ انفال میں جو یہ الفاظ ہیں کہ ''وما کان اللہ لیعذبہم و انت فیہم'' اس میں عذاب کو کسی خاص قسم کے عذاب سے مقید اور مخصوص نہیں کیا اس لیے اس بات پر غور کرنی ضرور ہے کہ اس عذاب سے کس قسم کا عذاب مراد ہے اگلی اور پچھلی تمام آیتوں پر غور کرنے سے اور خصوصاً انتیسویں آیت پر لحاظ کرنے سے جس میں ایک فیصلہ کرنے والی فتح کی بشارت دی گئی ہے اور چالیسویں آیت پر لحاظ کرنے سے جس میں قریش مکہ سے لڑنے اور ان کے قتل کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور چونتیسویں آیت پر غور کرنے سے جس میں قریش مکہ کو عذاب دینے کی وجہ بیان کی ہے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس آیت میں عذاب سے لڑائی میں شکست پانے اور مارے جانے کا عذاب مراد ہے اور اس مطلب کو الفاظ ''و انت فیہم'' زیادہ تر روشن کر دیتے ہیں کیوں کہ

جب تک آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم مکہ میں تشریف رکھتے تھے تو قریش سے جو مکہ کے حاکم تھے لڑنا اور اُن کو قتل کرنا ناواجب تھا مگر جب وہاں سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اور مسلمانوں نے ھجرت کرلی تو اب اُن سے لڑنا اور اُن کو قتل کرنا ناواجب نہیں رہا ۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے اس آیت کے بعد کی آیت میں فرمایا کہ ''و مالھم الا یعذبھم اللہ و ھم یصدرون عن المسجد الحرام'' یعنی اب اُن کے لیے کیا ھے کہ اللہ اُن کو عذاب دے اور وہ روکتے رھیں ۔ (مسلمانوں کو) مسجد حرام یعنی خانہ کعبہ میں آنے سے ۔

تفسیر کبیر میں لکھا ھے کہ[1] قریش مکہ کا مسجد حرام میں آنے سے روکنا اُن کے عذاب کا سبب تھا ۔ پس وہ عذاب بجز اُس کے کہ لڑائی میں شکست پانے کا عذاب ھو اور کوئی نہیں ھو سکتا ۔

علاوہ اس کے قرآن مجید میں لڑائی میں قتل ھونے کو علانیہ اور بالتصریح عذاب سے تعبیر کیا ھے ۔ چناں چہ سورۂ توبہ میں فرمایا ھے : قاتلوھم یعذبھم اللہ بایدیکم و یخزھم و ینصرکم علیھم و یشف صدور قوم مومنین (سورۂ توبہ آیت ۱۴) ۔ یعنی مارو اُن کو عذاب دے گا اُن کو اللہ تمھارے ھاتھوں سے اور خوار کرے گا ان کو اور مدد کرے گا تمھاری اور چین دے گا دلوں کو ایمان والوں کی ایک قوم کے ۔

مفسرین نے بھی اس عذاب سے لڑائی میں شکست پانے اور قید و قتل ھونے کا عذاب مراد لیا ھے چناں چہ تفسیر کبیر میں

۱۔ ثم بین تعالیٰ ما لا جلہ یعذبھم فقال و ھم یصدون عن المسجد الحرام ۔ (تفسیر کبیر)

لکھا ھے[1] کہ پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتلایا ھے کہ اُن کو عذاب نہ دے گا جب تک کہ خدا کا رسول اُن میں ھے اس آیت میں فرمایا کہ اُن کو عذاب دے گا کہ اب خدا کا رسول اُن میں سے نکل آیا ھے پھر علماء نے اس عذاب میں اختلاف کیا ھے بعضوں نے کہا کہ بدر کی لڑائی میں وہ عذاب اُن کو ملا اور بعضوں نے کہا کہ مکہ کی فتح کے دن ۔ غرض کہ اُن علماء نے عذاب سے لڑائی میں شکست پانے کا عذاب مراد لیا ھے ۔

اب اس آیت کے ان لفظوں پر ”و ما کان اللہ معذبھم و ھم یستغفرون“ غور باقی رہ گئی ھے ۔ تفسیر کشاف میں لکھا ھے[2] ”و ھم یستغفرون“ سے یہ مراد نہیں ھے کہ وہ استغفار کرتے ھیں بلکہ اس سے نفی استغفار مراد ھے ۔ پس ان لفظوں کے معنی یہ ھیں ۔ در حالیکہ وہ استغفار کرتے تو خدا اُن کو عذاب نہ کرتا مگر وہ استغفار نہیں کرتے اس لیے اُن کو خدا عذاب دے گا ۔ ھم سمجھتے ھیں کہ تمام علماء صاحب کشاف کو علم ادب کا بہت بڑا عالم سمجھتے اور جو معنی اُنھوں نے بیان کیے ھیں اُس کو سب تسلیم کریں گے ۔

۱- قال ابن عباس ۔ وما لھم ان لا یعذبھم اللہ و اعلم انہ' تعالیٰ بین فی الایۃ الاولی ان لایعذبھم مادام رسول اللہ فیھم ذکر فی ھذہ الایۃ انہ لا یعذبھم اذ اخرج الرسول من بینھم ۔ ثم اختلفو فی ھذا العذاب فقال بعضھم الحقھم عذاب المتوعد بہ یوم بدر و قیل بل یوم فتح مکہ ۔ (تفسیر کبیر جلد ۳ صفحہ ۳۸۰)

۲- ھم یستغفرون فی المواضع المحال و معناہ نفی الاستغفار عنھم ای لو کانوا ممن یومن ویستغفر من الکفر کما عذبھم لقولہ وما کان ربک لیھلک القری بظلم واھلھا مصلحون ولکنھم لایومنون ولا یستغفرون ولا یتوقع ذالک منھم ۔ (تفسیر کشاف صفحہ ۵۱۲)

جنگ بدر کا موقع : جنگ بدر کے سلسلے میں خدا نے جو یہ فرمایا ہے کہ ” اذ انتم بالعدوۃ الدنیا و ھم بالعدوۃ القصویٰ والرکب اسفل منکم و لو تواعدتم لا ختلفتم فی المیعٰد و لکن لیقضی اللہ امراً کان مفعولا “۔

یعنی جس وقت کہ تم تھے ورلے کنارہ پر اور وہ تھے پرلے کنارہ پر اور قافلہ تھا تم سے نیچے (یعنی سمندر کے کنارہ پر) اور اگر تم (اس مقام پر لڑنے کا) وعدہ کر لیتے تو البتہ تم وعدہ خلافی کرتے و لیکن (یہ اس لیے ہوا) تاکہ پورا کر دے اللہ اس کام کو جو کرنے کو تھا ۔

اس آیت میں نہایت صفائی سے خدا تعالیٰ نے اُن مقامات کا بیان کیا ہے جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش مکہ کا لشکر موجود تھا اور جس راہ سے ابو سفیان والا قافلہ نکل گیا تھا ۔ اس آیت سے ھشامی کی روایت جو ابھی ہم لکھ آئے ہیں بخوبی تصدیق ہوتی ہے کہ ابو سفیان کا قافلہ سمندر کے کنارہ ہو کر نکل گیا تھا ۔

مگر یہ الفاظ جو اس آیت میں ہیں کہ ” و لو تواعدتم لاختلفتم فی المیعاد “ اس کی تفسیر میں مفسرین نے غلطی کی ہے ۔ اس غلطی کا سبب یہ ہے کہ ابتدا ہی سے اُن کو یہ غلط خیال ہو گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارادہ قافلہ کے لوٹنے کا تھا اور ہم نے خود قرآن مجید کی آیتوں سے ثابت کر دیا ہے کہ یہ خیال محض غلط ہے پس اسی غلط خیال کے سبب سے وہ سمجھے جیسے کہ تفسیر کبیر میں بھی لکھا ہے کہ قریش مکہ سے تفاقیہ اور نادانستہ لڑائی ہو گئی اور اگر ان سے لڑائی کا وعدہ کیا جاتا تو وعدہ خلافی کرتے اس لیے کہ مسلمان بہت تھوڑے تھے اور قریش بہت زیادہ ۔

مگر یه رائے بالکل غلط ہے خود قرآن مجید سے ثابت ہے جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم خاص قریش مکہ کے مقابلہ کے لیے نکلے تھے بلکہ خدا کا حکم تھا کہ قریش مکہ ھی سے لڑو ۔ پس مذکورہ بالا تفسیر کسی طرح صحیح نہیں ھو سکتی اس آیت میں خدا تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لشکر کا اور قریش مکہ کے لشکر کا مقام بیان کیا ہے اور اس میں کچھ شک نہیں جیسا کہ تمام مفسرین اور مورخین قبول کرتے ھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا لشکر پانی سے دور اور خراب جگہ پر تھا اور قریش مکہ کا لشکر بہت اچھے مقام پر تھا اور پانی اُن کے قبضہ میں تھا ۔ ایسے خراب مقام پر دفعۃً لڑائی ھوگئی ۔ پس خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر پہلے سے اس مقام پر لڑنے کا وعدہ کیا جاتا تو تم وعدہ خلافی کرتے اور اس مقام کی خرابی دیکھ کر اُس مقام پر لڑنا منظور نہ کرتے لیکن اسی جگہ لڑائی ھو گئی اور جو خدا کو کرنا منظور تھا وہ خدا نے کر دیا ۔

(اذ یریکھم اللہ) اس آیت میں مفسرین کو یہ مشکل پیش آئی ہے کہ اگر خدا تعالیٰ نے خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم کو بہت سے لوگوں کو تھوڑا سا دکھلایا تو پیغمبر کا خواب خلاف واقع اور غلط ھوا حالاں کہ پیغمبر کا خواب خلاف واقع اور غلط نہیں ھوتا ، مگر یہ شبہ آیت کے معنی اور طرز بیان پر غور نہ کرنے کے سبب سے واقع ھوا ہے حالاں کہ آیت میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس پر کوئی شبہ ھو سکے ۔

تمام سیاق قرآن مجید کا اس طرح پر واقع ہے کہ خدا تعالیٰ بندوں کے افعال کو بہ سبب علۃ العلل ھونے کے اپنی طرف نسبت کرتا ہے اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خواب دیکھنے کو اپنی طرف نسبت کیا ہے کہ خدا نے آن

کو خواب میں دکھلایا تھوڑا ۔ اس طرح پر کہنا قرآن مجید کے سیاق کے مطابق ان معنوں میں ہے کہ جب تو نے اُن کو خواب میں دیکھا تھوڑے سے اور اگر تو اُن کو دیکھتا بہت سے تو بے شک بزدلی کرتے اور کام میں جھگڑا کرتے ۔

اس آیت کے بعد کی آیت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خواب کی تصدیق ہوتی ہے جس میں بیان ہوا ہے کہ جب قریش مکہ سے مقابلہ ہوا تو مسلمانوں کی آنکھوں میں وہ تھوڑے سے معلوم ہوئے ''قلیلاً'' کا لفظ دونوں روایتوں میں واقع ہوا ہے اگر پہلی آیت میں ''قلیلاً'' کے لفظ سے شوکت اور عظمت اور جرأت میں قلیل لیے جاویں تو دوسری آیت میں بھی جب کہ مقابلہ ہوا ''قلیلاً'' کے یہی معنی لیے جاویں گے اور اگر پہلی آیت میں ''قلیلاً'' کے لفظ سے قلیل فی العدد مراد لی جاوے تو دوسری آیت میں بھی قلیل فی العدد مراد لی جاوے گی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مقابلہ کے وقت کل لشکر قریش کے مقابلہ میں نہیں آیا تھا بلکہ اُن میں سے تھوڑے سے آدمیوں سے مقابلہ ہوا تھا جس کا سبب خود اس دوسری آیت میں بیان ہوا ہے کیوں کہ قریش مکہ نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھوڑے سے آدمی ہیں اس لیے انھوں نے بھی تھوڑے سے آدمیوں سے مقابلہ کیا اور جو امر کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں دیکھا تھا وہ سچا ہوا ۔

اذ زین لھم الشیطان اعمالھم سے کیا مراد ہے :

اللہ تعالی قرآن شریف میں فرماتا ہے کہ ۔ ''و اذ زین لھم الشیطن اعمالھم و قال لا غالب لکم الیوم من الناس و انی جار لکم فلما تراءت الفئتن نکص علی عقبیہ و قال انی بری منکم انی اراما لاترون انی اخاف اللہ واللہ شدید العقاب''۔

یعنی اور جب اچھا کر دکھایا اُن کے لیے شیطان نے ان کے عملوں کو اور کہا نہیں ہے کوئی غالب تم پر لوگوں میں سے آج کے دن اور بے شک میں تمہارا حمایتی ہوں پھر جب آمنے سامنے ہوئے دونوں گروہ تو الٹا پھرا اپنی ایڑیوں پر اور کہا کہ بے شک میں الگ ہوں تم سے - بے شک میں دیکھتا ہوں وہ جو تم نہیں دیکھتے - بے شک میں اللہ سے ڈرتا ہوں اور اللہ سخت عذاب کرنے والا ہے -

ہمارے مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں عجیب و غریب باتیں لکھی ہیں[1] وہ کہتے ہیں کہ جنگ بدر میں شیطان سراقہ بن مالک بن جعشم کی صورت بن کر جو بکر بن کنانہ کے سرداروں میں سے تھا مع اپنے ساتھ کے لوگوں کے قریش مکہ کے پاس آیا اور کہا کہ ہم تمہارے مددگار ہیں اور کہا کہ اب کوئی تم پر غالب نہیں ہونے کا اور اُس وقت حرث بن ہشام کے ہاتھ میں ہاتھ دئے ہوئے کھڑا تھا مگر جب اُس نے مسلمانوں کے لشکر میں حضرت جبریل کو اور فرشتوں کو دیکھا تو ہاتھ چھڑا کر بھاگا اور کہا کہ جو میں دیکھتا ہوں تم نہیں دیکھتے - شیطان کا سراقہ بن مالک کی صورت بن کر آنے کی یہ دلیل لکھی ہے کہ جب کفار قریش مکہ کو پھر کر گئے تو لوگوں نے کہا کہ سراقہ کے آدمی بھاگ گئے - جب یہ خبر سراقہ کو پہنچی تو اُس نے کہا کہ خدا کی قسم مجھ کو تمہارا جانا معلوم بھی نہیں ہوا ابھی تمہاری شکست کی خبر مجھ کو پہنچی ہے - اُس وقت لوگوں نے کہا کہ وہ شخص جو سراقہ کی صورت میں آدمی لیے ہوئے ملا تھا سراقہ نہ تھا بلکہ شیطان تھا -

---

۱- و ذالک لان کفار قریش لما رجعوا الی مکہ قالوا ھزم الناس السراقة فبلغ ذالک سراقة فقال و اللہ ما شعرت بمسیر حتیٰ بلغنی ھزیمتکم فعند ذالک تبین للقوم ان ذالک الشخص ما کان سراقة بل کان شیطانا - (تفسیر کبیر جلد ۳ صفحہ ۳۸۸) -

نہایت افسوس ہے کہ ہمارے مفسروں نے کیسی لغو اور بیہودہ اور بے سمجھ اور بے ٹھکانہ باتوں کو قرآن کی تفسیر میں داخل کیا ہے اور اُن کو تفسیر کی بنیاد قرار دیا ہے خدا اُن پر رحم کرے ۔ مگر حسن اور اصم دو مفسروں کا قول ہے کہ شیطان کسی آدمی کی صورت نہیں بنا تھا بلکہ اُن کے دلوں میں وسوسہ ڈالا تھا[1] ۔ پہلا قول تو محض لغو ہے اور حسن اور اصم کا قول ایسا ہے جو تسلیم ہونے قابل ہے ۔ بات یہ ہے کہ خدا تعالیٰ قریش مکہ کی حالت کو اُن کی زبان حال سے بیان فرماتا ہے ۔ پہلی آیت میں غرور اور تکبر سے وہ لڑائی کے لیے نکلے تھے اس کا اشارہ کیا اور دوسری آیت میں فرمایا کہ ’’ زین لھم الشیطن اعمالھم‘‘ یعنی اُن کے نفس شریر نے اُن کے اعمالوں کو اچھا کر دکھایا اور اُن کے شریر نفس نے کہا کہ میں تمہارا ہمایتی ہوں مگر جب دونوں لشکر مقابل ہوئے تو اُن کی جرأت اور همت جو کچھ تھی وہ پست ہوگئی اور آثار فتح و نصرت لشکر اسلام کے ظاہر ہوئے اور ان کا نفس شریر پسپا ہوا جس کو خدا تعالیٰ نے نہایت فصیح طور پر بیان فرمایا ۔ ’’ فلما تراءت الفئتن نکص علی عقبیہ و قال انی بریءٌ منکم انی اریٰ ما لاترون ‘‘ اور جب انسان کی نخوت اور غرور کے برخلاف امر واقع ہوتا ہے تو اس کے نفس امارہ کو قدرتی طور پر خوف لاحق ہوتا ہے خصوصاً مواقع جنگ میں جہاں ہر طرح پر فتح کی امید ہو اور شکست ہو جاوے پس خدا تعالیٰ نے مشرکین کے نفس شریر کی اُس حالت کو ان لفظوں سے بیان کیا کہ ’’ انی اخاف اللہ و اللہ شدید العقاب ‘‘ ۔

اور کیا بلحاظ سامان لڑائی کے اور کیا بلحاظ آسائش و خوراک و قوت جسمانی کے نہایت ضعیف تھے ۔ اس لیے خدا نے فرمایا کہ اس

---

[1] ۔ ان الشیطان زین بوسوسته من غیران یتحول فی صورة الانسان و ھو قول الحسن والاصم ۔

قدر تفاوت میں تخفیف کی جاوے تب بھی اگر تم ثابت قدم رہو گے تو دوگنیوں پر غالب آؤ گے پس ان آیتوں میں سے کسی آیت میں تعین عدد خاص مراد نہیں بلکہ صرف تحریض علے القتال و ثبات فی القتال مراد ہے -

قیدیان بدر کا مسئلہ : بدر کے قیدیوں کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "ما کان لنبی ان یکون لہ ، اسریٰ حتیٰ یثخن فی الارض تریدون عرض الدنیا و اللہ یرید الآخرة و اللہ عزیزٌ حکیم" -

یعنی - نہیں ہے نبی کے لیے کہ ہوں اس کے لیے قیدی یہاں تک کہ گھمسان کر دے زمین میں یعنی ملک میں - تم چاہتے ہو مال دنیا کا اور اللہ چاہتا ہے آخرت کو اور اللہ غالب ہے حکمت والا -

واقعہ یہ ہے کہ بدر کی لڑائی میں قریش مکہ کے تمام لشکر سے جو اُن کے ساتھ آیا تھا لڑائی نہیں ہوئی تھی بلکہ ایک گروہ سے جو لڑنے کو نکلا تھا لڑائی ہوئی تھی جیسا کہ اسی صورۃ کے مندرجہ حاشیہ آیت سے ثابت ہوتا ہے[1] - اُس گروہ کو جو مقابلہ میں آیا تھا شکست ہوئی تھی اور تمام لشکر قریش مکہ کا ایسا پریشان ہو گیا تھا کہ کسی کو پھر مقابلہ کرنے کی جرأت نہیں ہوئی اور مسلمانوں نے اُن کا تعاقب بھی نہیں کیا - جیسے کہ خدا نے اسی صورت میں فرمایا "ان تستفتحو فقد جاءکم الفتح و ان تنتھوا فھو خیر لکم" مگر قریش مکہ کے لشکر میں ستر آدمی بطور قیدی کے گرفتار ہو گئے تھے - اُن قیدیوں کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے مشورہ کیا کہ کیا کیا جاوے حضرت عمر اور سعد بن معاذ نے رائے دی کہ سب کو قتل

۱- و اذ یریکموھم اذا التقیتم فی اعینکم قلیلا و یقللکم فی اعینھم لیقضی اللہ امرا کان مفعولا و الی اللہ ترجع الامور - ۴۶ -

کرنا چاہے ۔ حضرت ابوبکر نے کہا کہ فدیہ لے کر چھوڑ دیا جاوے چناں چہ فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا ۔ فدیہ لینے پر خدا نے اپنی ناراضی ظاہر کی کیوں کہ وہ لوگ بغیر لڑنے کے پکڑے گئے تھے اور اس لیے لڑائی کے قیدی جن سے فدیہ لیا جا سکتا نہیں تھے ۔ اسی پر خدا کی ناراضی ہوئی اور خدا نے فرمایا '' ما کان لنبی ان یکن لہ اسری حتٰی یثخن فی الارض '' جن لوگوں کی یہ رائے ہے کہ ان کے قتل نہ کرنے پر خدا کی ناراضی ہوئی تھی کسی طرح پر صحیح نہیں ہو سکتی اس لیے خدا تعالیٰ نے جب آن کا قیدیٔ جنگ ہونا ہی نہیں قرار دیا تو آن کے نہ قتل کرنے پر کیوں کر ناراضی ہو سکتی تھی ۔

غزوۂ بدر اور نزول ملائکہ

تمام مسلمان اس پر یقین رکھتے ہیں اور تمام احادیث اور تاریخ کی کتابوں میں یہ لکھا ہوا ہے اور تمام مفسرین کا دعویٰ ہے کہ سورۂ آل عمران میں لکھا ہوا ہے کہ جنگ بدر میں مسلمانوں کی مدد کے لیے فرشتے آسمان سے نازل ہوئے تھے۔ مگر میں اس بات کا بالکل منکر ہوں مجھے یقین ہے کہ کوئی فرشتہ لڑنے کو سپاہی بن کر یا گھوڑے پر چڑھ کر نہیں آیا۔ مجھ کو یہ بھی یقین ہے کہ قرآن مجید سے بھی ان جنگ جو فرشتوں کا اُترنا ثابت نہیں ہے۔ مگر تمام مسلمانوں کا اعتقاد اس کے برخلاف ہے وہ یقین کرتے ہیں کہ درحقیقت فرشتوں کا رسالہ لڑنے کو اُترا تھا وہ نادانی سے یہ بھی کہتے ہیں کہ فرشتوں کا لڑائی کے لیے اُترنا منصوص ہے اور اس سے انکار کرنا قرآن کا انکار کرنا ہے مگر اُن کا یہ خیال محض غلط ہے۔

مجھ کو فکر تھی کہ اور کسی مسلمان نے بھی اس سے انکار کیا ہے یا نہیں۔ تو مجھ کو ایک مسلمان ملا جس نے اس سے انکار کیا ہے۔ تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ ابوبکر آصم اس سے سخت منکر تھے انھوں نے اپنے انکار کی چار دلیلیں بیان کی ہیں۔ ایک یہ کہ ایک فرشتہ بھی تمام دنیا کے غارت کر دینے کو کافی تھا پھر فرشتوں کی فوج بھیجنے سے کیا فائدہ تھا۔ دوسرے یہ کہ جو کفار کہ لڑے ان کو سب لوگ جانتے تھے اور جو صحابہ اُن کے مقابل ہوئے اُن کو بھی لوگ جانتے تھے پھر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کفار کو فرشتوں نے مارا تھا۔ تیسرے یہ کہ اگر فرشتے لڑے تھے تو

وہ لوگوں کو دکھائی دیتے تھے یا نہیں اور اگر دکھائی دیتے تھے تو آدمیوں کی صورت میں دکھائی دیتے تھے یا اور کسی صورت میں ۔ اگر آدمیوں کی صورت میں دکھائی دیتے تھے تو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لشکر میں شمار ہوتے تھے اور اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا لشکر تین ہزار یا اس سے زیادہ ہو گیا ہوگا اور اتنا لشکر کسی نے بیان نہیں کیا اور قرآن کے بھی برخلاف ھے ۔ کیوں کہ دشمنوں کی آنکھوں میں تھوڑا لشکر دکھائی دیتا تھا اور اگر اور کسی صورت پر دکھائی دیتے تو تمام لوگوں کے دل پر دھشت پڑ جاتی اور اگر وہ لوگوں کو دکھائی نہ دیتے تو کفار کو لوگ بغیر قتل کرنے والے کے قتل ہوتا ہوا دیکھتے اور یہ واقعہ اعظم معجزات میں سے ہوتا ۔ مگر اس طرح پر کفاروں کا مارا جانا وقوع میں نہیں آیا ۔ چوتھے یہ کہ جو فرشتے آئے تھے اُن کے اجسام کثیف تھے یا لطیف ۔ اگر کثیف تھے تو ان کو سب لوگ دیکھتے ۔ حالاں کہ اُن کو کسی نے نہیں دیکھا اور اگر ان کے اجسام ہوا کی طرح لطیف تھے تو گھوڑے پر سوار ہو کر نہیں آ سکتے تھے ۔

امام فخر الدین رازی نے ان شبہوں میں سے کسی کا جواب نہین دیا اور ملانوں کی طرح یہ بات کہی کہ ایسے شبہے کرنا اس شخص کے لائق ھین جو قرآن اور نبوت کا منکر ہو ۔ مگر جو شخص کہ قرآن اور نبوت کو مانتا ھے اس کو ایسے شبہے کرنے لائق نہیں ۔ پس ابوبکر آصم کو لائق نہ تھا کہ ان باتوں کا انکار کرتا باوجود اس کے کہ نص قرآن سے اُن کا ہونا پایا جاتا ھے اور ایسی حدیثوں مین جو تواتر کے قریب ھیں اُن کا بیان ھے ۔

امام صاحب نے اخیر بات تو یقینی غلط کہی ھے کیوں کہ تواتر تو درکنار کسی صحیح اور قوی حدیث سے بھی ان باتوں کا ثبوت نہیں ھے ۔ تمام ضعیف اور موضوع حدیثیں ھین جن میں ایسی

باتیں مذکور ھیں علمائے محققین ایسی حدیثوں پر اعتماد نہیں کرتے اور اصول حدیث سے بھی اُن کی تقویت نہیں ھوتی ۔ پہلی بات بھی امام صاحب کی صحیح نہیں ھے ۔ کیوں کہ قرآن مجید سے فی الواقع سپاہی بن کر فرشتوں کا آترنا پایا نہیں جاتا ۔ بلکہ صرف وہ ایک بشارت تھی مسلمانوں کے دلوں کو مضبوط کرنے اور لڑائی میں ثابت قدم رھنے کی ۔ جیسے کہ خود خدا نے اس جگہ اور سورۂ انفال میں فرمایا ھے ''وما جعلہ اللہ الا بشریٰ لکم ولتطمئن قلوبکم بہ'' مگر اس سورہ میں جنگ بدر کے واقعہ کا جس سے یہ آیت متعلق ھے بہت ھی تھوڑا بیان ھے اور سورۂ انفال میں وہ واقعہ بالاستیعاب بیان ھوا ھے اور اُس میں ھزار فرشتوں کی مدد کا ذکر ھے ۔

ھمارے نزدیک نہ ان لڑائیوں میں ایسے فرشتے جن کو لوگ ایک مخلوق جداگانہ متحیز بالذات مانتے ھیں ، آئے تھے اور نہ خدا نے ایسے فرشتے بھیجنے کا وعدہ کیا تھا اور نہ قران مجید سے ایسے فرشتوں کا آنا یا خدا تعالیٰ کا ایسے فرشتوں کے بھیجنے کا وعدہ کرنا پایا جاتا ھے ۔ اگر ھم حقیقت ملائکہ کی بحث کو الگ رکھیں اور فرشتوں کو ویسا ھی فرض کر لیں جیسا کہ لوگ مانتے ھیں تو بھی قران مجید سے ان کا فی‌الواقع آنا یا لڑائی میں شریک ھونا ثابت نہیں ھے ۔ سورۃ آل عمران کی پہلی آیت میں تو صرف استفہام ھے کہ اگر خدا تین ھزار فرشتوں سے مدد کرے تو کیا تم کو کافی نہ ھوگا ؟ اور دوسری آیت میں ھے کہ اگر تم لڑائی میں صبر کروگے تو خدا پانچ ھزار فرشتوں سے تمھاری مدد کرے گا ۔ مگر ان دونوں آیتوں سے اس کا وقوع یعنی فرشتوں کا آنا کس طرح ظاھر نہیں ھوتا ۔ سورۃ نفال کی آیت میں خدا نے کہا کہ ''میں تمھاری ھزار فرشتوں سے مدد کروں گا ۔ مگر اس سے بھی فرشتوں کا

فی‌الواقع آنا نہیں پایا جاتا ۔ اس پر یہ خیال کرنا کہ اگر مدد موعودہ وقوع میں نہ آئی ہو تو خدا کی نسبت خلف وعدہ کا الزام آتا ہے صحیح نہیں ہے ۔ کیونکہ مدد کی حاجت باقی نہ رہنے سے مدد کا وقوع میں نہ آنا خلف وعدہ نہیں ہے ۔ مسلمانوں کو خدا کی عنایت سے فتح ہو گئی تھی ۔ اور فرشتوں کو تکلیف دینے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی ۔ باقی یہ کہنا کہ وہ فتح فرشتوں کے آنے کے سبب سے ہوئی تھی اس لیے صیح نہیں ہے کہ اُس کے لیے اول قرآن مجید سے فرشتوں کا آنا ثابت کرنا چاھئیے ۔ اس کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ فرشتوں کے آنے سے فتح ہوئی تھی[1]

۱۔ بقول مولانا حالی یہ سر سید کی ,, نہایت رکیک تاویلیں'' ھیں ۔ کیونکہ جب خدا تعالیٰ نے صاف طور پر وعدہ فرمایا کہ ''ھم ھزار فرشتوں سے تمھاری مدد کریں گے تو یقیناً یقیناً خدا نے اپنا وعدہ پورا کیا (ان اللہ لا یخلف المیعاد) فرشتے آئے اور اُنھوں نے مسلمانوں کی مدد کی اور اسی امداد کے باعث اُن کو فتح حاصل ہوئی ۔ ورنہ فتح کی کوئی بھی صورت نہ تھی ۔ علاوہ ازیں سر سید کے پاس کیا ثبوت اس بات کا ہے کہ فرشتے نہیں اُترے تھے اور مسلمانوں کو خود ھی اپنے زور بازو سے فتح حاصل ہو گئی تھی ؟ خدا کا وعدہ فرمانا اور اسکے بعد مسلمانوں کی فتح اس بات کی بین دلیل ہے کہ یہ فتح فرشتوں کے آنے ھی کی وجہ سے ہوئی تھی نہ کہ مسلمانوں کی اپنی قوت سے ۔ کیونکہ قوت تو کوئی تھی ھی نہیں ۔ کہاں ایک ھزار مضبوط اور تنو مند مسلح سوار اور کہاں تین سو فاقہ زدہ نحیف و کمزور اور قریباً نہتے پیدل مسلمان ، زمین آسمان کا فرق تھا ۔ اگر خدا خاص طور پر آسمان سے مدد نہ کرتا تو مسلمانوں کا ایک آدمی بھی کافروں سے بچ کر نہ جا سکتا تھا ۔ باقی سر سید کا یہ کہنا کہ ''اول قرآن مجید سے فرشتوں کا آنا ثابت کرنا چاھئیے اس کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ فرشتوں کے آنے سے فتح ہوئی تھی'' تو عرض ہے کہ جہاں خدا نے صاف طور پر فرمایا کہ ھم نے جنگ بدر میں فرشتے نازل کر کے تمھاری مدد کی (ولقد نصرکم اللہ ببدرٍ) تو وھیں کونسا سرسید نے مان لیا جو یہاں مان لیتے ۔ (محمد اسماعیل پانی پتی)

روایتوں کو فرشتوں کے آنے پر سند لانا کافی نہیں ھے اول تو وہ روایتیں ھی معتبر اور قابل استناد نہیں - دوسرے خود ان کے مضمون ایسے بے سروپا اور خیالی ھیں جن سے کسی امر کا ثبوت حاصل نہیں ھوسکتا خصوصاً اس وجہ سے کہ خود راوی فرشتوں کو دیکھتے نہیں تھے -

بر خلاف اس کے قران مجید سے ثابت ھوتا ھے کہ کوئی ایک فرشتہ بھی نہیں آیا تھا - دونوں سورتوں میں اس آیت کے بعد جس میں فرشتوں کے بھیجنے کو کہا ھے - وما جعله الله الا بشریٰ لکم و لتطمئن قلوبکم به وما النصر الامن عندالله العزیز الحکیم یعنی - ''اور نہیں کیا اس کو اللہ نے مگر خوش خبری تمھارے لیے تا کہ مطمئن ھو جاویں اس سے تمھارے دل اور فتح نہیں ھے مگر اللہ کے پاس سے بے شک اللہ غالب ھے حکمت والا -''

یہ بات غور کے لائق ھے کہ ''ما جعله'' میں جو ضمیر ھے وہ کس کی طرف راجع ھے - امام رازی فرماتے ھیں کہ ''ضمیر راجع ھے طرف مصدر کے جو کہ گو صریحاً مذکور نہیں ھے مگر لفظ ''یمدکم'' میں ضمناً داخل ھے یعنی ما جعله الله المدد و الا مداد الا بشریٰ اور زجاج کا قول ھے کہ ما جعله الله ای ذکر المدد الا بشریٰ - مگر امام رازی صاحب نے جو فرمایا وہ ٹھیک نہیں معلوم ھوتا - اس لیے کہ خدا نے کہا تھا کہ میں تمھاری فرشتوں سے مدد کروں گا - پھر فرمایا کہ وہ یعنی یہ کہنا کہ میں تمھاری فرشتوں سے مدد کروں گا صرف خوش خبری تھی[1] -

---

۱- سر سید کا مطلب یہ ھوا کہ فرشتوں سے مدد کرنے کا وعدہ خدا کا محض فرضی تھا اور بالکل دل بہلاوے کے لیے تھا تا کہ مسلمان الٰہی وعدہ پا کر خوش ھو جائیں اور ان کے دل بڑھ جائیں - نعوذ باللہ خدا تعالٰی کے متعلق جو اصدق الصادقین ھے اس قسم کی بات کہنی کہ وہ لوگوں کا دل بہلانے کے لیے ان سے جھوٹے وعدے کیا کرتا ھے ، پرلے سرے کی جسارت انگیز بات ھے - بریں عقل و دانش بباید گریست (محمد اسماعیل پانی پت)

پس علانیه سیاق عبارت سے ظاہر ہے کہ ”ما جعلہ“ کی ضمیر قول امداد یا ذکر امداد کی طرف راجع ہے جیسا کہ زجاج کا قول ہے ۔ نہ بطرف مصدر کے جو مذکورہ بھی نہیں ہے البتہ اس صریح مرجع ضمیر کو چھوڑ کر مصدر کی طرف اس صورت میں ضمیر راجع ہو سکتی ہے کہ اول وقوع اس مدد کا یعنی فرشتوں کا آنا ثابت ہو جاوے اور وہ ابھی تک ثابت نہیں ہوا اور اس لیے مصدر کی طرف ضمیر کا راجع کرنا ٹھیک نہیں ہے ۔

”مآ جعلہ“ پر ما نافیہ ہے جو عام طور پر نفی کرتا ہے اور اس لیے سورہ آل عمران کی آیت کے صاف معنی یہ ہیں کہ ”نہیں کیا خدا نے پیغمبر کے اس قول کو کہ کیا تمھارے لیے کافی نہیں ہے کہ تمھارا پروردگار فرشتوں سے تمھاری مدد کرے ۔ کوئی چیز ۔ مگر بشارت ۔ یعنی صرف بشارت تا کہ تمھارے دل مطمئن ہو جاویں“ اور سورہ انفال کی آیت کے صاف معنی یہ ہیں کہ ”جب تم نے خدا سے فریاد کی اور اس نے تمھاری فریاد کو قبول کیا کہ میں فرشتوں سے تمھاری مدد کروں گا تو نہیں کیا خدا نے اس قبول کرنے کو جس کے ساتھ فرشتوں سے مدد دینے کو کہا تھا کوئی چیز مگر بشارت تا کہ تمھارے دل مطمئن ہو جائیں“ اور طرز کلام قطعاً اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ کوئی ایسافرشتہ جیسا کہ لوگ خیال کرتے ہیں لڑائی کے میدان میں نہیں آیا تھا ۔

یہ تمام تقریر اس صورت میں تھی جبکہ ملائکہ کو ایک ایسا وجود خارجی متحیّز بالذات تسلیم کیا جاوے جیسے کہ عموماً تسلیم کیا جاتا ہے اور جو مشکلیں ان آیتوں کے حل کرنے میں پیش آتی ہیں اور موضوع روایتوں اور جھوٹے اور بے معنی قصوں سے استدلال کرنے کی احتیاج پڑتی ہے ۔ وہ اسی صورت میں پڑتی ہے ۔

لیکن اگر ٹھیک طور پر قرآن مجید کو سمجھا جاوے اور جو اس کا طرز کلام ھے اس کو ھمیشه پیش نظر رکھا جائے تو کوئی مشکل پیش نہیں آتی اور خدا اور اس کے کلام کی عظمت و شان اور خدا کی قدرت کاملہ کا سچا اثر انسان کے دل پر پڑتا ھے ۔

فتح کے اتفاقی اسباب سے جو بعض اوقات آفات ارضی و سماوی کے دفعتاً ظہور میں آنے سے ھوتے ھیں ۔ قطع نظر کر کے دیکھا جاوے که ان لوگوں پر کیا کیفیت طاری ھوتی ھے جو فتح پاتے ھیں ۔ اُن کے قوائے اندرونی جوش میں آتے ھیں جرأت ، ھمت ، صبر ، شجاعت ، استقلال ، بہت زیادہ بڑھ جاتا ھے اور یہی قویٰ خدا کے فرشتے ھیں جن سے خدا فتحمندوں کو فتح دیتا ھے اور اس کے برخلاف حالت یعنی بزدلی اور رعب اُن لوگوں پر طاری ھوتا ھے جن کی شکست ھوتی ھے ۔

پس ان آیتوں میں خدا تعالیٰ نے وعدہ کیا که ”میں فرشتوں سے تمہاری مدد کروں گا ۔ مگر وہ بجز خوش خبری فتح کے اور کچھ نہیں ھے جس کے سبب تم میں ایسے قویٰ برانگیخته ھوں گے جو فتح کا باعث ھوں گے تمہارے دل قوی ھو جائیں گے ۔ لڑائی میں تم ثابت قدم رھو گے ۔ جرأت ، ھمت ، شجاعت کا جوش تم میں پیدا ھوگا اور دشمنوں پر فتح پاؤ گے ۔“

یه معنی ان آیتوں کے ھم نے پیدا نہیں کیے ھیں بلکه خود خدا نے یہی تفسیر اپنے کلام کی کی ھے ۔ جہاں اسی سورہ میں اور اسی واقعه کی نسبت فرمایا ھے که ” اذ یوحی ربک الی الملائکة انی معکم فثبتوا الذین آمنو سالقی فی قلوب الذین کفروا الرعب “۔ یعنی جب تیرا پروردگار فرشتوں کو وحی بھیجتا تھا (یه وھی فرشتے ھیں جن کے بھیجنے کا مدد کے لیے وعدہ کیا تھا) که میں تمہارے (یعنی مسلمانوں کے) ساتھ ھوں (تو اُن فرشتوں سے

یہ کام لینے چاہے تھے) کہ ثابت قدم رکھو اُن لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں ۔ میں بہت جلد اُن لوگوں کے دلوں میں جو کافر ہیں رعب ڈالوں گا ۔''

لڑائی میں ثابت قدم رکھنے والی کون چیز تھی ؟ وہی اُن کی جرأت و ہمت تھی ۔کوئی اور اشخاص اُن کے پاس کھڑے ہوئے اُن کو شاباش شاباش نہیں کہہ رہے تھے ۔ پس صاف ظاہر ہے کہ فرشتوں سے مراد وہی قوائے انسانی تھی جن کے پاس وحی بھیجی تھی اور جو لڑنے والوں میں موجود تھی اور فرشتوں سے اُن کی مدد کرنے سے اُن کو لڑائی میں ثابت قدم رکھنا اور شجاعت ، جرأت ، ہمت ، استقلال کو قائم رکھنا مراد تھا ، نہ خیالی فرشتوں کو سپاہی بنا کر اور ڈھال تلوار ، تیر کمان دے کر اور سفید سفید گھوڑوں پر سوار کرکے بھیجنا ۔

قرآن مجید کا سیاق کلام ہی یہ ہے کہ اُس میں ایسے مواقع میں جو خوف و خطر کے ہوتے ہیں ۔ انسانوں کے دلوں میں طمانیت اور قوت بخشنے کو فرشتوں سے مدد کرنے اور اپنے غیبی لشکروں سے امداد کرنے سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اُس سے مقصود صرف دل میں طمانیت و سکینہ کا پیدا کرنا ہوتا ہے ۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم نے مکہ سے ھجرت فرمائی اور پہاڑ کے ایک غار میں جا کر چھپے۔ جہاں نہ لشکر تھا نہ لڑائی تو خدا نے فرمایا ۔ '' اِلّا تنصروہ فقد نصرہ اللہ اذ اخرجہ الذین کفروا ثانی اثنین اذ ھما فی الغار اذ یقول لصاحبہ لا تحزن ان اللہ معنا فانزل اللہ سکینتہٗ علیہ و ایدہ بجنود لم تروھا و جعل کلمۃ الذین کفروا السفلٰی و کلمۃ اللہ ھی العلیا و اللہ عزیز حکیم ۔'' (سورہ توبہ ، آیت ۴۰ پارہ ۱۰) ۔

وھاں غار میں کون سی فوج تھی اور کون سی لڑائی تھی ۔

جو خدا نے اپنا غیبی لشکر بھیجا تھا ، بلکہ لشکر سے صرف سکینہ مراد تھی ۔ اس آیت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا اور یہ کہنا کہ پہلا جملہ تو واقعہ غار سے متعلق ہے اور دوسرا ٹکڑا جہاں لشکر کے آنے کا ذکر ہے جنگ احد یا جنگ بدر یا جنگ احزاب سے متعلق ہے ۔ جیسا کہ بعض مفسروں نے کہا ہے ۔ یہ ایک ایسا لغو کلام ہے جو التفات کے قابل نہیں ہے اور خدا کے کلام کے ساتھ ایک قسم کی بے ادبی ہے کہ اپنی مرضی کے موافق جہاں سے چاہا توڑا اور جہاں چاہا جا جوڑا ۔

اسی طرح خدا نے سورہ توبہ میں فرمایا " ثم انزل اللہ سکینتہ علی رسولہ و علی المومنین و انزل جنوداً لم تروھا و عذب الذین کفروا و ذالک جزاؤالکافرین ۔"

سکینہ کی تفصیل " جنوداً لم تروھا " واقع ہوئی ہے اور ان دونوں سے مراد صرف سکینہ ہے نہ کچھ اور ۔

اسی مضمون کی آیت سورہ احزاب میں ہے جہاں خدا نے فرمایا ہے " یا ایھا الذین آمنوا اذکروا نعمت اللہ علیکم اذ جاء تکم جنواً فارسلنا علیھم ریحاً و جنوداً لم تروھا و کان اللہ بما تعملون بصیرا ۔"

اس سے بھی عمدہ طریقہ پر اس مضمون کو سورہ فتح مین بیان کیا ہے ۔ جہاں فرمایا ہے " ھو الذی انزل السکینۃ فی قلوب المومنین لیزدادوا ایماناً مع ایمانھم و للہ جنود السموات و الارض و کان اللہ عزیزاً حکیماً ۔"

اسی انزال سکینہ کو خدا نے اپنے لشکروں سے تعبیر کیا ہے ۔ پس بدر کی لڑائی میں بھی نہ جنگجو مجسم متحیز بالذات فرشتوں کے بھیجنے کا وعدہ کیا تھا ۔ نہ ایسے فرشتے بھیجے تھے ۔ بلکہ مسلمانوں کے دلوں کو اور ان کے قوائے جنگ کو صرف

خوش خبری فتح سے تقویت دینے کا وعدہ تھا جس کو خدا نے پورا کیا اور قلیل جماعت کو کثیر جماعت پر فتح دی ۔

اہل عرب زمانۂ جاہلیت میں بہت سے قوائے غیر مرئیہ کو مربی انسان اور دنیا میں کارکن سمجھتے تھے ۔ ملائکہ کو بھی وہ ایک قوت غیر مرئیہ جانتے تھے اور گو وہ اس بات کے قائل تھے کہ اُن میں مجسم و مرئی ہونے کی بھی طاقت ہے ۔ مگر یہ نہیں تھا کہ ملائکہ کا مفہوم بغیر اس کے کہ وہ اُن کو مجسم و مرئی سمجھیں ۔ اُن کے ذہن میں نہیں آتا تھا ۔ ان ہی آیتوں میں جہاں خدا تعالیٰ نے لفظ "جنوداً لم تروھا" کا استعمال کیا ہے اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ اُس زمانہ کے عرب قوائے غیر مرئیہ کو کارکن سمجھتے تھے پس یہ کہنا کہ جو معنی آیت کے ہم نے بیان کیے ہیں (اگرچہ ایسا کہنا ہم پر تہمت ہے کیوں کہ ہم نے نہیں بیان کیے ۔ بلکہ خود خدا نے بیان کیے ہیں) وہ معنی نہ اُس زمانہ جاہلیت کے عرب سمجھتے تھے نہ صحابہ کرام ۔ محض غلط ہے اس زمانہ کے مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ بغیر کسی فرضی شکل و صورت کے اُن کے ذہن میں فرشتوں کا خیال ہی نہیں آ سکتا ۔ مگر عرب جاہلیت کا ایسا خیال نہ تھا ۔ بے شک فرشتوں میں وہ مجسم ہونے اور مختلف صورتوں میں ظاہر ہونے کی طاقت سمجھتے تھے ۔ مگر بلا خیال شکل و صورت و تحیز کے بھی اُن کے ذہن میں فرشتوں کا خیال تھا جس کو ہم نے بلفظ قویٰ تعبیر کیا ہے ۔ گو اس زمانہ کے مسلمان آیت کے معنی سمجھنے کے قابل نہ ہوں مگر اُس زمانہ کے عرب بلا شبہ اس قابل تھے ۔

اب باقی رہی بحث نسبت عدد ملائکہ کے تو یہ بات ظاہر ہے کہ ایسے مقامات میں عدد کے ذکر کرنے سے خاص عدد معین مقصود نہیں ہوتا بلکہ اس امر کا مکمل ہونا جس کی نسبت عدد کا بیان ہوا

ہے مقصود ہوتا ہے ۔ علاوہ اس کے عددوں کا بیان مختلف واقع پر ہوا ہے جس کے سبب کچھ اختلاف آئیتوں میں نہیں ہے ۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تھے اور قریش مکہ کے مقابلہ میں نکلنے کا ارادہ تھا تو ایک گروہ مسلمان کا بسبب کثرت مخالفین کے خائف تھا اور وہ اُن کے مقابلہ میں لڑنے کو جانا نا پسند کرتا تھا اُس وقت مسلمانوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ''الن یکفیکم ان یمدکم ربکم بثلاثة آلاف من الملائکة منزلین بلٰی ان تصبروا و تتقوا و یاتوکم من فورھم ھذا یمددکم ربکم بخمسة آلاف من الملائکة مسومین (سورۃ آل عمران آیات ۱۲۳ - ۱۲۴) یعنی ''کیا تم کو قریش مکہ کے مقابلہ کے لیے یہ بھی کافی نہ ہوگا کہ خدا تین ہزار فرشتوں سے تمھاری مدد کرے ۔ بلکہ اگر تم لڑائی میں صبر کرو اور خدا سے ڈرو اور وہ ابھی تم پر آن پڑیں تو خدا پانچ ہزار فرشتوں سے تمھاری مدد کرے گا ۔''

پس رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا صرف اُن لوگوں کی طمانیت اور جرأت بڑھانے کے لئے تھا اور اس سے کسی عدد خاص کا تعین مقصود نہ تھا ۔

مگر جب مسلمان بمقابلہ قریش مکہ بدر میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ قریش مکہ کے لشکر میں ہزار آدمی لڑنے والے ہیں ۔ جن کے مقابلہ کے لیے ہزار فرشتوں سے مدد دینے کی بشارت دینا کافی تھا اس لیے پروردگار نے فرمایا '' انی ممدکم بالف من الملائکة مردفین '' اور اسی کے ساتھ بتلا دیا کہ یہ کہنا یا وعدہ کرنا صرف فتح کی خوش خبری ہے تاکہ تمھارے دل مطمئن ہو جائیں

نه یه که هزار فرشتے سپاهی بن کر تمهارے ساتھ لڑنے کو آئیں گے
نتیجه اس سب کا یه نکلا که ''میں تمهارے دلوں کو هزار
آدمی کے لشکر کے برابر تقویت اور جرأت دے دوں گا ۔ جس کے
سبب تم اُن کا مقابله کر سکو گے''۔